لاش، ہیجڑا اور حسینہ

ہر کہانی میں ہیرو اور ولن کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایسی کہانیاں بھی جنم لیتی ہیں جن میں سارے کردار ''ہیرو'' ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ایک دردناک کہانی ہوتی ہے۔ شاید ایسی کہانیوں میں ''تقدیر'' ولن کا کردار ادا کرتی ہے۔ یہ 1944ء کی بات ہے۔ اندرونی امرتسر کے ایک علاقے میں چار منزلہ خستہ حال عمارت گر گئی اور ملبے میں دب کر قریباً اٹھارہ افراد ہلاک ہو گئے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ عمارت گرنے کا سانحہ اتوار کی صبح دس بج کر بیس منٹ پر پیش آیا۔ عمارت کے نچلے حصے میں بہت سی دکانیں تھیں اور وہاں لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ بالائی منزلوں میں رہائشی کمرے تھے اور کم و بیش دس خاندان یہاں آباد تھے۔ ایک رات پہلے شدید بارش ہوئی تھی اور حادثے کے وقت بھی بونداباندی جاری تھی۔ شاید برسات کا موسم اور بارشوں کی بھرمار ہی اس حادثے کا سبب بنی تھی۔ دس بج کر بیس منٹ پر ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور ہر طرف گرد و غبار کے بادل پھیل گئے۔ ان بادلوں میں چیخ و پکار کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ شہر کا گنجان اور دشوار گزار علاقہ تھا اسے بھگتان والا دروازہ کہا جاتا تھا۔ بلڈوزر اور کرین وغیرہ کا یہاں تک پہنچنا بے حد دشوار تھا۔ لوگ خالی ہاتھوں سے ملبہ ہٹانے میں لگ گئے لیکن ملبے کا یہ پہاڑ دو تین گھنٹے میں بھی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں امرتسر کے ایک مضافاتی تھانے میں تھا۔ ہمیں بھی ہنگامی طور پر جائے حادثہ پر پہنچا دیا گیا۔ کئی تھانوں کی پولیس، رضاکاروں کی پارٹیاں اور علاقے کے بہت سے لوگ امدادی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ لاشوں اور زخمیوں کو مسلسل نکالا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بارش بھی ہو رہی تھی۔ رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یقینی بات تھی کہ ملبے کے نیچے ابھی اور لاشیں موجود ہوں گی اور عین ممکن ہے کہ کوئی زخمی بھی ہو مگر اندھیرے اور خراب موسم کے سبب امدادی کام جاری رکھنا دشوار تھا۔ پھر ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا کہ عمارت کا ایک حصہ ابھی گرا نہیں تھا۔ اُسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت گر جائے گا۔ فیصلہ کیا گیا کہ اس حصے کو

گرانے تک تلاش کا کام ملتوی کر دیا جائے۔

اتوار کی رات جیسے تیسے کاٹی گئی۔ علی الصبح عمارت کا باقی ماندہ حصہ گرا کر امدادی کام دوبارہ شروع کیا گیا۔ ملبے کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو رسیوں کے ذریعے کھینچ کر ادھر اُدھر ہٹایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ کدال اور بیلچوں سے مٹی کھودنے میں مصروف تھے۔ اُس روز ملبے سے دو لاشیں مزید ملیں۔ اس کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر عورت ملی جو شدید زخمی ہونے کے باوجود زندہ تھی۔ اُسے فوراً ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ لاشوں میں سے ایک لاش چالیس پینتالیس سالہ شخص کی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ٹوکری تھی۔ بدقسمت شخص کوئی چیز خریدنے یہاں پہنچا تھا اور جان ہار گیا تھا۔ متوفی کے لباس سے چند روپے کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ دوسری لاش ایک جواں سال شخص کی تھی۔ عمر قریباً اٹھائیس برس رہی ہوگی۔ وہ سفید استری شدہ شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ متوفی کے سر پر شدید ضربات آئی تھیں۔ اُس کی قمیض خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ چہرہ اس بری طرح مٹی میں لتھڑا گیا تھا کہ خدوخال چھپ کر رہ گئے تھے۔ اُس کے لباس سے ایک رومال، تھوڑی سی نقدی اور چند کاغذات ملے۔

اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے میں نے نوجوان کے لباس سے ملنے والی اشیاء کی فہرست تیار کر لی۔ ایک خاکی لفافے پر نوجوان کی شناخت لکھی اور تمام اشیاء لفافے میں ڈال دیں۔ ایسا کرتے ہوئے میری نگاہ ایک ''ٹکٹ'' پر پڑی اور میں چونک گیا۔ گلابی رنگ کا یہ ٹکٹ سینما کا تھا۔ ٹکٹ پر سینما کے نام کے علاوہ شو کا ٹائم اور مختلف چارجز لکھے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا، شو کا ٹائم بارہ سے تین تھا۔ دوپہر بارہ سے تین والا شو صرف اتوار کو چلتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ اتوار کا ٹکٹ ہے۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ پچھلے اتوار کا ٹکٹ ہوگا لیکن ٹکٹ کی حالت ایسی تھی کہ وہ پچھلے اتوار کا نہیں لگتا تھا۔ جو کاغذ ایک ڈیڑھ ہفتے تک جیب میں پڑا رہے اُس کی حالت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل نیا نکور ٹکٹ تھا۔ ویسے بھی ٹکٹ ایسی چیز نہیں ہوتا جسے یوں سنبھال کر رکھا جائے۔ مجھے کچھ عجیب سا شک ہونے لگا، لیکن ٹکٹ پر تاریخ وغیرہ درج نہیں ہوتی۔ لہٰذا میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ میں نے وہ ٹکٹ لفافے میں ڈالنے کی بجائے اپنی جیب میں رکھ لیا اور دوسرے کاموں میں لگ گیا۔

دونوں لاشیں لوگوں کے ملاحظے کے لیے گلی میں رکھ دی گئی تھیں۔ ادھیڑ عمر شخص کی لاش کو تو کچھ دیر بعد پہچان لیا گیا۔ وہ ایک قریبی گلی کا رہائشی تھا اور ایک عیسائی ٹیچر کا گھریلو ملازم تھا لیکن نوجوان کی لاش شناخت نہیں کی جا سکی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ملبے سے تین چار لاشیں ایسی نکلی تھیں جنہیں ابھی تک شناخت نہیں کیا جا سکا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے

بعد وہ تمام لاشیں مردہ خانے میں پڑی تھیں۔ نوجوان کی لاش بھی ہسپتال بھیج دی گئی۔

دو روز تک خاصی مصروفیت رہی۔ بھاگ دوڑ میں اُس ٹکٹ کو بالکل بھولا رہا جو میری جیب میں پڑا تھا اور جس نے مجھے ایک عجیب سے شک میں مبتلا کیا تھا۔ دوسرے روز شام کو تھوڑی سی فرصت ملی تو میں پولیس ہیڈ کوارٹر کی بالائی منزل پر ایک کمرے میں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ اچانک مجھے ٹکٹ کا خیال آیا۔ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے ٹکٹ نکالا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ ہر سینما ٹکٹ پر ایک سیریل نمبر ہوتا ہے۔ اُس سیریل نمبر کی مدد سے جانا جا سکتا ہے کہ یہ ٹکٹ کب خریدا گیا ہے...... میرے قریب ہی ٹیلیفون سیٹ پڑا تھا۔ میں نے ڈائریکٹری سے سینما کا فون نمبر ڈھونڈا اور فون کر دیا۔ دوسری طرف سینما کا منیجر تھا۔ میں نے تعارف کرانے کے بعد اُسے اپنا مسئلہ بتایا اور ٹکٹ نمبر نوٹ کرا دیا۔

صرف پانچ منٹ بعد سینما منیجر نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ یہ ٹکٹ پچھلے اتوار کو نہیں اسی اتوار کو سینما سے جاری ہوا ہے۔ میں سکتے میں رہ گیا۔ میرا ایک بھیانک اندیشہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے منیجر سے پوچھا ''تمہیں غلطی تو نہیں لگ رہی۔''

''نہیں انسپکٹر صاحب!'' اُس نے پورے یقین سے کہا۔ ''یہ ٹکٹ اسی اتوار کا ہے اور سینما کی بکنگ سے خریدا گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ بکنگ کلرک نے اپنے کسی دوست کو یہ ٹکٹ شو سے پہلے جاری کر دیا ہو۔''

''ہو ہی نہیں سکتا جی!'' منیجر نے کہا۔ ''تمام ٹکٹ میرے کمرے میں لاکر کے اندر ہوتے ہیں۔ میں عین شو ٹائم پر خود کلرکوں کے سپرد کرتا ہوں۔''

میں نے فون بند کیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بے حد سنسنی خیز بات تھی۔ جو شخص دس بج کر بیس منٹ پر ملبے کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا اس کی جیب میں ایک ایسا ٹکٹ تھا جو ساڑھے گیارہ بجے کے بعد ایک سینما سے جاری کیا گیا...... اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو متوفی ملبے تلے دب کر ہلاک نہیں ہوا تھا، یا پھر ''ہلاک'' ہونے کے بعد وہ شو دیکھنے چلا گیا تھا اور دوبارہ آ کر جائے حادثہ پر ''لیٹ'' گیا تھا۔

قارئین کے ذہن میں ایک بات اور بھی آ سکتی ہے کہ شاید متوفی عمارت کے اس حصے تلے دب کر ہلاک ہوا جو اگلے روز سوموار کو گرایا گیا تھا لیکن یہ ناممکن بات تھی۔ سوموار کے روز عمارت کا جو مختصر حصہ گرایا گیا وہ شمالی گوشے کی طرف تھا۔ جبکہ لاش سامنے والے حصے

میں پائی گئی۔ دونوں مقامات ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔

یہ ذمے داری اور فرض شناسی کا امتحان تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اکثر ہم پیشہ اس امتحان میں فیل ہوتے ہیں۔ ''واردات'' خود چیختی ہے کہ اُس کی تفتیش کی جائے لیکن کان بند کر لیے جاتے ہیں۔ کہاں یہ کہ ''واردات'' حادثے کے غبار میں چھپ گئی ہو، نہ کوئی سائل ہو نہ مدعی پھر بھی کوئی ذمے دار شخص یہ سوچے کہ نہیں، انصاف کے تقاضے پورے ہونے چاہئیں...... میں نے اپنے تھکے ماندے جسم کو سنبھالا، منتشر ذہن کو سمیٹا اور ایک پختہ ارادے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے ہسپتال کے مردہ خانے سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے لاش وارثوں کے حوالے کی جا چکی ہے۔ مردہ خانے کے انچارج نے بتایا کہ کل تین چار اخباروں میں لاش کی تصویریں شائع ہوئی تھیں۔ شام کے وقت کرشن نگر کے چند افراد مردہ خانے پہنچے ان کے ساتھ متعلقہ تھانیدار بھی تھا۔ اُن لوگوں نے لاش کو شناخت کر لیا اور ضروری کارروائی کے بعد اپنے ساتھ لے گئے...... تھانے سے وارثوں کا پتہ معلوم کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی اور میں بیس منٹ کے اندر کرشن نگر پہنچ گیا۔ میں عین وقت پر پہنچا تھا۔ تھوڑی سی دیر ہوتی تو میت منوں مٹی کے نیچے چلی جاتی۔ میت کو غسل دے کر کفن پہنایا جا چکا تھا اور جنازہ اٹھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں نے موقع پر موجود لوگوں سے کہا کہ ابھی یہ جنازہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ سب حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں وردی میں تھا لہٰذا کسی کو بولنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ مرنے والا حادثے میں نہیں مرا۔ یہ کوئی بہت گہرا چکر ہے اور ''اوپر'' سے حکم آیا ہے کہ اس معاملے کی تحقیق کی جائے۔

اس دوران متعلقہ تھانیدار بھی موقعے پر پہنچ گیا۔ اُس کا نام بیدی سنگھ تھا۔ میں بیدی سنگھ کو ایک طرف لے گیا اور اُسے مختصر لفظوں میں ساری صورتِ حال بتائی۔ میری باتیں سن کر اور سینما کا ٹکٹ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں گہری تشویش لہرانے لگی۔ اُس نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ دل ہی دل میں مجھ پر لعنتیں بھیج رہا ہے کہ میں یہ کیا نئی مصیبت کھڑی کرنے لگا ہوں۔ میں نے بیدی سنگھ سے پوچھا۔ ''متوفی کے وارث کون سے ہیں؟''

وہ بیزاری سے بولا۔ ''سارا محلّہ ہی وارث ہے بادشاہو...... لیکن اصل وارث کوئی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''مرنے والے کا نام سعید احمد ہے۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ ڈیڑھ دو سال پہلے ''سورت نگر'' سے یہاں آیا تھا۔ یہاں بتی والے چوک میں اس نے جنرل سٹور کھول رکھا تھا۔ رات کو جنرل سٹور کے اندر ہی سو رہتا تھا۔ ایک ہلکی سی موٹر سائیکل بھی رکھی ہوئی تھی۔ خوش اخلاق شخص تھا۔ محلے کے چھوٹے بڑے اسے ''ہرنائی'' کہتے تھے۔ پتہ نہیں یہ نام کیسے اور کیوں پڑا۔ بہرحال منگل کی دوپہر تک تو کسی نے خیال ہی نہیں کیا کہ ہرنائی نے دکان کیوں نہیں کھولی۔ اتوار کو تو ویسے ہی چھٹی تھی۔ سوموار کو سارا دن تڑاتڑ بارش ہوتی رہی لیکن منگل کو بھی دکان نہیں کھلی تو محلے داروں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ اس سے پہلے کبھی ہرنائی یوں غائب نہیں ہوا تھا۔ اُس کا کوئی تھا ہی نہیں تو اُس نے جانا کہاں تھا۔ آ جا کے ایک ہی اس کا دوست تھا ''شوکت کلاتھ مرچنٹ'' والا۔ فرصت کا ٹائم اُس کے ساتھ گزارتا تھا۔ اُسے بھی کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہرنائی کہاں ہے...... منگل کا سارا دن بھی گزر گیا اور کل اخباروں میں اُس کی تصویر آ گئی۔ پتہ چلا کہ وہ تو بھوانی بلڈنگ والے حادثے میں مارا گیا ہے۔ ایک اخبار میں تصویر بالکل صاف پہچانی جا رہی تھی۔ پھر بھی محلے داروں کو شبہ تھا کہ شاید یہ ہرنائی نہ ہو۔ محلے کے چار پانچ معزز بندے میرے پاس تھانے پہنچے۔ میں انہیں اپنے ساتھ مردہ خانے لے گیا۔ وہاں انہوں نے ہرنائی کو پہچان لیا۔''

محلے کے معزز افراد کو اندر بلا کر میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور انہیں بتایا کہ لاش کو دفنانے سے پہلے قانونی کارروائی ضروری ہو گئی ہے۔ لہٰذا وہ کچھ دیر انتظار کر لیں۔ میرے کہنے پر انسپکٹر بیدی سنگھ نے اپنے تھانے سے فوٹو گرافر سمیت ضروری عملہ بلوا لیا اور ہم نے بند کمرے میں لاش کا کفن وغیرہ کھول کر اُس کی چوٹوں کا معائنہ شروع کیا۔ متوفی کے جسم پر جان لیوا ضربیں دو تھیں۔ ایک اُس کے سر پر اور دوسری پیشانی پر۔ یہ کند آلے کی ضربیں تھیں۔ مثلاً ڈنڈا، رائفل کا بٹ یا لاٹھی وغیرہ۔ تاہم ان ضربوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی کیا جا سکتا تھا کہ یہ ملبہ گرنے سے آئی ہیں۔ ایک اور ضرب متوفی کے دائیں کندھے پر بھی تھی۔ یہ اتنی شدید ضرب تھی کہ مرنے والے کا پورا پہلو نیلا ہو رہا تھا۔ کندھے سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ ہنسلی کی ہڈی اور بالائی بازو ٹوٹ چکا تھا۔ اس ضرب کے بارے میں دو ہی باتیں کہی جا سکتی تھیں۔ یا تو یہ ملبہ گرنے سے آئی تھی یا پھر متوفی کو کسی بلند جگہ سے نیچے پھینکا گیا تھا۔

لاش کے معائنے کے بعد میں نے سب سے پہلے شوکت نامی اُس شخص سے سوال جواب کیے جو ''شوکت کلاتھ مرچنٹ'' کا مالک تھا اور جس کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ وہ

ہرنائی کا گہرا دوست ہے۔ شوکت کی عمر بھی اٹھائیس تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک گورا چٹا جواں سال شخص تھا۔ تاہم بال پیشانی سے اڑے ہوئے تھے اور جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ نظر آ رہی تھیں۔

اُس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یہ پتہ چلا کہ وہ بھی ''بھگتان والا'' کا رہنے والا ہے، میں نے تھوڑی سی تفصیل پوچھی تو انکشاف ہوا کہ جس جگہ بلڈنگ گری وہاں سے شوکت کا گھر صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ میں نے شوکت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کے باوجود تم اس بات سے بے خبر رہے کہ حادثے کے شکار ہونے والوں میں تمہارا جگری دوست بھی شامل ہے۔''

وہ بوجھل آواز میں بولا۔ ''آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہرنائی کی لاش اگلے روز ملی تھی۔ میں اُس وقت دکان پر تھا۔ محلے کے جن لوگوں نے اُس کا چہرہ دیکھا وہ بھی اُسے میرے دوست کے طور پر نہ پہچان سکے۔ دراصل جب سے ہماری دوستی ہوئی تھی ہرنائی میرے گھر چار پانچ بار سے زیادہ نہیں آیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارے گھر آتا رہتا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی موت سے پہلے بھی تم ہی سے ملنے ''بھگتان والا'' گیا ہو۔''

وہ ہچکچا کر بولا۔ ''بالکل ہو سکتا ہے جی...... اس کے علاوہ اُسے ''بھگتان والا'' میں اور کیا کام ہو سکتا تھا۔ وہ جب بھی گھر میں آتا تھا میرے بچے کے لیے گولیاں ٹافیاں وغیرہ لے کر آتا تھا۔ ممکن ہے اُس روز بھی وہ کوئی چیز لینے کے لیے بھوانی بلڈنگ میں رُک گیا ہو۔''

میں نے پوچھا۔ ''اتوار کی صبح دس ساڑھے دس کے درمیان تم کہاں تھے؟''

وہ بولا۔ ''میں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ کپورتھلہ گیا ہوا تھا۔ بس ہفتے کی شام اچانک ہی جانا پڑ گیا تھا۔ میری بیمار ساس کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی تھی، اُس کی طرف سے اطلاع آئی تھی کہ وہ نوشابہ سے ملنا چاہتی ہے...... نوشابہ میری بیوی کا نام ہے۔''

''کپورتھلہ سے تم کب واپس آئے؟''

''سوموار کی صبح ساڑھے دس بجے...... اُس وقت تک بھوانی بلڈنگ گرے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے لیکن ابھی ملبہ ہٹایا جا رہا تھا۔ پورے علاقے میں سوگواری پھیلی ہوئی تھی۔''

میں نے ٹوپی اتار کر میز پر رکھی اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''شوکت علی! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہرنائی قتل ہوا ہے؟''

''کک...... کیا مطلب؟'' شوکت کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ اُس کی آنکھیں

حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''مطلب یہ ہے کہ ہرنائی کی موت اتوار کی صبح حادثے کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ کیونکہ اتوار کی سہ پہر تین بجے تک وہ ایک سینما ہال میں موجود تھا۔ اُس کی موت اتوار کی سہ پہر اور سوموار کی صبح کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ وہ اس دوران تم سے ملنے ''بھگتان والا'' پہنچا۔ کسی نے اس کے سر پر وزنی آلے سے ضربیں لگا کر اُسے ہلاک کیا اور اپنا جرم چھپانے کے لیے لاش کو رات کی تاریکی میں ملبے کے ڈھیر میں پھینک دیا۔''

شوکت علی کا گورا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے جی؟''

میں نے کہا۔ ''میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، فی الحال مجھے یہ بتاؤ کہ اتوار اور سوموار کی درمیانی شب تمہارے گھر تالا لگا ہوا تھا یا کوئی موجود تھا۔''

''تالا لگا ہوا تھا لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''ہمارا ایک ملازم ''نرگس'' ہے۔ اس کے پاس چابی تھی۔ ہم نے کہیں باہر جانا ہو تو اُسے گھر میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اتوار کی رات بھی اُسی نے گھر میں رہنا تھا لیکن پھر اُسے اپنا کوئی کام پڑ گیا اور وہ نہ آ سکا۔''

میں نے کہا۔ ''تم ملازم کو 'مرد' بتاتے ہو لیکن نرگس تو عورتوں کا نام ہوتا ہے۔''

وہ بولا۔ ''وہ عورت اور مرد کچھ بھی نہیں۔ ہیجڑا ہے لیکن محنتی بہت ہے اور ایماندار بھی ہے۔ میں نے اُسے گھر کے کام کاج کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔''

میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے دھواں فضا میں چھوڑا۔ ''کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہیجڑا نرگس تمہیں غلط بتا رہا ہو۔ وہ تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے گھر سویا ہو۔ ہرنائی کو علم نہیں تھا کہ تم اچانک کپورتھلہ چلے گئے ہو وہ تم سے ملنے تمہارے گھر پہنچا ہو۔ وہاں ہرنائی اور نرگس میں کوئی ان بن ہو گئی ہو اور نرگس نے ہرنائی کو قتل کر ڈالا ہو۔''

شوکت نے پُرتشویش انداز میں ہونٹ کاٹے۔ ''نرگس اتنا بڑا جرم کیسے کر سکتا ہے اور پھر...... اُسے ہرنائی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ آپس میں ہنستے بولتے تھے۔ کوئی جھگڑا نہیں تھا اُن میں۔''

میں نے کہا۔ ''ضروری نہیں ہوتا کہ جھگڑا بہت پرانا ہو۔ جھگڑا اچانک بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ فی الوقت میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتا ہوں

اور نرگس کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔''

شوکت کے چہرے پر شدید اُلجھن نظر آ رہی تھی۔ جیسے وہ ابھی تک یہی یقین نہ کر پایا ہو کہ اُس کے دوست کو قتل کیا گیا ہے۔ بہر حال اُس کے یقین نہ کرنے سے قتل ''حادثے'' میں نہیں بدل جاتا تھا۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ لیا اور بھگتان والا دروازہ روانہ ہو گیا۔ انسپکٹر بیدی سنگھ اور عملے کے چند ارکان بھی میرے ساتھ تھے۔

شوکت علی کا گھر تین منزلہ تھا۔ نانک چندی اینٹوں کا ایک تنگ زینہ بل کھاتا ہوا اوپر جاتا تھا۔ نچلی منزل پر کوئی کارخانہ تھا۔ بالائی منزل اور تیسری منزل شوکت کے استعمال میں تھی۔ اس مکان میں شوکت کے علاوہ اس کی جواں سال بیوی نوشابہ اور ایک سالہ بچہ کامران رہتے تھے۔ میں نے گھوم پھر کر مکان کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس مکان کی چھت سے بھوانی بلڈنگ کا ملبہ صاف نظر آ رہا تھا۔ یوں تو شوکت کے گھر اور بھوانی بلڈنگ کے درمیان قریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا مگر چھت سے بھوانی بلڈنگ بالکل قریب نظر آتی تھی۔ مکانوں کی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ شوکت کی چھت سے تین چار چھتیں پھلانگ کر بھوانی بلڈنگ تک پہنچا جا سکتا تھا۔ میرا شک آناً فاناً یقین کی حدوں کو چھو گیا۔ مجھے متوفی ہرنائی کے کندھے کی وہ چوٹ یاد آئی جس نے اُس کا ایک پہلو نیلا کر رکھا تھا اور کئی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ اُس چوٹ کو دیکھ کر فوراً یہ خیال آتا تھا کہ مرنے والے کو کسی بلند جگہ سے پھینکا گیا ہے۔ چھت سے نیچے اُتر کر میں نے باریک بینی سے کمروں اور دیواروں اور فرشوں کا معائنہ کیا۔ اس کام میں انسپکٹر بیدی اور اس کا عملہ بھی میرے ساتھ شریک ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ کی مغز کھپائی کا صلہ ہمیں ایک اور اہم کھوج کی صورت میں ملا۔ ایک اندرونی کمرے کی چوکھٹ پر کسی وزنی شے کی ضرب موجود تھی۔ یہ ایک تازہ نشان تھا۔ ضرب کے مقام پر لکڑی دب کر ٹوٹ گئی تھی۔ اس کمرے میں فرش پر نامعلوم سے دھبے بھی پائے گئے۔

ہماری جانچ پڑتال کے دوران ہی ہیجڑے نرگس کو بھی حاضر کیا جا چکا تھا۔ ہیجڑے کے لیے نرگس کا نام ایسے ہی تھا جیسے بھینس کو بلبل کہا جائے یا طوفان باد و باراں کو ''رم جھم'' کے نام سے پکارا جائے۔ وہ کم و بیش چھ فٹ قد کا ہٹا کٹا شخص تھا۔ داڑھی مونچھیں صفاچٹ۔ آنکھوں میں سرمہ اور ہونٹ پان سے رنگے ہوئے۔ وہ جب نزاکت سے عورتوں کے انداز میں بولتا تھا تو ہنسی آنے لگتی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ اُس پر شک کیا جا رہا ہے۔ اُس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ مجھے پہلی نگاہ میں ہی وہ کوئی اچھا شخص نہیں لگا۔ حیرت تھی کہ شوکت علی اُسے اپنا گھر

سونپ کر بیوی بچے کے ساتھ کپورتھلہ چلا جاتا تھا۔

میں نے نرگس سے سوال جواب کیے۔ میں نے پوچھا ''اتوار اور سوموار کی درمیانی شب تم کہاں تھے۔''

وہ بولا۔ ''میں اپنے گھر تھی...... جناب بھائی جان شوکت مجھ سے کہہ گئے تھے کہ میں رات اُن کے گھر میں گزاروں لیکن عین موقعے پر میرے گھر کچھ مہمان آ گئے اور میں یہاں نہ آ سکی۔''

''تم نے یہ نہ سوچا کہ مالک تم سے اپنے گھر کی رکھوالی کا کہہ کر گیا ہے اور تم نے گھر کی خبر تک نہیں لی۔''

وہ بولا ''رات نو دس بجے میرے دل میں خیال آیا تھا کہ ایک چکر یہاں کا لگا جاؤں لیکن بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے نہ آ سکی...... لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ آپ مجھ نگوڑی سے پوچھنا کیا چاہ رہے ہیں۔ کیا یہاں سے کوئی چیز غائب ہو گئی ہے۔ میرا مطلب ہے گہنا کپڑا وغیرہ۔''

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''یہاں ایک قتل ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ قتل تم نے کیا ہے۔''

''ہائے میں مرگئی۔'' وہ اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔ ''صدقے جاؤں یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں غریبنی نمائی قتل کروں گی۔ آپ...... آپ مجھ سے مخول تو نہیں کر رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں تجھ سے مخول کرنے کے لیے ہی تو ہم سارے اکٹھے ہو کر یہاں آئے ہیں۔''

انسپکٹر بیدی نے کہا۔ ''لیکن بچو اصل مخول تو تجھ سے تھانے میں چل کر ہو گا۔ چل اٹھ...... آگے لگ ہمارے۔''

ہیجڑا ہراساں تو پہلے تھا اب باقاعدہ رونے لگا۔ ''ہائے اللہ جی!'' میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔ بھگوان کی سوگند میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ کی جوانی کی سوگند بالکل نردوش ہوں میں۔ آپ مجھے تھانے لے گئے تو میں بدنام ہو جاؤں گی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔''

بیدی سنگھ کڑک کر بولا۔ ''بدنام ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا تیرا! کون سی منگنی ٹوٹ جائے گی۔''

ہیجڑے نرگس نے بہت واویلا کیا لیکن وہ مشکوک تھا، لہٰذا اُسے تھانے لے جانا ضروری تھا۔ نرگس کے ساتھ ساتھ میں نے مقتول کے جگری یار شوکت علی کو بھی شاملِ تفتیش کرلیا اور دونوں کو لے کر تھانے آ گیا۔

☆======☆======☆

ضروری کارروائی کے بعد سعید عرف ہرنائی کی لاش دفن کر دی گئی۔ تھانے میں ہیجڑے نرگس اور اُس کے مالک شوکت علی سے تفصیلاً پوچھ گچھ ہوئی۔ نرگس مشکوک کردار کا شخص تھا۔ تفتیش کے دوران اُس نے کئی اُلٹی سیدھی باتیں کیں۔ اس کے خلاف مجھے تین طرح کا شک تھا۔ شک نمبر ایک یہ تھا کہ شاید اس ہیجڑے کے ساتھ مقتول کا کوئی ''پیار محبت'' چل رہا تھا جس کی وجہ سے قتل کا واقعہ ہوا لیکن ہیجڑے کی شکل وصورت اور عمر دیکھنے کے بعد میرا یہ شک رفع ہو گیا تھا۔ دوسرا شک یہ تھا کہ ممکن ہے مقتول ہرنائی نے ہیجڑے نرگس کو کوئی غلط کام کرتے پکڑ لیا ہو۔ مالک مکان گھر میں نہیں تھا۔ چابی ہیجڑے کے پاس تھی۔ اُس کی نیت خراب ہو سکتی تھی اور وہ قیمتی اشیاء پر ہاتھ صاف کرنے کا پروگرام بنا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ مقتول اپنے دوست سے ملنے اُس کے گھر پہنچا ہو اور اُس نے ہیجڑے نرگس کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ ہیجڑے نے اپنا جرم چھپانے کے لیے اُسے قتل کر دیا ہو۔ تیسرا شک یہ تھا کہ شوکت علی کے گھر میں آ کر خود مقتول نے کوئی غلط کام کرنے کی کوشش کی ہو۔ ہیجڑے نے اُسے روکا ہو جس کے نتیجے میں دونوں لڑ پڑے ہوں اور ہیجڑے کے ہاتھوں ہرنائی کا خون ہو گیا ہو۔

یہ بات ظاہر تھی کہ ہرنائی کے خون کے بعد ہیجڑا نرگس حواس باختہ ہو گیا ہو گا۔ اُس نے سوچا ہو گا کہ لاش کو ٹھکانے لگایا جائے۔ عین ممکن تھا کہ دروازے وغیرہ بند کر کے اُس نے نہایت تسلی سے اس معاملے پر سوچ بچار کی ہو۔ جب اُس نے غور وفکر کیا تو اُس کے ذہن میں ایک زبردست ترکیب آئی۔ دس بارہ یا پندرہ سولہ گھنٹے پہلے بھوانی بلڈنگ ایک خوفناک دھاکے سے زمین بوس ہو چکی تھی۔ بہت سے افراد مارے گئے تھے اور ابھی ملبہ وغیرہ ہٹانے کا کام جاری تھا۔ ہیجڑے نرگس نے مقتول کے سر پر کسی وزنی شے سے ضربیں لگائی تھیں لہٰذا اگر اُسے بھوانی بلڈنگ کے دور تک پھیلے ہوئے ملبے میں پھینک دیا جاتا تو اُس کی موت کو حادثے کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ ہٹے کٹے ہیجڑے نے مقتول کو کندھے پر لادا اور رات کی

تاریکی میں تین چار چھتیں طے کر کے اُس چھت پر پہنچ گیا جو گرنے والی بلڈنگ کے بالکل ساتھ واقع تھی۔ وہ دن کی روشنی میں ملبے کے خدوخال دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ مقتول کو کس سمت پھینکنا زیادہ مناسب رہے گا۔ مقتول کو پھینکنے کے بعد وہ گھر واپس آ گیا اور وہاں سے واردات کا ہر کھوج کھرا مٹا دیا۔ لیکن وہ یہ نہ جان سکا کہ مقتول کی جیب میں نقدی اور کاغذات کے علاوہ سینما کا وہ ٹکٹ بھی ہے جو اُس نے بھوانی بلڈنگ گرنے کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد خریدا ہے۔

یہاں صرف ایک چھوٹی سی اُلجھن پیدا ہو رہی تھی۔ اگر لاش اوپر چھت سے گرائی گئی تھی تو پھر وہ صبح ہوتے ہی ملبے کے اوپر پڑی نظر کیوں نہ آئی۔ کیا اُسے نیچے آ کر ملبے میں چھپایا گیا تھا یا پھر وہ اتفاقاً کسی ایسے سوراخ یا درز میں گری تھی جہاں سے نیچے لڑھک گئی تھی اور ملبہ ہٹانے والوں کو محسوس ہوا تھا کہ وہ ملبے کے نیچے سے نکلی ہے۔

اگلے دو روز میں انسپکٹر بیدی اور میں نے جو تفتیش کی اُس کے نتیجے میں ہیجڑا نرگس مزید پھنس گیا۔ وہ کسی بھی طرح یہ بات ثابت نہیں کر سکا کہ اتوار اور سوموار کی درمیانی شب وہ اپنے گھر میں تھا اور شوکت علی کے گھر میں جو کچھ ہوا وہ اس کے بارے میں بے خبر ہے۔ پھر اُس کے گھر سے کچھ ایسی چیزیں بھی برآمد ہو گئیں جنہیں مسروقہ کہا جا سکتا تھا۔ ان میں شوکت کی بیوی نوشابہ کی ایک گمشدہ قمیض اور ایک طلائی انگوٹھی تھی۔ گو یہ چیزیں قتل والے واقعے سے کئی ہفتے پہلے گم ہوئی تھیں لیکن ان اشیاء کی برآمدگی سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ نرگس قابلِ اعتبار شخص نہیں تھا اور موقع ملنے پر وہ کوئی بڑا ہاتھ بھی مار سکتا تھا۔ میرے علاوہ بیدی سنگھ کا خیال بھی یہی تھا کہ ہیجڑے نرگس جیسے شخص کو گھر کا رکھوالا بنا کر چلے جانا شوکت علی کی بہت بڑی غلطی تھی۔

شوکت علی کے گھر کی تلاشی کے دوران ہمیں ایک چیز بھی مل گئی جس پر آلۂ قتل کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ لوہے کی ایک موٹی زنگ آلود نال کا چار فٹ لمبا ٹکڑا تھا۔ ایسی نال (پائپ) دستی نلکوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ مقتول کے سر پر آنے والی چوٹیں اور لکڑی کے دروازے پر ضرب کا نشان اسی نال کا مرہونِ منت ہو۔ اس نال پر فنگر پرنٹس بھی تلاش کیے جا سکتے تھے لیکن یہ نال چونکہ کھلے صحن میں پڑی رہی تھی اور موسلا دھار بارشوں میں بھیگتی رہی تھی اس لیے یہ کوشش فضول تھی۔

حوالات میں کسی ضدی اور ڈھیٹ ملزمہ سے کچھ اُگلوانا ہو تو لیڈی پولیس کی مدد لینا پڑتی ہے لیکن نرگس ملزمہ تھی اور نہ ملزم۔ وہ دونوں کے درمیان کی شے تھی لہٰذا مجبوراً عملہ ہی

اُس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا مرکزی تھانے کے ایک سخت گیر حوالدار چندر سنگھ نے جب اُس سے مار پیٹ کی تو اُس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ''ہائے اللہ...... اوئی اللہ میں مر گئی۔ ہائے رام میری کلائی مڑ گئی۔ ظالمو...... کمینو! تمہیں آئے کسی کی آئی۔ تمہارے شریر میں کیڑے پڑیں۔ دیکھو لوگو! مجھ غریبنی کو مار ڈالا...... دیکھو میرا کیا حال کر دیا۔''

وہ چیخ و پکار کرتا رہا اور چندر سنگھ اپنے کام میں لگا رہا...... اپنی گرفتاری کے دوسرے روز تک نرگس کو امید تھی کہ شوکت علی اُس کی مدد کو آئے گا اور اُسے چھڑا کر لے جائے گا لیکن وہ تو خود تفتیش میں بیٹھا ہوا تھا۔ لہٰذا اگلے روز شام کو ہیجڑے نرگس نے مایوس ہو کر شوکت علی کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ اُس نے یہ بیان داغا کہ شوکت علی کے دوست ''مقتول ہرنائی'' اور اُس کی بیوی نوشابہ کے درمیان کوئی گڑبڑ تھی۔ وہ دونوں آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے اور کئی بار ایسا بھی ہوا کہ ہرنائی، شوکت کی غیر موجودگی میں اُس کے گھر آیا اور دیر تک گھر میں موجود رہا۔ ہیجڑے نے بتایا شوکت کی بیوی نے پچھلی سردیوں میں ہرنائی کو اپنے ہاتھ سے سویٹر بُن کر دیا تھا اور گھر میں اُس کی دعوتیں کرتی رہتی تھی۔

تفتیش کا یہ رُخ بھی میرے ذہن میں موجود تھا۔ میں شوکت علی سے اس بارے میں پوچھ گچھ بھی کر چکا تھا لیکن اُس نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُسے اپنے دوست اور اپنی بیوی پر پورا اعتماد ہے۔ اُس کی بیوی نیک اور باوفا ہے اور اُس کا دوست بھی ایک سچا اور کھرا شخص تھا۔ وہ کسی ایسی بات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا جس کی وجہ سے ''دوستی'' کے نام پر حرف آتا۔

ہیجڑے نرگس کے بیان کے بعد مجھے ایک بار پھر اس معاملے میں کرید پیدا ہوئی۔ میں نے اپنے ساتھی انسپکٹر بیدی سنگھ سے کہا کہ وہ اس بارے میں چھان بین کرے۔ انسپکٹر بیدی نے بڑی تیزی سے کام کیا اور چوبیس گھنٹے میں ٹھیک ٹھاک کامیابی حاصل کر لی۔ وہ ایک ایسے گواہ کو سامنے لے کر آیا جس نے بتایا کہ ہرنائی کی موت سے صرف چار پانچ روز پہلے شوکت اور ہرنائی میں زبردست جھڑپ ہوئی تھی۔ یہ ایک حیران کُن انکشاف تھا۔ شوکت اور ہرنائی جگری دوست مشہور تھے اور ابھی تک کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی جس سے پتہ چلتا کہ شوکت اور ہرنائی کے تعلقات خراب ہو چکے تھے۔ اس جھڑپ کی تفصیلات بتاتے ہوئے صدیق نامی اُس شخص نے کہا۔ ''کرشن نگر کے بتی والے چوک میں میرا ہوٹل ہے۔ یہ نو یا دس تاریخ کی بات ہے شام کے بعد شوکت اور ہرنائی ہوٹل میں آئے۔ وہ اکثر چائے وغیرہ پینے میرے ہوٹل میں آتے رہتے تھے۔ کبھی کبھار اُن کے

ساتھ کوئی مشترکہ دوست بھی ہوتا تھا۔ وہ دیر تک خوش گپیوں میں مصروف رہتے تھے لیکن اُس روز وہ خوش گپیوں کے موڈ میں نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے ہال کمرے میں بیٹھنا پسند کیا۔ وہ اوپر چھوٹی سی گیلری میں چلے گئے۔ یہاں صرف دو میزیں اور آٹھ دس کرسیاں رکھی رہتی ہیں۔ کوئی فیملی کھانا وغیرہ کھانے آ جائے تو ہم اُسے اوپر بھیج دیتے ہیں۔ شوکت اور ہرنائی صاحب گیلری میں بیٹھ کر گرما گرم بحث میں مصروف ہوئے۔ میں نے سمجھا کہ شاید کسی سیاسی معاملے پر تلخ کلامی ہوگئی ہے۔ میری ہرگز خواہش نہیں تھی کہ میں ان کی باتیں سنوں لیکن اتفاق ایسا ہوگیا کہ میں نے اُن کی باتیں سن لیں۔ میں عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنے اُوپر غسل خانے میں پہنچا۔ یہ غسل خانہ گیلری کے بالکل ساتھ واقع ہے۔ درمیان میں لکڑی کی ایک دیوار ہے۔ گیلری میں کی جانے والی باتیں اکثر غسل خانے میں صاف سنی جاتی ہیں۔ اُس روز بھی یہی ہوا۔ شوکت صاحب غصے میں بھرے ہوئے تھے اور ہرنائی سے کہہ رہے تھے۔ ''یہ معمولی بات نہیں ہے ہرنائی! کوئی اور ہوتا تو پتہ نہیں کیا کر گزرتا۔ یہ میرا صبر ہے کہ میں خاموش ہوں اور سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ بس اب بہتر یہ ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔''

ہرنائی بولا ''میں نے کہا ہے ناں کہ اب تمہیں اپنی صورت نہیں دکھاؤں گا۔''

''میں صورت کی بات نہیں کر رہا۔'' شوکت غرا کر بولا۔ ''میں بات کر رہا ہوں تمہارے اس شہر سے دفع ہونے کی اور کبھی اپنا نحس قدم یہاں نہ رکھنے کی۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر وہ ہو جائے گا جو دُنیا دیکھے گی۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے شوکت کی آواز نہایت خطرناک ہوگئی تھی اور لرز رہی تھی۔

ہرنائی نے دبے لہجے میں کہا۔ ''کسی اور نے یہ دھمکی دی ہوتی تو میں اِس کا جواب دیتا لیکن تمہارے سامنے میرے ہاتھ پہلے بھی بندھے تھے آج بھی بندھے ہیں۔ لیکن......''

''پھر وہی لیکن۔'' شوکت گرجا۔ ''میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ میرا سینہ پھٹنے لگتا ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ جو کچھ تمہارے بارے میں سن چکا ہوں اُس سے زیادہ اور کچھ نہ سنوں۔ بس اب تم میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔'' اُس کے ساتھ ہی کرسیاں گھسٹنے کی آوازیں آئی تھیں۔ میں وضو کر کے باہر نکلا تو گیلری خالی تھی۔ وہ دونوں جا چکے تھے۔ میں حیران تھا کہ ہمیشہ خوش و خرم نظر آنے والی اِس جوڑی کو کیا ہوا ہے۔''

محمد صدیق نامی اس ''ہوٹل والے'' کا بیان بے حد اہم اور معنی خیز تھا۔ ہم نے اس سلسلے میں تھوڑی سی مزید تفتیش کی تو چند اور باتیں سامنے آئیں۔ معلوم ہوا کہ چند ماہ پہلے

شوکت، ہرنائی اور نوشابہ ڈلہوزی کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں پندرہ بیس روز گزارے۔ اس دوران ہیجڑا نرگس ہی گھر کا نگہبان رہا تھا۔ ڈلہوزی میں قیام کے دوران شوکت کو ایک ضروری کام سے ایک دن کے لیے امرتسر آنا پڑا تھا۔ اس دوران ہرنائی اور نوشابہ اکیلے ڈلہوزی میں رہے تھے۔ بعد میں شوکت کی والدہ نے اس بات پر اعتراض بھی کیا تھا کہ وہ جوان بیوی کو دوست کے ساتھ ہوٹل میں کیوں چھوڑ آیا ہے۔

اس کے علاوہ ہرنائی اور شوکت کے ایک جاننے والے نے بھی بیان دیا کہ ہرنائی اور شوکت کی بیوی نوشابہ میں بہت بے تکلفی تھی۔ بظاہر یہ دیور بھابی والی بے تکلفی تھی مگر کبھی کبھی یہ بے تکلفی اس ''رشتے'' سے آگے بڑھ جاتی تھی۔ فلموں کہانیوں اور شعر و شاعری کے بارے میں وہ لوگ بڑی کھلی ڈلی باتیں کرتے تھے۔ ہرنائی، شوکت کے بچے سے بہت پیار کرتا تھا لیکن کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ بچے کی آڑ میں بچے کی ماں سے پیار جتایا جا رہا ہے۔

شوکت پہلے سے زیرِ تفتیش تھا، اب میں نے اُسے پوچھ گچھ کے لیے حراست میں لے لیا اور عدالت میں پیش کر کے سات روزہ ریمانڈ حاصل کر لیا۔ ریمانڈ کے وقت عدالت میں اکثر نوک جھونک ہوتی ہے۔ اگر ملزم نے وکیل کھڑا کر لیا ہو تو وہ سرکاری وکیل کے آڑے آتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ریمانڈ کی درخواست منظور نہ ہو اور ملزم کی ضمانت ہو جائے یا اُسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے۔ دوسری طرف سرکاری وکیل زور دیتا ہے کہ ملزم چونکہ حقائق چھپا رہا ہے اس لیے تفتیش مکمل کرنے کے لیے ریمانڈ ضروری ہے۔ ریمانڈ ہو جانے کے بعد جب ملزم کو پولیس کے حوالے کیا جاتا ہے تو وہ بہت پریشان ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر وہ ''نواں نواں پھنسا ہو'' تو اس کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب وہ تھانیدار کے رحم و کرم پر ہے اور زندہ سلامت حوالات سے باہر نہیں آ سکے گا۔ شوکت علی کی حالت بھی بہت پتلی تھی۔ کچہری سے حوالات تک وہ مسلسل صفائیاں پیش کرتا رہا بلکہ راستے میں اُس نے میرے ایک حوالدار کو رشوت کی پیش کش بھی کر دی۔

حوالات میں شوکت علی سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ اُس نے بیان دیا تھا کہ اتوار اور سوموار کی درمیانی شب وہ کپورتھلہ میں اپنے سسرال کے ہاں مقیم تھا۔ ہم نے شوکت کے اس بیان کی صحت جانچی۔ ایک سب انسپکٹر نے کپورتھلہ جا کر شوکت کے ساس سسر اور سالوں وغیرہ کے بیانات لیے۔ ان بیانات سے تصدیق ہوتی تھی کہ رات نو بجے تک شوکت اپنے سسرال ہی میں تھا۔ اس کے بعد سب سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ اگر رات رات میں شوکت کپورتھلہ سے امرتسر پہنچا ہو اور ہرنائی کو قتل کر کے واپس چلا گیا ہو تو اور

بات تھی (بہر حال ایسا کرنا آسان نہیں تھا۔ کپورتھلہ سے امرتسر تک کافی سفر تھا اور پھر قتل کے بعد امرتسر سے واپس کپورتھلہ پہنچ جانا قریباً ناممکن تھا)

ایک دلیل یہ بھی تھی کہ شاید شوکت نے ہرنائی کو خود قتل کرنے کی بجائے یہ کام کسی کرائے کے قاتل یا بدمعاش سے کروایا ہو۔ جو لوگ اس طرح پیسے دے کر جرم کراتے ہیں اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ خود موقعے سے دُور رہیں اور ایسی جگہ رہیں جہاں کچھ لوگ گواہی دے سکیں کہ وہ موقعے سے دُور تھے...... تفتیش کا عمل جاری رہا۔ ایک دو موقعوں پر شوکت سے تھوڑی سی سختی بھی کی گئی لیکن وہ اپنے بیان پر ڈٹا رہا۔ اُس کا بیان یہ تھا کہ ہرنائی کے قتل میں اُس کا کوئی ہاتھ نہیں اور نہ ہی اُس کا ہرنائی سے کوئی ایسا اختلاف تھا جس کے سبب وہ اُسے جان سے مار دیتا۔ جب اُس سے پوچھا گیا کہ محمد صدیق کے ہوٹل میں ہرنائی سے اُس کا کس بات پر جھگڑا ہوا تھا تو اُس نے صاف انکار کر دیا کہ ایسا کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ محمد صدیق کے بڑے بھائی سے اُس کی کاروباری رقابت ہے جس کی بناء پر وہ اُسے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس کیس کے دوران بلال شاہ بھی سرگرم کردار ادا کر رہا تھا۔ وہ پچھلے تین چار ماہ کافی بیمار رہا تھا۔ کسی حکیم کے کہنے پر اُس نے جگر کی کمزوری رفع کرنے اور بھوک کھولنے والی اُلٹی سیدھی دوائی کھالی تھی۔ اس دوائی سے اُس کا جگر تو شاید مضبوط ہو گیا ہو لیکن بھوک تو پہلے ہی اتنا کھلی ہوئی تھی کہ اور کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا بھوک تو نہیں کھلی...... ہاں کئی ایک بیماریاں کھل گئیں۔ تین چار مہینے وہ ٹھیک ٹھاک بیمار رہا اور بستر پر پڑا نیم حکیم کے اگلے پچھلوں کو بددعائیں دیتا رہا۔

اب کچھ دنوں سے وہ صحت مند تھا اور میرے ساتھ سرگرمی سے تفتیش میں حصہ لے رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے کئی بار بتایا ہے اجنبی لوگوں سے رشتے جوڑنا بلال شاہ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایک دن اُس نے پتہ نہیں کیا چکر چلایا کہ ''بھگتان والا دروازہ'' گیا اور شوکت علی کی بیوی نوشابہ کو بھتیجی بنا کر آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''میرا کمال دیکھیں خان صاحب! راہ چلتے اُس سے ملاقات کی۔ اُس وقت نو بجے تھے۔ گیارہ بجے وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ ساڑھے گیارہ بجے میں نے اُسے بھتیجی بنا لیا۔ بارہ بجے اس نے بھی مجھے چچا جان کہنا شروع کر دیا۔ ایک بجے اُس نے مجھے اپنے ہاتھ کی پکی روٹی کھلائی اور اب ڈھائی بجے میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ ذرا غور فرمائیں جی...... صرف ساڑھے پانچ گھنٹوں میں کتنا لمبا پینڈا مکایا ہے میں نے۔''

میں نے کہا۔ ''صرف پینڈا ہی مکایا ہے یا کوئی کام کی بات بھی معلوم کی ہے۔''

وہ بولا۔ ''سو باتوں کی ایک ہی بات ہے جی! لڑکی بہت سوہنی اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایسی ہی لڑکیوں کے پیچھے قتل ہوتے ہیں اور دشمنیاں شروع ہوتی ہیں۔ اُس سے مل کر مجھے تو یقین ہو گیا ہے کہ قتل کی وجہ وہ خود ہی ہے۔ ہرنائی جوان اور غیر شادی شدہ تھا۔ لڑکی کے لشکارے نے اُسے اندھا کر دیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ اُس کے جگری یار کی بیوی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی طرح لڑکی بھی اُس کے چکر میں آ گئی ہو۔ یا چکر میں نہ آئی ہو تو ڈانواں ڈول ہو گئی ہو۔ ایسی باتیں کب تک چھپی رہ سکتی ہیں۔ آخر شوکت کو معلوم ہو گیا۔ اُس نے طیش میں آ کر ہرنائی کا قصہ تمام کر ڈالا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن دیکھا گیا ہے کہ ایسے موقعوں پر قاتل اپنی بیوی کو بھی نہیں بخشتے۔''

بلال بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ بیوی کا اتنا قصور نہ ہو۔''

میں نے کہا ''یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اگر بیوی کا قصور نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ معاملہ ابھی اتنا نہیں بڑھا تھا کہ شوہر طیش میں اندھا ہو جاتا اور دوست کو قتل کر ڈالتا...... بہر حال ابھی ہم کوئی بھی نتیجہ نکالنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور نہ ہی ہمیں نکالنا چاہیے۔''

اگلے روز بلال شاہ نے دوپہر کے وقت ایک اور دھماکہ کر دیا۔ مرکزی تھانے کا ایک حوالدار جو بیدی سنگھ کے ساتھ کام کرتا تھا میرے پاس آیا اور رازداری سے کہنے لگا۔ ''انسپکٹر صاحب! مجھے لگتا ہے کہ آپ کا مخبر بلال شاہ رشوت لینے کے چکر میں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر کہا۔

وہ بولا۔ ''بلال شاہ آج صبح سویرے حوالاتی شوکت علی کے گھر گیا تھا۔ وہ اُس کی بیوی نوشابہ سے ملا ہے اور اُسے خوب ڈراتا دھمکاتا رہا ہے۔''

''ڈرانے دھمکانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

حوالدار نے کہا۔ ''بلال نے ملزم کی بیوی کو بتایا ہے کہ انسپکٹر نواز خان تمہارے شوہر پر بے تحاشہ تشدد کر رہے ہیں۔ وہ بار بار بے ہوش ہوتا ہے، پانی کے چھینٹے دے کر اُسے ہوش میں لایا جاتا ہے اور پھر مار پیٹ شروع کر دی جاتی ہے۔ یہی سلسلہ رہا تو وہ ایک آدھ دن میں دم توڑ جائے گا۔''

مجھے یقین نہیں آیا کہ بلال شاہ میرے بارے میں اس طرح کی فضول بکواس کر سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شوکت علی سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی اور ایک دو بار اُس کی پٹائی بھی

ہوئی تھی لیکن یہ معمولی مار پیٹ تھی اور اس مار پیٹ سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔

حوالدار نے کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے جی کہ بلال ملزم کی بیوی کو ڈرا دھمکا کر اُس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس سے پیسے وغیرہ بٹور سکتا ہے یا پھر......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

میں اُس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ گیا۔ اُس کا اشارہ ملزم کی بیوی کی جوانی اور خوبصورتی کی طرف تھا۔ بلال شاہ سے مجھے ''اِس قسم'' کی امید تو ہرگز نہیں تھی، ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ وہ کسی مجبوری کے تحت ''پیسے'' کے چکر میں پڑ گیا ہو۔ اگر ایسی بات نہیں تھی تو پھر اُسے کیا ضرورت پڑی تھی ملزم کی بیوی کو ڈرانے دھمکانے کی۔

ابھی میں اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ایک بھاری آواز والے شخص نے میرا نام پوچھا اور بولا ''لیجیے بات کیجیے'' اس کے ساتھ ہی ایک جوان زنانہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ بولنے والی کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے اٹکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں شوکت علی کی بیوی ہوں۔''

''کون شوکت علی؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''وہی جسے آپ نے ہرنائی کے قتل کے شبے میں پکڑ رکھا ہے۔ میں آپ سے اس کیس کے سلسلے میں ایک بڑی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں......''

''ہاں ہاں کہیے۔ میں سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''میں فون پر سب کچھ تو نہیں بتا سکتی۔ ہاں آپ کو اس بات کا یقین دلاتی ہوں کہ میرا شوہر بے قصور ہے۔''

''تو پھر قصوروار کون ہے؟'' میں نے ذرا تلخی سے پوچھا۔

''میں کل صبح خود آپ کے پاس آؤں گی اور اس سلسلے میں تفصیل سے آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔ اب صرف آپ سے یہ کہنا ہے کہ کل تک میرے شوہر کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں پہنچائی جائے گی لیکن کچھ پتہ تو چلے کہ تم کیا بتانا چاہ رہی ہو۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے یا صرف ٹائم پاس کرنا چاہ رہی ہو۔''

وہ فون پر لمبی بات کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن میری کوشش تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ بول دے۔ ہمارے درمیان دو تین منٹ مزید گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو میں مجھے صرف اتنا پتہ چل سکا کہ ''قاتل'' کا تعلق نوشابہ کے سسرال سے نہیں میکے سے ہے۔ اُس نے کل ہر صورت دس بجے

تک مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا اور یہ وعدہ بھی کیا کہ کیس کے سلسلے میں مجھ سے پورا تعاون کرے گی۔

اُدھ پون گھنٹے بعد بلال شاہ بھی تھانے آ گیا۔ کچھ کھا پی کر آیا تھا کیونکہ مونچھیں گھی میں چمک رہی تھیں۔ میں اُس وقت کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بلال شاہ کرسی گھسیٹ کر میرے پاس آن بیٹھا۔ ''خان صاحب! آج بڑا چکر چلایا ہے میں نے۔'' وہ پُر جوش لہجے میں بولا۔

''مثلاً کیا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''آج میں اپنی بھتیجی کے گھر ''بھگتان والا'' گیا تھا۔ کافی لمبی چوڑی باتیں ہوتی رہیں اُس سے۔ دراصل کل میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ تھانے جا کر اُس کے شوہر کا پتہ کروں گا۔ آج میں اُسے یہی بتانے گیا تھا کہ تھانے میں اُس کے مجازی خدا پر کیا بیت رہی ہے۔''

''پھر کیا بتایا تم نے؟''

''وہی جو بتانا چاہیے تھا۔ میں نے کل ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ لڑکی کمزور دل کی ہے اور شوہر کی وجہ سے بے حد پریشان بھی۔ میں نے آج اُس کا خوب ''تراہ'' نکالا۔ میں نے کہا کہ حوالات میں اُس کے شوہر کی ایسی تیسی ہو رہی ہے اور اگر اُسے انسپکٹر نواز کے ہاتھوں سے بچایا نہ گیا تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے جی کہ وہ اس قتل کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی ہے اور آج یا کل آپ سے ضرور ملنے آئے گی۔''

بلال شاہ کی چھاتی پھولی ہوئی تھی اور آنکھوں میں یقین کی چمک تھی۔ میں نے کہا ''بلال شاہ! تمہارا اندازہ سو فیصد درست ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے لڑکی کا فون آیا ہے۔ وہ کیس کے سلسلے میں کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے۔''

بلال شاہ کا چہرہ کھِل اٹھا۔ ''دیکھا...... میں نے کہا تھا نا...... آخر ہمارا بھی کوئی تجربہ ہے جناب! یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ مجھے پتہ تھا کہ لڑکی ڈر کر ضرور کچھ بتائے گی۔ اب آپ اس کیس کو حل سمجھیں بلکہ ''حل وا'' سمجھیں۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بلال شاہ ٹیلیفون سے پہلے نہیں آ گیا اور اُسے دیکھ کر میرے منہ سے کوئی غلط سلط بات نہیں نکل گئی، ورنہ اُس نے میری جان کو آ جانا تھا...... کام اُس نے واقعی عقلمندی کا کیا تھا اور اُس کی عقلمندی کا ثبوت بھی سامنے آ گیا تھا۔

اب مجھے بڑی بے چینی سے کل صبح کا انتظار تھا۔

☆======☆======☆

نوشابہ نے صبح دس بجے آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ساڑھے آٹھ بجے ہی یہ اطلاع آ گئی کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ رات پچھلے پہر اُس نے بھاری مقدار میں خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ خوش قسمتی سے اُس کا دیور گھر میں تھا۔ وہ اُسے ایک رکشہ میں ڈال کر ہسپتال لے گیا تھا۔ اب ڈاکٹر اُس کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔

یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔ صرف دس پندرہ گھنٹے پہلے جس لڑکی نے ہرنائی قتل کیس میں بھرپور تعاون کا ارادہ ظاہر کیا تھا، وہ اب ہسپتال کے بستر پر موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ابتدائی اطلاع یہی تھی کہ اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہ بھی قتل کی سازش ہو۔ اصل صورتِ حال کا علم لڑکی کی بے ہوشی ختم ہونے پر ہی ہو سکتا تھا۔

دوپہر کو ہسپتال سے اطلاع آئی کہ نوشابہ شوکت کی حالت اب بہتر ہے۔ مجھے اُمید تھی کہ چار پانچ بجے تک وہ ہوش میں آ کر بیان دینے کے قابل ہو جائے گی لیکن رات گئے تک یہ اُمید بر نہیں آئی۔ میں اور انسپکٹر بیدی سنگھ ہسپتال پہنچے۔ نوشابہ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھی۔ انچارج ڈاکٹر نے بتایا کہ مریضہ کی زندگی کو فوری خطرہ تو لاحق نہیں مگر اُس کے دماغ پر اثر ہوا ہے جس کے سبب وہ ہوش میں نہیں آ رہی۔ اُس نے امید ظاہر کی کہ کل تک وہ نارمل ہو جائے گی۔

کل گزر گیا اور پھر دو دن مزید گزر گئے۔ نوشابہ شوکت ہوش میں نہیں آئی۔ اُسے نلکیوں کے ذریعے خوراک دی جا رہی تھی۔ بڑے ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ مریضہ کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آکسیجن کی کمی سے اُس کے دماغ کا مرکزی حصہ متاثر ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ابھی ہوش میں آ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو تین ماہ بعد بھی یہی حالت رہے......

اس نئے واقعے کی تفتیش سے یہی پتہ چلا کہ مایوسی اور پریشانی کی شدید کیفیت سے گھبرا کر نوشابہ نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اُس کے دیور نے بتایا کہ وہ رات گئے تک شدید پریشان تھی اور کش مکش میں دکھائی دیتی تھی۔ اُس کی پریشانی اور کش مکش کی وجہ میرے اور بلال شاہ کے لیے پوشیدہ نہیں تھی۔ نوشابہ کے پاس ایک اہم اطلاع تھی۔ یہ اطلاع جہاں اُس کے شوہر کو بچا سکتی تھی وہاں کسی دوسرے عزیز کو پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتی تھی۔ شاید وہ خودکشی کرنے تک یہی سوچ رہی تھی کہ اپنے کس پیارے کو بچائے اور کس کو موت کے دہانے پر کھڑا کر دے؟

بلال شاہ اور میں نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ ہمیں نوشابہ کے میکے کپورتھلہ چلنا

چاہیے۔ نوشابہ کی آخری گفتگو سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ ہرنائی کے قاتل کا تعلق اُس کے میکے سے ہے...... ہم ایک روز علی الصبح امرتسر سے روانہ ہوئے اور دوپہر کے وقت کپورتھلہ کے ایک مضافاتی گاؤں میں پہنچ گئے۔ نوشابہ کے باپ کا گھر ویسا ہی تھا جیسا ایک عام کاشتکار کا ہونا چاہیے۔ نوشابہ کی والدہ پچھلے دو سال سے چارپائی سے لگی ہوئی تھی اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ اُس کا والد پچاس برس عمر کا ایک عام سا شخص تھا۔ معلوم ہوا کہ نوشابہ کے صرف دو بھائی ہیں۔ ایک پچھلے پانچ سال سے سنگاپور میں ہے اور بندرگاہ پر کام کرتا ہے، دوسرا سرکاری ملازم ہے اور کوئی ایک مہینہ پہلے کوئٹہ کے دور دراز علاقے سے امرتسر ٹرانسفر ہوا ہے۔ اِس دوسرے بھائی کا نام عقیل تھا۔ نوشابہ کے والد سے کچھ دوسرے عزیزوں کے پتے ٹھکانے بھی معلوم ہوئے۔ تاہم میں نے بہتر جانا کہ پہلے عقیل نامی اس نوجوان سے پوچھ گچھ کی جائے۔ عورت کے سلسلے میں سب سے پہلے شوہر اور بھائی کی غیرت ہی جاگتی ہے۔ نوشابہ اپنے شوہر کو تو بے گناہ گردانتی رہی تھی۔ اب ہو سکتا تھا کہ ہرنائی کو موت کے گھاٹ اتارنے والا اس کا بھائی ہو۔

امرتسر پہنچ کر میرے اے ایس آئی نے برق رفتاری سے تفتیش کی اور پتہ چلایا کہ عقیل احمد فائر بریگیڈ یعنی آگ بجھانے والے محکمے میں ملازم ہے۔ وہ انچارج فائرمین تھا اور مناسب تنخواہ لیتا تھا...... سنسنی خیز انکشاف یہ تھا کہ اتوار کی صبح دس بج کر بیس منٹ پر جب بھوانی بلڈنگ گری تو امدادی عملے کے ساتھ سب سے پہلے عقیل احمد ہی موقعے پر پہنچا تھا۔ اے ایس آئی نے تفصیل بتائی تو مجھے بھوری مونچھوں اور بادامی آنکھوں والا وہ نوجوان یاد آ گیا جو سوموار کی شام تک موقعے پر موجود رہا تھا اور دوسرے کارکنوں کے ساتھ مل کر جوش و خروش سے امدادی کارروائیاں کرتا رہا تھا۔ اتوار کو دوپہر کے وقت جب ملبے کے نیچے جاں بلب لوگ چیخ و پکار کر رہے تھے اور حشر کا سماں تھا اُس نوجوان نے ایک آٹھ سالہ بچی کو ملبے سے نکالنے کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔ وہ ایک تنگ سوراخ میں رینگ کر ملبے میں گھسا تھا اور سیڑھیوں کے جنگلے میں پھنسی ہوئی اُس بچی کو کھینچ کر باہر لے آیا تھا۔ بعد میں دو بجے کے قریب جب ملبے کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی تھی تو اُس نے آگ پر قابو پانے میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اب وہی نوجوان ایک ملزم کی حیثیت سے میرے سامنے پیش ہونے والا تھا۔

بالکل اتفاقی طور پر حالات کی کڑیاں آپس میں مل گئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا کہ عقیل نامی یہ نوجوان قتل کے الزام سے بچ نہیں سکے گا۔ مقتول کی لاش بھوانی بلڈنگ کے ملبے میں

پھینکی گئی تھی اور بھوانی بلڈنگ کے ملبے سے عقیل کا گہرا تعلق ثابت ہو گیا تھا...... میرے عملے نے عقیل کو شام سات بجے ایک بس سٹاپ پر حراست میں لیا، اُس نے بتایا کہ وہ ہسپتال میں اپنی بیمار بہن کی عیادت کر کے واپس اپنے کوارٹر میں جا رہا تھا۔ وہ اپنی گرفتاری پر سخت حیران تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حیران نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ چوڑے شانوں اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ بہن کی طرح گورا چٹا تھا لیکن زیادہ خوبصورت نہیں تھا۔ اُس کے خدوخال میں ایک طرح کی کرختگی پائی جاتی تھی۔ ابھی اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پوچھا کہ اتوار اور سوموار کی درمیانی شب وہ کہاں تھا؟

اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''آپ بھی جانتے ہیں میں ''بھگتان والا'' میں تھا۔ وہاں بھوانی بلڈنگ پر میری ڈیوٹی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''بھوانی بلڈنگ سے تمہاری ہمشیرہ کا گھر کتنے فاصلے پر ہے؟''

وہ بولا۔ ''مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں...... لیکن میرا خیال ہے کہ قریب ہی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے ذہن میں یہ نہیں آیا کہ ڈیوٹی ٹائم کے بعد اپنی بہن کے گھر کا چکر لگا آؤ۔''

وہ بولا۔ ''ہم دو روز اتنے مصروف رہے ہیں کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ ویسے بھی کوئٹہ سے یہاں آنے کے بعد میں ایک مرتبہ نوشابہ کے گھر ہو آیا تھا، اس لیے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔''

''اتوار اور سوموار کی درمیانی رات تم نے کہاں گزاری؟''

''رات آٹھ نو بجے کام بند ہو گیا تھا اس لیے ہم دفتر واپس آ گئے۔ رات دفتر ہی میں سوئے۔ صبح سویرے پھر موقع پر پہنچ گئے۔ کیونکہ عمارت کا وہ حصہ گرانا تھا جو کسی بھی وقت گر کر مزید نقصان کا سبب بن سکتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال تم سے مختلف ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ رات نو بجے کام سے فارغ ہونے کے بعد تم اپنی بہن سے ملنے اُس کے گھر گئے۔ وہاں تمہاری ملاقات اپنی بہن سے تو نہیں ہوئی لیکن ہرنائی سے ہو گئی۔ تم نے اُسے قتل کر ڈالا اور پھر کندھے پر لاد کر چھت پر لے آئے۔ تین چار چھتیں طے کرنے کے بعد تم نے اُسے بھوانی بلڈنگ کے ملبے میں پھینک دیا۔ صبح منہ اندھیرے جب کام دوبارہ شروع ہوا تو تم نے ساتھیوں کی نگاہ بچا کر ہرنائی کی لاش کو ملبے میں کچھ اور نیچے گھسیڑ دیا تا کہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ لاش اُوپر سے گرائی گئی

ہے۔''

عقیل کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ تاہم اُس نے کوشش کر کے اپنے اعصاب پر قابو پائے رکھا تھا۔ تنک کر بولا۔ ''لیکن میں کیوں قتل کرتا اس شخص کو۔ میری کیا دشمنی تھی اُس سے؟ میں صرف ایک ماہ پہلے کوئٹہ سے آیا ہوں۔ میں نے نام تک نہیں سنا اس شخص کا۔''

''تم غلط بیانی کر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم جان چکے تھے کہ ہرنائی کے تمہاری بہن سے ناجائز تعلقات ہیں۔ اُسے اپنی بہن کے گھر میں دیکھ کر تم مشتعل ہو گئے اور......''

''میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا انسپکٹر......'' عقیل ایک دم آگ بگولا ہو کر چیخا۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ وہ بالکل دیوانہ ہو رہا تھا۔ اُس نے میرا گریبان پکڑ کر مجھے نیچے گرانا چاہا۔ میں نے اُس کی ٹانگوں میں اڑنگا لگایا۔ وہ اوندھے منہ میز پر گرا۔ مگر گرتے ساتھ ہی اُس نے شیشے کا ایک وزنی جگ تھام لیا اور اس کی زوردار ضرب میرے چہرے پر لگانا چاہی۔ میں نے جھک کر یہ وار بھی بچایا۔ جگ دیوار سے ٹکرا کر چُور ہو گیا۔ عقیل پھر مجھ پر جھپٹا۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہا تھا۔ ''تم نے میری بہن کا نام لیا۔ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

میں نے تین چار زناٹے کے تھپڑ اس کے چہرے پر لگائے اور بازو مروڑ کر بے بس کر دیا۔ بدن شاہ سمیت عملے کے کئی افراد کمرے میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ سب خونخوار نظروں سے عقیل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میرے ایک اشارے پر وہ اس کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں گے لیکن میں نے ''ایسی کسی کارروائی'' کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ عقیل نوجوان تھا۔ خون میں گرمی تھی۔ بہن کے ذکر نے اُسے آگ بگولا کر دیا تھا۔ اگر میں بھی اُس کی طرح آگ بگولا ہو جاتا تو یہ سمجھداری نہیں تھی۔ میں نے صرف وہی کیا جو قانون کے مطابق ضروری تھا۔ پوچھ گچھ کے لیے میں نے اُسے حوالات میں بند کر دیا۔

اب تک اس واقعے کی خبر کافی پھیل چکی تھی۔ بات تھی بھی حیرانی اور دلچسپی کی۔ بھوانی بلڈنگ سے ملنے والی لاشوں میں ایک لاش ایسی بھی تھی جو کہیں اور سے لا کر وہاں پھینکی گئی تھی۔ اخباروں میں بھی یہ خبر آ چکی تھی۔ لاش کی تصویر کے ساتھ واقعات کی تفصیل آئی تھی اور اس حوالے سے میرا ذکر بھی آیا تھا۔ ایک روز دو اخباری نمائندے میرا انٹرویو لینے آن پہنچے۔

اُن میں سے ایک بولا ''انسپکٹر صاحب! یہ معاملہ ہے ہی دلچسپی لینے والا۔ قتل کی ایک واردات کو جس طرح ایک حادثے کی ڈھول میں چھپانے کی کوشش کی گئی ہے، بے حد حیرت

انگیز ہے۔ اب یہ عشق محبت کا چکر نکل آیا ہے۔ ہمارے پڑھنے والے ان خبروں میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ پھر ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے ہمیں اس معاملے کی بہت کرید ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

گھنگھریالے بالوں والا نوجوان شخص بولا۔ ''دراصل مقتول ہرنائی کو ہم لوگ بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ شاید آپ کے لیے یہ اطلاع حیرت کا باعث ہو کہ ہرنائی پنجابی اور اردو میں شعر بھی کہتا رہا ہے۔ خاص طور پر وہ گیت بہت خوبصورت لکھتا رہا ہے۔ اُس کی اکثر چیزیں ہمارے اخبار میں چھپتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ قریباً تین چار سال سے چل رہا ہے۔ شاید آپ کے لیے یہ اطلاع بھی حیران کن ہو کہ ہرنائی امرتسر کا نہیں کپورتھلہ کے ایک نواحی گاؤں ''لڑھکی'' کا رہنے والا ہے۔ پہلے پہل اُس کی جو چیزیں اخبار میں چھپنے کے لیے آتی تھیں ان پر ''لڑھکی'' گاؤں کا نام لکھا ہوتا تھا۔''

نوجوان رپورٹر نے ایک پرانا کاغذ نکال کر دکھایا۔ یہ کوئی پنجابی گیت تھا۔ گیت کے اوپر ''سعید ناشاد لڑھکی کپورتھلہ'' کے الفاظ لکھے تھے۔

یہ اطلاع میرے لیے واقعی بہت اہم تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مقتول سعید عرف ہرنائی کا تعلق بھی اُسی علاقے سے ہے جس علاقے سے نوشابہ کا تعلق ہے۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اُس کے ساتھ ہی مجھے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ نوشابہ اور ہرنائی کے درمیان کیا رشتہ تھا اور نوشابہ کے بھائی عقیل نے ہرنائی کو کیونکر قتل کیا۔ یکے بعد دیگرے اس کیس کی بہت سی کڑیاں آپس میں ملتی چلی گئیں اور ہر مشکل و آسان سوال کا تفصیلی جواب نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اب صرف اور صرف ایک سوال کا جواب درکار تھا اور وہ یہ کہ مقتول ہرنائی اور قاتل عقیل میں اتوار اور سوموار کی درمیانی شب کہاں ملاقات ہوئی۔

اخباری رپورٹرز کی اطلاع پر میں نے فوراً کپورتھلہ کا رُخ کیا اور ایک دُور افتادہ الگ تھلگ گاؤں میں مقتول ہرنائی کے وارثوں کا سراغ لگا لیا۔ سعید عرف ہرنائی کے والدین فوت ہو چکے تھے ایک بہن کہیں لاہور کے آس پاس بیاہی ہوئی تھی۔ دو شادی شدہ بھائی تھے اور اپنی اپنی زمین میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کی طرح ہرنائی کے حصے میں بھی دس بارہ ایکڑ زمین آئی تھی۔ وہ چاہتا تو اس گاؤں میں رہ کر روزی پیدا کر سکتا تھا لیکن تھوڑا سا پڑھ لکھ کر وہ خود کو بابو سمجھنے لگا تھا۔ کھیتی باڑی میں اُس کا کبھی بھی دل نہیں لگا اور دو سال پہلے جب اُس کی والدہ بھی فوت ہو گئی تو وہ بالکل دلبرداشتہ ہو گیا اور زمین فروخت

کر کے گاؤں سے چلا گیا۔ اُس وقت سے اُس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اور ہے بھی یا نہیں۔ بھائی اپنی اپنی دُنیا میں مگن تھے۔ کبھی کبھار بہن گاؤں آتی تھی تو بھائی کی یاد میں چار آنسو بہا لیتی تھی۔

میں نے گاؤں میں مختلف افراد سے ٹوہ لی تو میرا یہ اندازہ سو فیصد صحیح ثابت ہوا کہ مقتول ہرنائی اور نوشابہ کے ''عشق'' کا آغاز کپورتھلہ سے ہی ہو گیا تھا، اور یہ آغاز اُس وقت ہوا تھا جب نوشابہ ابھی نوشابہ شوکت نہیں بنی تھی۔ ہرنائی اور نوشابہ کے گاؤں ساتھ ساتھ تھے دونوں گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے۔ اسی آنے جانے میں کہیں نوشابہ اور ہرنائی کی آنکھ لڑ گئی تھی۔ نوشابہ گھریلو لڑکی تھی اور سعید عرف ہرنائی بھی ایسا تیز طرار نہیں تھا لہٰذا سال دو سال اس عشق کی آگ اتنی دھیمی رہی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ جونہی یہ آگ ذرا سا بھڑکی اور گاؤں کے باخبر لوگوں نے کان کھڑے کیے نوشابہ کے والدین نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لڑکی کو آناً فاناً ڈولی میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ گاؤں کے جن لوگوں کو اس معاملے کی خبر تھی اُن کا یہی خیال تھا کہ لڑکی کی شادی کے ایک دو ماہ بعد ہی ہرنائی اُسے بھول گیا تھا اور روزمرہ کے کاموں میں لگ گیا تھا۔ ہرنائی کے بڑے بھائی مختار نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔

کہنے لگا۔ ''تھانیدار جی! ہم تو نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی ایسی خاص بات ہے جس کی ٹوہ لگائی جائے۔ گستاخی معاف، یہ تو باسی کڑی کو اُبالا دینے والی بات ہے۔ میں مانتا ہوں کہ سعید ایک موقع پر لڑکی کے چکر میں پڑا تھا لیکن بات بڑھنے سے پہلے ہی لڑکی کی شادی ہو گئی۔ جوانی کا اُبال تھا، جتنی جلدی آیا تھا اتنی ہی جلدی بیٹھ گیا۔ دو تین ہفتے گم صم رہنے کے بعد سعید ٹھیک ہو گیا تھا۔''

میں نے ہرنائی کے بڑے بھائی مختار سے پوچھا۔ ''کبھی تم نے یہ نہیں سوچا کہ سعید کہاں گیا ہے اور یہ کہ کہیں اُس کی گمشدگی کی وجہ یہی لڑکی تو نہیں۔''

مختار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں جی! میرے دماغ میں تو کبھی یہ بات نہیں آئی۔ نہ ہی ہماری آپا نے کبھی اس طرح سوچا حالانکہ...... حالانکہ وہ تو سعید کے بارے میں بہت فکرمند رہتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے تمہاری لاپرواہی اور بے حسی پر افسوس ہو رہا ہے۔''

وہ دیہاتی لہجے میں بولا۔ ''بات تو افسوس کی ہے جی...... لیکن سعید اب کہاں ہے؟''

میں نے کہا ''جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا...... وہ قتل ہو چکا ہے۔ اور اُسی چکر میں

ہوا ہے جس کو تم معمولی سمجھتے رہے ہو اور بھول چکے ہو...... میں اسی لڑکی نوشابہ کی بات کر رہا ہوں۔''

مختار کا منہ شدید حیرت سے کھلا رہ گیا۔

☆======☆======☆

اب بات بے حد واضح ہو چکی تھی۔ سعید عرف ہرنائی اور نوشابہ آپس میں محبت کرتے تھے۔ یہ محبت خاموش ہونے کے باوجود بے حد شدید اور گہری تھی۔ نوشابہ کی شادی ہو گئی تو ہرنائی کے دل پر ایک ایسا تیر لگا جس کے زخم سے ہر وقت خون رستا رہتا تھا۔ وہ مسلسل ایک نیلی آگ میں جل رہا تھا۔ یہی آگ تھی جو اُس سے شاعری کرواتی اور گیت لکھواتی تھی۔ وہ نوشابہ کے گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرتا۔ کھیتوں میں گھومتا اور کنوؤں پر جاتا، ہر جگہ اُسے نوشابہ کی آواز گونجتی محسوس ہوتی اور اُس کی بے کلی عروج پر پہنچ جاتی...... آخر ایک دن سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ''تقدیر'' کو ''تدبیر'' سے بدلنے کی کوشش کرے گا۔ اُس نے گاؤں میں اپنے حصے کی زمین اونے پونے بیچی اور نقد رقم کے ساتھ خاموشی سے امرتسر کا رخ کیا۔

نوشابہ کے سسرال کا اتہ پتہ معلوم کرنے میں اُسے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ جان گیا کہ اُس کے دل کو عمروں کا روگ لگانے والی، اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ اندرونِ شہر کے ایک مکان میں رہتی ہے۔ اُسے نوشابہ کے شوہر کا کاروبار بھی معلوم ہو گیا۔ اُس نے نوشابہ تک پہنچنے کے لیے اُس کے شوہر شوکت سے تعلقات استوار کیے۔ نقد رقم اس کے پاس تھی۔ اُس نے شوکت کلاتھ مرچنٹ کے عین سامنے ایک دکان پگڑی پر حاصل کی اور وہاں جنرل سٹور کھول لیا۔ یہی جنرل سٹور اُس کا کاروبار اور گھر ٹھہرا۔ اُس نے اپنے ماضی اور گھر والوں سے رشتہ بالکل توڑ لیا اور نئے ماحول میں ایک نئی زندگی شروع کر دی۔ جلد ہی شوکت علی کے ساتھ اُس کا دوستانہ ہو گیا اور شوکت کبھی کبھار اُسے اپنے گھر بھی لے جانے لگا۔ ہرنائی کو اپنے شوہر کے ساتھ دیکھ کر نوشابہ کے طوطے اُڑ گئے۔ ماضی میں اُس نے یقیناً ہرنائی سے محبت کی تھی اور اس کی دُلہن بننے کے خواب دیکھے تھے، لیکن اب وہ شوکت کی بیوی اور اس کے بچے کی ماں تھی۔ اپنے گھر میں وہ خوش تھی اور خوش رہنا چاہتی تھی۔ اُسے ہرنائی کی یہ خطرناک مداخلت بالکل پسند نہیں آئی۔ اُس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے شوہر سے

کہنا شروع کیا کہ اُسے ہرنائی (یعنی سعید) کا اپنے گھر میں آنا جانا پسند نہیں۔ شوکت نے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا اور ہرنائی سے دوستانہ برقرار رکھا۔

ایک روز موقعہ دیکھ کر نوشابہ نے ہرنائی سے بھی بات کی اور اُسے پرانی محبت کا واسطہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ اُس کی زندگی سے نکل جائے اور جو کچھ ہوا اُسے ایک کہانی سمجھ کر بھول جائے۔ ہرنائی نے جواب میں کہا کہ یہ اُس کے بس میں نہیں ہے۔ ہاں وہ یہ وعدہ اُس سے کرتا ہے کہ کبھی اس سے پرانے تعلق کی بات نہیں کرے گا، اور نہ ہی کبھی پرانے تعلق کا واسطہ دے کر اُس سے کوئی مطالبہ کرے گا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے رینگتے رہے۔ دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ شوکت اور ہرنائی کی دوستی بھی پروان چڑھتی رہی۔ شوکت کا بیٹا ہرنائی کو چاچا کہتا تھا۔ ہرنائی بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ کھلونے، مٹھائیاں، کپڑے وہ جب بھی شوکت کے گھر آتا اس کے پاس بچے کے لیے تحائف ہوتے۔ وہ نوشابہ کے لیے بھی کبھی کبھی کوئی چیز لے آتا جسے نوشابہ شوہر کی خوشی کے لیے نیم رضامندی سے رکھ لیتی۔ شوکت کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس دوستانے کے پیچھے کون سا جذبہ ہے۔ شاید ہرنائی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کے دل کی گہرائیوں میں کیا چھپا ہوا ہے۔ بظاہر وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ اپنی محبوبہ کے قریب رہے اور وقتاً فوقتاً اُس کا دیدار کرتا رہے، لیکن خیالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ چیز کی طرف بڑھنا چاہتا ہے۔ قریب سے قریب تر ہونا چاہتا ہے۔ جس محبت کو نوجوان ''پاک محبت'' کہتے ہیں وہ دھیرے دھیرے ''جسمانی محبت'' میں بدل جاتی ہے۔ ہرنائی اور نوشابہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اُن دونوں کا خیال تھا کہ وہ اپنا درمیانی فاصلہ برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں گے اور یونہی ایک دوسرے کو دُور دُور سے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہیں گے لیکن پھر دھیرے دھیرے اُن کے اندر پرانی محبت کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ روز کے میل ملاقات نے جذبات کا بہاؤ اتنا تیز کر دیا کہ نوشابہ جیسی شریف اور عاقل و بالغ لڑکی کے پاؤں بھی اکھڑنے لگے۔ شاید وہ جذبات کے اس تند و تیز ریلے میں بھی سنبھل جاتی لیکن انہی دنوں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ نوشابہ کی مزاحمت یکسر دم توڑ گئی...... شوکت نے ڈلہوزی کی سیر کا پروگرام بنایا اور ہرنائی کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ ڈلہوزی کی رومان پرور فضاؤں میں وہ آزادانہ گھومتے پھرتے رہے۔ وہ تینوں آپس میں بے حد بے تکلف ہو چکے تھے۔ شعر و شاعری، فلموں اور عشق و محبت کے بارے میں بے جھجک

باتیں کرتے تھے۔ ایک موقعے پر شوکت نے نوشابہ سے کہا کہ وہ ہرنائی کے لیے کوئی اچھی سی دُلہن تلاش کرے۔ نوشابہ نے ہرنائی سے پوچھا۔ ''فرمایئے جناب! کس طرح کی دُلہن چاہیے آپ کو؟''

ہرنائی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''بالکل تمہارے جیسی۔''

نوشابہ کے چہرے پر سرخی لہرا گئی اور شوکت قہقہہ لگا کر بولا۔ ''اس جیسی تو کمپنی نے ایک ہی بنائی ہے۔ ہاں اس سے ملتی جلتی کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔''

ڈلہوزی میں قیام کے دوران ہی شوکت کو ایک نہایت ضروری کام پڑ گیا اور اُسے ایک روز کے لیے امرتسر آنا پڑ گیا۔ قریباً 36 گھنٹے تک نوشابہ اور ہرنائی ڈلہوزی میں تنہا رہے۔ یہ تنہائی رنگ لائی۔ برسوں سے دل میں دبی ہوئی خواہشات اچانک اُبھر کر سامنے آ گئیں اور اس طرح سامنے آئیں کہ ہوش و حواس جواب دے گئے۔ رات کی سیاہ تاریکی میں ہرنائی اور نوشابہ نے بے اختیار ہو کر ایک ایسے راستے پر قدم رکھ دیا جو سیدھا ذلت و رسوائی کے گڑھے کی طرف جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ پہلا گناہ ہی مشکل ہوتا ہے، اس کے بعد راستے آسان ہو جاتے ہیں۔ ہرنائی اور نوشابہ پر بھی گناہ کے راستے آسان ہو گئے۔ ڈلہوزی میں پیش آنے والے واقعے کے بعد وہ کئی بار اندھے جذبات کی دلدل میں گرے۔ شوکت کا کپڑے کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ اُسے کپڑا خریدنے کے لیے اکثر لاہور اور لائل پور جانا پڑتا تھا۔ ایسے میں وہ ہیجڑے نرگس کو گھر چھوڑ جاتا تھا لیکن ''گھر والی'' کو ہیجڑے کی نہیں مرد کی ضرورت تھی۔ اور مرد بھی وہ جو اُس کی پہلی محبت تھا اور جس کے ساتھ وہ گناہ کی ''خوبصورت دلدل'' میں گر چکی تھی۔ اُس نے بہانے بہانے ہیجڑے نرگس سے پیچھا چھڑا لیا اور وہ اکثر رات کو اپنے گھر جا کر سونے لگا۔ اب میدان صاف تھا۔ ہرنائی کو شوکت کی مصروفیات کی پوری خبر رہتی تھی۔ جب مہینے ڈیڑھ مہینے بعد اُسے پتہ چلتا کہ شوکت امرتسر سے باہر جا رہا ہے تو وہ چوکس ہو جاتا۔ شوکت کی غیر موجودگی میں وہ اُس کے گھر پہنچتا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے نکل آتا۔

ایسی باتیں وقتی طور پر تو چھپ سکتی ہیں لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں۔ جیسے پانی اپنا راستہ خود بناتا ہے، بدنامی بھی کسی نہ کسی طور گناہ گار تک جا پہنچتی ہے۔ نوشابہ اور ہرنائی کا معاملہ یوں تو پوشیدہ تھا مگر قریبی لوگوں کو اُس کی بھنک پڑنے لگی تھی۔ ان میں ہیجڑا نرگس اور شوکت کا ایک دوست بھی شامل تھا۔ آخر یہ بات شوکت کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ اُسے

زبردست ''شاک'' لگا۔ کئی روز تک وہ یقین نہیں کرسکا کہ اُس کا بھائیوں جیسا دوست ایسی پستی میں گر سکتا ہے۔ مگر جب اُس نے تحقیق کی تو حقیقت بھیانک صورت میں سامنے آ گئی۔ اُسے معلوم ہوگیا کہ ہرنائی اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے گھر آتا ہے اور دیر تک وہاں رہتا ہے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اُسے اس بات پر پھر بھی یقین نہیں آیا کہ وہ اور اُس کی بیوی تمام حدیں پار کر چکے ہیں اور اب اُن میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہ گیا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ نوشابہ کی ہنسی مذاق کی عادت نے ہرنائی کو غلط فہمی میں ڈالا ہے اور اُس کے سر پر نوشابہ کے عشق کا بھوت سوار ہوگیا ہے (اُس کا خیال تھا کہ نوشابہ اور ہرنائی میں کسی قسم کا جسمانی تعلق قائم نہیں ہوا اور نوشابہ اس قابل ہے کہ اُسے معاف کیا جاسکے اور اُسے ازدواجی زندگی بچانے کا ایک اور موقعہ دیا جائے) اُس نے سوچا کہ بات کو جتنا اچھالا جائے گا اپنی ہی بدنامی ہوگی۔ دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس نے بڑے حوصلے اور تحمل کے ساتھ ہرنائی سے بات کی اور لعنت ملامت کرنے کے بعد اُسے کہا کہ اب اُس کے لیے بہتر یہی ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر چلا جائے اور آئندہ کبھی انہیں اپنی صورت نہ دکھائے۔ اس سلسلے میں محمد صدیق کے ہوٹل میں بھی اُن کے درمیان گفتگو ہوئی تھی جس کا کچھ حصہ محمد صدیق نے سنا تھا۔

یہاں تک تو حالات معلوم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اگر ہرنائی کو نوشابہ کے بھائی عقیل نے قتل کیا ہے تو اُن دونوں کی ملاقات کہاں ہوئی اور قتل کے بعد ہرنائی کی لاش بھوانی بلڈنگ کے ملبے میں کیسے پہنچی؟ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور دیگر شہادتوں سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ لاش قریبی مکان کی چھت سے بلڈنگ کے ملبے پر گرائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قتل شوکت کے گھر ہی میں ہوا ہے۔ شوکت اُس رات اپنے گھر میں نہیں تھا۔ وہ بیوی بچے کے ساتھ سسرال گیا ہوا تھا اور گھر میں تالا لگا تھا۔ ہیجڑا نرگس بھی اپنے گھر جا کر سو گیا تھا۔ پھر گھر کا تالا کس نے کھولا اور کیوں کھولا۔ تالا کھلنے کے بعد مکان میں کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ میرے تجزیئے کے مطابق اس راز سے صرف دو افراد پردہ اٹھا سکتے تھے۔ ایک ہرنائی اور دوسرا عقیل۔ ہرنائی قتل ہو چکا تھا اور عقیل اپنی زبان کھولنے پر تیار نہیں تھا۔ بہت سخت جان اور ارادے کا پکا شخص تھا وہ۔ ابھی تک اس نے اپنا جرم ہی قبول نہیں کیا تھا، طریقہ جرم وہ کیسے بتاتا۔

نوشابہ اب ہوش میں آ چکی تھی تاہم ابھی تک ہسپتال میں تھی۔ نوشابہ کے بارے میں شوکت علی کی تمام خوش فہمیاں دور ہو چکی تھیں۔ یہ خوش فہمیاں اُس خط کی وجہ سے دور ہوئی

تھیں جو نوشابہ نے خواب آور گولیاں کھانے سے قبل شوکت کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں اُس نے اپنے سبھی گناہوں کا اعتراف کیا تھا اور اپنے بچے کو ''بدنصیب ماں کا بدنصیب بچہ'' قرار دیتے ہوئے شوکت سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے اچھی تعلیم و تربیت دے۔ یہ خط ملنے کے بعد شوکت نے نوشابہ سے ہر تعلق توڑ لیا تھا اور ایک بار بھی اُسے ہسپتال میں دیکھنے نہیں گیا تھا۔

ایک روز بیٹھے بٹھائے میرا دھیان اُن اشیاء کی طرف چلا گیا جو مقتول ہرنائی کی جیب سے برآمد ہوئی تھیں جیسا کہ میں نے بتایا ہے ان اشیاء میں نقدی اور کاغذات کے علاوہ سینما کا وہ ٹکٹ بھی تھا جو اس کیس کے آغاز کا سبب بنا۔ اس کے علاوہ چابیوں کا ایک چھوٹا گچھا بھی تھا۔ ان میں سے ایک چابی دُکان کی تھی ایک کاؤنٹر کے دراز کی، ایک موٹر سائیکل کی۔ ایک چابی ایسی بھی تھی جس کا ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا۔ میرے ذہن میں آیا، کہیں یہ چابی شوکت کے گھر کی نہ ہو۔ شوکت کے گھر کا بیرونی دروازہ لوہے کا تھا اور اُس میں ہاضمی تالا لگا ہوا تھا۔ یہ چابی بھی ہاضمی تالے کی تھی۔ میں نے یہ چابی نکال کر اپنے اے ایس آئی کو دی اور اُسے کہا کہ وہ دیکھ کر آئے، یہ چابی شوکت کے گھر کی تو نہیں۔

اے ایس آئی کی واپسی آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ یہ چابی شوکت کے مکان کے بیرونی دروازے کو لگتی ہے۔ میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ میری ''ہمت افزائی'' ہوئی تو میں نے ملزم عقیل پر مزید دباؤ ڈالا۔ ویسے بھی اُس کا دوسرا ریمانڈ ختم ہونے میں اب صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ ہم اُسے مرغن کھانا کھلا رہے تھے اور تین راتوں سے مسلسل جگا رہے تھے۔ آخر چوتھی شب اُس کی ہمت جواب دے گئی اور مسلسل پوچھ گچھ سے جان چھڑانے کے لیے اُس نے اپنی زبان کھول دی۔

اُس رات عقیل نے جو کچھ بتایا اُس سے کیس کی آخری گرہ بھی کھل گئی اور سب کچھ واضح ہوگیا۔ وہ معلومات مختصر الفاظ میں کچھ اس طرح ہیں کہ ہرنائی کا قتل عقیل کے ہاتھوں ہی ہوا تھا اور اُسی آہنی پائپ سے ہوا تھا جو مکان کے صحن میں پڑا ملا تھا۔

......دراصل شوکت کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی کے بعد ہرنائی بہت پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا پول کھل گیا ہے اور اب اُسے نہ صرف یہ شہر چھوڑنا پڑے گا بلکہ اپنی محبوبہ سے بھی ہمیشہ کے لیے جدا ہونا ہوگا۔ اُس نے امرتسر چھوڑنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور جنرل سٹور کو فروخت کرنے کے لیے اخبار میں اشتہار بھی دے دیا تھا۔ محبوبہ سے جدائی کے غم نے اُسے شراب پینے پر مجبور کیا اور ایک رات وہ نشے میں دُھت ہو کر محبوبہ اور اُس

کے شوہر کو آخری سلام کرنے کے لیے اُن کے گھر جا پہنچا۔ یہ اتوار اور سوموار کی درمیانی رات کا واقعہ ہے۔ شوکت اور نوشابہ گھر میں نہیں تھے۔ بیرونی دروازے میں تالا لگا ہوا تھا۔ یہ ہاضمی تالا تھا (یعنی دروازے کے اندر تھا) اسے اندر اور باہر دونوں طرف سے کھولا جا سکتا تھا۔ ہرنائی نے وقت بے وقت آنے کے لیے اس کی چابی بنوا رکھی تھی۔ جب شوکت شہر سے باہر ہوتا تھا، ہرنائی یہی چابی لگا کر دروازہ کھولتا تھا اور اپنی محبوبہ کے بستر کو آباد کرتا تھا۔ اُس رات بھی اس نے چابی لگائی اور مکان میں چلا گیا۔ مکان خالی تھا۔ وہ نشے میں دُھت خوابگاہ میں پہنچا اور نوشابہ کی ایک فریم شدہ تصویر سینے پر رکھ کر لیٹ گیا۔

دوسری طرف اُس کی موت بھی عقیل کے رُوپ میں وہاں آ پہنچی۔ عقیل نے اتوار کا سارا دن بھوانی بلڈنگ کا ملبہ صاف کرتے اور زخمیوں کو نکالتے گزارا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی بہن کا گھر قریب ہی ہے۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے سوچا کہ بہن و بہنوئی سے مل لے۔ جس وقت وہ بہن کے گھر پہنچا اُس نے فائر بریگیڈ کی وردی ہی پہن رکھی تھی۔ بہن و بہنوئی تو اُسے گھر میں نہیں ملے لیکن بہن کا ''چاہنے والا'' ضرور مل گیا۔ سعید کو دیکھ کر اور پہچان کر عقیل ششدر رہ گیا۔ اُس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ دو برس پہلے گاؤں سے غائب ہو جانے والا سعید اُسے اس حال میں ملے گا۔ وہ اُس کی بہن کے گھر میں اُس کی تصویر سینے پر رکھے لیٹا تھا اور اول فول بک رہا تھا۔ یہی شخص تھا جس کی وجہ سے تین سال پہلے وہ لوگ بدنامی کا شکار ہوئے تھے اور انہیں افراتفری میں نوشابہ کے ہاتھ پیلے کرنے پڑے تھے۔ سعید عرف ہرنائی کو دیکھ کر عقیل کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ عقیل نے اُسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور پوچھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ جواب میں ہرنائی نے نشے کی حالت میں اُلٹی سیدھی بکواس کی۔ اپنی بہن کے بارے میں بے ہودہ باتیں سن کر عقیل کا دماغ گھوم گیا۔ وہ وحشیوں کی طرح ہرنائی پر پل پڑا۔ جواب میں اُس نے بھی ہاتھ پاؤں چلائے۔ عقیل نے برآمدے میں پڑا ہوا آہنی پائپ کا وہ وزنی ٹکڑا اٹھایا اور اُس سے چند شدید ضربیں ہرنائی کے سر پر لگائیں۔ اِن میں سے دو ضربیں جان لیوا ثابت ہوئیں اور ہرنائی چکرا کر کمرے کے وسط میں گر گیا۔

بظاہر وہ بے ہوش ہوا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد جب عقیل کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور اُس نے ہرنائی کی نبض ٹٹولی تو یہ جان کر اُسے شدید دھچکا لگا کہ وہ دم توڑ چکا ہے۔ عقیل نے فوراً مکان کے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے سارے بدن سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹے۔

اُسے خیال آیا کہ بھوانی بلڈنگ یہاں سے زیادہ دُور نہیں۔ وہ مکان کی چھت پر چلا گیا۔ چھت سے اُسے بھوانی بلڈنگ کا ملبہ بالکل سامنے نظر آیا۔ اُس کے ذہن میں ایک انوکھی بات آئی اور وہ فوراً چھت سے اُتر آیا...... پندرہ بیس منٹ بعد وہ سعید عرف ہرنائی کی لاش کندھے پر اٹھائے ایک چھت سے دوسری چھت پر جا رہا تھا۔ گہری تاریکی اور بارش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ہرنائی کی لاش چھت سے ملبے پر گرائی اور واپس آ گیا۔

گھر میں آ کر اُس نے دو گھنٹے تک سخت محنت کی اور واردات کا ہر ثبوت مٹا ڈالا۔ تاہم دو ثبوت کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہے۔ ایک تو فرش پر خون کے مدھم دھبے اور دوسرے لکڑی کی چوکھٹ پر آہنی پائپ کی ضرب۔

رات قریباً بارہ بجے عقیل واپس اپنے دفتر جا پہنچا اور آرام کے کمرے میں سو گیا۔ صبح منہ اندھیرے وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ بھوانی بلڈنگ پہنچ گیا۔ ملبے میں پہنچتے ہی اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہرنائی کی لاش کو مناسب طریقے سے چھپایا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ امدادی کارروائیوں میں لگ گیا۔

اُس نے ایک زبردست چال چلی تھی۔ شاید اُس کا جرم کبھی ظاہر نہ ہوتا۔ اگر سینما کا ٹکٹ مقتول کی جیب میں نہ رہ جاتا...... حیرت کی بات یہ ہے کہ شوکت علی کی طرح عقیل نے بھی شروع میں نوشابہ کو بے قصور جانا۔ ہرنائی کو قتل کرنے کے بعد اُس نے یہی سمجھا کہ وہ اپنی نیک اور پاک دامن بہن کو ایک شیطان کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب رہا ہے۔ اُس کے ذہن میں نہیں آیا کہ بہن بھی اس گناہ میں برابر کی شریک ہے۔ قتل کے آٹھ دس روز بعد تک تو اُس نے قتل کا راز سینے میں دبائے رکھا لیکن پھر بہن کو بتا دیا کہ اُس نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ بعد میں جب نوشابہ کا شوہر قتل کیس میں بری طرح پھنس گیا تو نوشابہ کے ذہن میں زبردست کشمکش شروع ہو گئی۔ وہ جیسی بھی تھی لیکن اپنے بچے اور شوہر سے بہت پیار کرتی تھی۔ اُس کا عاشق تو راہی عدم ہو ہی چکا تھا۔ اب شوہر اور بھائی بھی موت کے دہانے پر تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خاموش رہ کر بھائی کو بچائے یا سچ بول کر شوہر کو۔ وہ کئی روز اسی عذاب میں مبتلا رہی۔ آخر اپنی زندگی ختم کرنے کے لیے اُس نے بھاری مقدار میں خواب آور گولیاں کھالیں۔

میں نے اس کیس پر شروع سے آخر تک بے حد غور کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس واقعے میں گناہ گار کوئی بھی نہیں۔ تمام کردار اپنے اپنے حالات سے مجبور تھے اور تقدیر کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ سعید عرف ہرنائی نے نوشابہ سے پیار کیا تھا۔ وہ اُس کی پہلی

محبت تھی اور شاید آخری بھی۔ وقت نے نوشابہ کو اُس سے چھین لیا۔ اُس نے خود پر بہت ضبط کیا لیکن پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نوشابہ کے پیچھے امرتسر جا پہنچا۔ نوشابہ کے ساتھ بھی اسی طرح کے حالات پیش آئے۔ پھر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا عاشق اُس کے پیچھے پیچھے امرتسر آ دھمکا ہے...... تو اُس نے خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن پھر عاشق اُس کے خاوند کا دوست بن گیا اور حالات ایسے ہوئے کہ وہ بھی اندھے جذبات کے دھارے میں بہہ گئی۔ جس جسم پر صرف اُس کے شوہر کا حق تھا وہ ہرنائی کی بے قراریوں کے حوالے ہو گیا۔ عقیل بھی حالات اور واقعات کا شکار تھا۔ وہ ایک جوشیلا نوجوان اور غیرت مند بھائی تھا۔ بہن کے پرانے عاشق کو بہن کی خواب گاہ میں دیکھ کر وہ حواس کھو بیٹھا اور اُس کے ہاتھوں ایک قتل ہو گیا۔ اور شوکت علی، وہ تو ویسے ہی شروع سے آخر تک مظلوم نظر آتا ہے۔ اُس نے ایک شخص کو دوست بنایا اور اُس پر اندھا اعتماد کیا۔ وہ اُسے بھائیوں کا درجہ دیتا تھا اور گھر کا فرد سمجھتا تھا، لیکن وہ دوست، نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے دغا دینے پر مجبور ہو گیا۔

نوشابہ دو تین ہفتے بعد ہسپتال سے فارغ ہو گئی لیکن وہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے دماغ پر اثر ہوا تھا اور بینائی بھی آدھی رہ گئی تھی۔ ہسپتال سے فارغ ہو کر وہ سیدھی کپورتھلہ اپنے باپ کے گھر پہنچی۔ اس کے علاوہ اور کون سا ٹھکانہ تھا اُس کے پاس؟ تین روز پہلے اُسے شوکت کی طرف سے طلاق نامہ مل چکا تھا۔ بچہ بھی شوکت نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

عقیل کے ہاتھوں ہرنائی کا قتل دفعہ 302 کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ یہ قتلِ عمد نہیں تھا کیونکہ اس میں فوری غصے کا عمل دخل تھا۔ میں نے عقیل کے خلاف بلا ارادہ قتل کی دفعات کے تحت چالان مکمل کیا اور کوشش کی کہ وہ سخت سزا سے بچ جائے۔ طویل عدالتی کارروائی کے بعد عقیل کو دس برس قید کی سزا سنائی گئی اور یوں وہ کہانی انجام کو پہنچی جس میں میرے خیال کے مطابق کوئی وِلن نہیں تھا۔ جتنے کردار تھے مجبور تھے یا مظلوم۔

☆======☆======☆

ایک فٹ لمبی گردن

ہوشیار پور سے پندرہ بیس میل دُور شاہ کوٹ نامی ایک قصبہ ہے۔ اُن دنوں اُس کی آبادی دو ڈھائی ہزار کے لگ بھگ تھی۔ قصبے کے نواح میں ایک بہت کھلا میدان تھا جہاں ایک ٹوٹی پھوٹی بارہ دری، ایک خستہ حال تالاب، چند بُرجیاں اور بہت سا جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ لوگ رات کے وقت عموماً اس طرف جانے سے کتراتے تھے کیونکہ وہ ''پکی جگہ'' تھی اور سادہ لوح دیہاتیوں کے نزدیک پکی جگہیں اکثر بھوتوں چڑیلوں کا مسکن ہوتی ہیں۔

سردیوں کے دن تھے۔ تھانے میں کہیں دھوپ نہیں آتی تھی۔ صبح سویرے عملے کے کئی افراد دھوپ سینکنے کے لیے چھت پر چڑھ جاتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی وہاں جا بیٹھتا تھا۔ تھانے کی چھت کمزور تھی اس لیے بلال شاہ کا خوب مذاق بنتا تھا۔ وہ چھت پر آ جاتا تو سب خیر خیریت کی دُعائیں مانگنے لگتے۔ اے ایس آئی فرزند علی کا خیال تھا کہ بلال شاہ یہ چھت گرا کر ہی دم لے گا۔ اُس روز بھی بلال شاہ کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو ایک سپاہی فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ ''بس جی میں تو چلا۔ میرے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

سپاہی دبلا پتلا تھا۔ بلال شاہ نے فوراً چوٹ کی ''تم زندہ ہی کب ہو جو مرو گے۔''

سپاہی کھسیانا ہو گیا۔ اے ایس آئی فرزند نے اُس کی حمایت میں بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر اُسے چپ ہونا پڑا۔ دو تین افراد تیز قدموں سے تھانے میں داخل ہوئے تھے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر شخص عطا محمد کو میں جانتا تھا۔ قصبے میں اُس نے آٹا پیسنے کی چکی لگا رکھی تھی۔ آٹے کی طرح وہ خود بھی سفید سفید اور اُجلا اُجلا سا تھا۔ اُس کے ساتھیوں میں ایک گاؤں کا حکیم اور دوسرا مقامی سکول کا ماسٹر تھا۔ یقیناً وہ اپنی کوئی بپتا لے کر ہمارے پاس آئے تھے۔ میں نے اُن تینوں کو اُوپر بلا لیا۔ عطا محمد کا چہرہ غصے اور پریشانی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ''تھانیدار صاحب! اُس خبیث نے میری بیٹی کا ستیاناس کر دیا ہے۔ جان کے لالے پڑ گئے ہیں بیچاری کو، پتہ نہیں بچتی بھی ہے کہ نہیں۔ آپ اسے ہتھکڑی لگائیں جی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کس کی بات کر رہے ہو؟''

عطا محمد نے جو جواب دیا اُس سے میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا کہ شاید لڑکی سے زیادتی وغیرہ کی گئی ہے۔ عطا محمد نے کہا۔ ''میں فقیرے کی بات کر رہا ہوں جی اُس بدبخت نے میری جمیلہ کو پتہ نہیں کون سی بوٹی دے دی ہے۔ اُسے دورے پر دورہ پڑ رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں مڑ جاتے ہیں اور منہ سے جھاگ نکلنے لگتی ہے۔ حکیم جی نہ ہوتے تو وہ رات کو ہی دم توڑ گئی ہوتی۔''

عطا محمد بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے قصبے کے حکیم خدا بخش سے پوچھا۔ ''یہ کیا معاملہ ہے حکیم جی؟''

خدا بخش بولا۔ ''جمیلہ، عطا محمد کی بیٹی کا نام ہے۔ اٹھارہ بیس سال عمر ہے اُس کی۔ کل شام وہ دو لڑکیوں کے ساتھ کنوئیں سے پانی بھرنے گئی۔ پاس ہی مکئی اور کماد کے کھیت ہیں۔ لڑکیوں نے گھڑے بھرے اور کچھ دیر ستانے کے لیے کھیتوں کے کنارے بیٹھ گئیں۔ جمیلہ کمر سیدھی کرنے کے لیے گھاس پر لیٹ گئی۔ وہیں اُسے پیٹ پر کسی کیڑے نے کاٹ کھایا۔ وہ کہتی ہے بچھو تھا۔ مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ بچھو کا ڈنک میں نے کئی دفعہ دیکھا ہوا ہے۔ بہر حال گھر آ کر لڑکی درد سے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ عطا محمد نے فقیرے کو بلا بھیجا۔ اُس خبیث نے پتہ نہیں کیا کھلایا ہے کہ آدھی رات سے لڑکی کی حالت ہی نہیں سنبھل رہی۔ میں نے پیٹ صاف کرنے کی دوائیاں دی ہیں۔ اگر ایک دو گھنٹے تک افاقہ نہ ہوا تو پھر مریضہ کو ہوشیار پور لے جانا پڑے گا۔''

حکیم خدا بخش سند یافتہ حکیم تھا۔ ہاتھ میں شفا بھی تھی۔ ارد گرد کے علاقے میں اُس کی عزت کی جاتی تھی۔ وہ جو کچھ مریضہ کے بارے میں کہہ رہا تھا اُس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جہاں تک فقیرے کا تعلق تھا میں اُس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک چوبیس پچیس سال کا نیم پاگل سا شخص تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی بال اُلجھے ہوئے، کندھوں پر ہر وقت ایک میلا سا کھیس رہتا تھا۔ وہ اکثر قصبے کے نواحی میدان میں گھومتا نظر آتا جیسے کوئی چیز تلاش کر رہا ہو۔ اُس کے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ وہ جڑی بوٹیاں ڈھونڈتا ہے اور کئی بیماریوں کا تسلی بخش علاج کر سکتا ہے۔ دو ڈھائی ماہ پہلے ایک کسان کی بچی کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ فقیرے نے زخم چوس کر زہر نکال دیا تھا۔ اُس دن سے لوگ اس بات پر یقین کرنے لگے تھے کہ فقیرا سانپ بچھو کا زہر نکال سکتا ہے۔ فقیرے کے بارے میں لوگوں کو صرف اتنا ہی پتہ تھا کہ وہ ہوشیار پور کی ایک نواحی آبادی ''کٹڑی رام سنگھ'' کا رہنے والا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اُس کا باپ مر گیا۔ پھر بیوی اُس سے جھگڑ کر میکے چلی گئی۔ کام کاج سے

اُس کا دل اچاٹ ہوگیا۔ اُس نے آوارہ گردی اختیار کرلی اور فقیر محمد جٹ سے فقیرا بن کر گاؤں گاؤں کی خاک چھاننے لگا۔ اب وہ پچھلے چار پانچ مہینے سے شاہ کوٹ میں نظر آرہا تھا۔ میں نے اُسے کئی بار بارہ دری کے اردگرد گھومتے یا ویران تالاب کے کنارے خاموش بیٹھے دیکھا تھا۔

میں نے عطا محمد سے پوچھا کہ اس وقت فقیرا کہاں ہے؟ وہ بولا۔ ''شمشان گھاٹ کے پاس ملوکا سنگھ کا ڈیرہ ہے۔ وہ رات کو وہیں سوتا تھا۔ صبح سویرے ہم نے پتہ کیا ہے۔ وہ وہاں سے غائب ہے۔ میرا تو خیال ہے ڈر کر بھاگ گیا ہے اور قصبے کے آس پاس ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔ تھانیدار صاحب! میری بیٹی کے ساتھ تو جو کچھ ہونا تھا ہوگیا ہے۔ اللہ کی مہربانی اور حکیم جی کی کوششوں سے اُس کا سخت وقت ٹل گیا ہے اور آگے بھی انشاءاللہ اچھا ہی ہوگا۔ مگر میرے دل پر جو چوٹ لگی ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ وہ دھوکے باز پتہ نہیں کس کس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ چند ٹکوں کی خاطر لوگوں کی جانوں سے کھیلتا ہے وہ...... ایسے شخص کو تو پھانسی دے دینی چاہیے۔''

عطا محمد کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اُس کے منہ میں حکیم خدا بخش کی زبان بول رہی ہے۔ یقیناً خدا بخش ہی عطا محمد کو بھڑکا کر یہاں لایا تھا ورنہ عام طور پر دیہاتی ایسے معاملوں میں پولیس تک نہیں پہنچتے۔ خدا بخش قصبے کا واحد معالج تھا اور ظاہر ہے وہ فقیرے کو اپنا رقیب خیال کرتا ہوگا۔ اب جبکہ فقیرے سے ایک غلط کام بھی ہوگیا تھا۔ خدا بخش نے اس موقع کو ہاتھ سے گنوانا مناسب نہیں سمجھا تھا اور عطا محمد کو آگے لگا کر تھانے لے آیا تھا۔

ایک تھانیدار کو ایسے تمام ہتھکنڈوں سے واقف ہونا پڑتا ہے ورنہ لوگ اُسے چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں۔ میں نے عطا محمد کو سمجھایا کہ پہلی غلطی اُس نے خود کی ہے۔ اُسے کیا ضرورت تھی ایک نیم حکیم بلکہ نیم پاگل شخص سے بیٹی کا علاج کروانے کی۔ بہرحال وہ ایسا کر ہی چکا ہے تو اب ذرا تحمل سے کام لے۔ ہم فقیرے کو ڈھونڈتے ہیں وہ بھی ڈھونڈے فقیرے کا بیان آنے کے بعد ہی طے ہوگا کہ یہ کیس قابل دست اندازی پولیس ہے یا نہیں۔

حکیم خدا بخش اور ماسٹر نذیر نے ایک دو نکتے اٹھانے کی کوشش کی لیکن میں نے جوابی نکتے اٹھا کر اُن کا منہ بند کردیا۔ عطا محمد کو بھی تسلی تشفی دی اور اُن تینوں کو رخصت کردیا۔ بعد ازاں میں نے اے ایس آئی فرزند علی سے کہا کہ وہ ملوکا سنگھ کے ڈیرے پر جائے اور پتہ کرے کہ فقیرا واقعی غائب ہوا ہے یا کہیں اِدھر اُدھر گیا ہوا تھا۔

اے ایس آئی نے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آکر یہ بتایا کہ فقیرا واقعی غائب ہے۔ اُس نے

کہا۔ ''ملوکا سنگھ نے اپنے ڈیرے پر اُسے ایک چھوٹا سا کمرہ دے رکھا ہے۔ کمرے میں فقیرے کا پھٹا پرانا بستر پڑا ہے لیکن کپڑے جوتے اور دوسرا سامان وہاں نہیں ہے۔ لگتا ہے وہ یہ چیزیں اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے...... ملوکا سنگھ کا کہنا ہے کہ رات نو دس بجے کے قریب فقیرا بہت گھبرایا ہوا ڈیرے پر آیا تھا اور اپنے کمرے میں گھس کر اندر سے کنڈی لگالی تھی۔ رات پچھلے پہر ایک نوکر نے دیکھا تو کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور فقیرا اندر موجود نہیں تھا۔''

☆======☆======☆

لڑکی کی جان بچ گئی تھی۔ یوں یہ کیس زیادہ اہم نہیں رہا تھا۔ ممکن تھا چار چھ ہفتے میں فقیرے کا نام بھی ہمارے ذہن سے نکل جاتا لیکن پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے اس معاملے کو پھر سے دلچسپ بنا دیا۔ یہ دلچسپی پیدا کرنے کا سہرا بلال شاہ کے سر تھا۔ ایک روز صبح سویرے وہ جوش میں تمتمایا ہوا تھانے پہنچ گیا۔ اُس کی مونچھوں پر لسی کا جھاگ نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اُس نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔ کہنے لگا۔

''خان صاحب! فقیرے کا پتہ چلا لیا میں نے۔'' یہ اطلاع واقعی دھماکہ خیز تھی۔

''کہاں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''ملوکا ہی کے ڈیرے پر ہے۔ اُس نے چھپا رکھا ہے اُسے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''پتہ چلا نہیں، چلایا ہے میں نے۔ پورا پورا کُھرا ناپا ہے عطا محمد کی بیٹی کا۔''

''عطا محمد کی بیٹی؟ اس کا ذکر یہاں کیسے آگیا؟''

''اُسی کا تو ذکر ہے جی سارا۔'' بلال شاہ نے گول گول آنکھیں گھمائیں۔ ''وہ آج صبح منہ اندھیرے، خود چل کر گئی ہے فقیرے کے پاس...... ٹھہریں جی! میں آپ کو شروع اسٹارٹ سے بتاتا ہوں۔ میں نے رات کدو گوشت کھا کر اُوپر سے گرم دودھ پی لیا تھا۔ پھر میرا سسر آگیا تو اُس کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا باداموں والا گُڑ بھی کھالیا۔ تازہ تازہ گُڑ کا آپ کو پتہ ہی ہے کتنا گرم ہوتا ہے۔ صبح سویرے مجھے کھیتوں میں جانا پڑ گیا۔ میرے تو خواب خیال میں بھی نہیں تھا کہ کدو گوشت سے شروع ہونے والی بات عطا محمد کی بیٹی جمیلہ پر ختم ہو گی۔ جونہی میں مغلوں والی گلی سے نکلا ہوں۔ سامنے جمیلہ نظر آئی۔ اُس کا منہ دوسری طرف تھا۔ میں نے اُسے سرخ چادر سے پہچانا۔ پورے قصبے میں صرف اُسی کے پاس ایسی چادر ہے۔ وہ تیزی سے ملوکا سنگھ کے ڈیرے کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے شک پڑ گیا۔ دیواروں

کے سائے میں اُس کے پیچھے گیا۔ شریفے کی ہٹی کے سامنے پہنچ کر وہ رُک گئی۔ یہاں سے دو راستے نکلتے ہیں ایک ملوکا سنگھ کے ڈیرے میں چلا جاتا ہے دوسرا شمشان گھاٹ کے ساتھ ساتھ کھیتوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر جمیلہ ذرا ٹھٹکی۔ اُس نے دائیں بائیں دیکھا اور تیزی سے ڈیرے کے احاطے میں چلی گئی۔ ڈیرے کے اندر اور برانڈے میں سب سو رہے تھے۔ وہ گلی والی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی پچھواڑے میں آ گئی۔ میں نے بھی ہمت کی اور اس کے پیچھے پچھواڑے میں آ گیا۔ یہاں ایک بھُوسے والی کوٹھڑی کے سامنے پہنچ کر جمیلہ نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور کوئی لالٹین پکڑے کھڑا نظر آیا۔ میں فوراً پہچان گیا۔ وہ فقیرا تھا۔ جمیلہ فوراً اندر چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر ڈیرے سے باہر آ گیا۔ گلی کے سرے پر کھڑا ہو کر میں جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کوئی آدھ گھنٹے بعد باہر نکلی اور جس راستے آئی تھی اُسی راستے واپس گھر چلی گئی۔ میں نے وہاں سے موڑ کاٹا اور سیدھا آپ کے پاس یہاں آ گیا۔ ابھی تو ناشتہ بھی نہیں کیا ہے میں نے۔''

میں نے کہا۔''ناشتے کو گولی مارو۔ تمہاری اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ فقیرا اس وقت ملو کے ڈیرے پر ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

بلال شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اُسی وقت عملے کے تین آدمی ساتھ لیے اور ملوکا سنگھ کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

بلال شاہ کی اطلاع بالکل درست نکلی۔ ملوکا سنگھ کے ڈیرے پر پچھواڑے کی ایک کوٹھڑی سے فقیرا برآمد ہو گیا۔ لگتا تھا وہ کئی دنوں سے نہیں نہایا۔ لباس کا بھی بُرا حال تھا۔ اُس نے گرفتاری کے وقت زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ بس اتنا کہا۔''میں بے قصور ہوں مجھے کیوں پکڑتے ہو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

ہم اُسے تھانے لے آئے۔ ملوکا سنگھ کو بھی تھانے طلب کر لیا گیا۔ ملوکا پچیس چھبیس برس کا شوقین مزاج زمیندار تھا۔ قصبے کے بڑے چوہدری سے اُس کی رشتے داری بھی تھی۔ اُسے پتہ تھا کہ تھانے میں اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ وہ بڑے اطمینان سے تھانے چلا آیا اور آتے ساتھ ہی اُس نے اعتراف کر لیا کہ فقیرا اُس کے ڈیرے پر تھا۔

وہ کہنے لگا۔''سچی بات ہے تھانیدار صاحب! مجھے اس بندے سے ہمدردی ہے۔ پتہ نہیں خود کو کیا روگ لگائے بیٹھا ہے ویسے نیت کا برا نہیں۔ ہو سکتا ہے غلطی سے اس نے عطا

محمد کی بیٹی کو کوئی نقصان والی دوا دے دی ہو مگر جان بوجھ کر یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ تو کسی سے دوا کے پیسے بھی نہیں لیتا۔ کوئی زبردستی دے جائے تو اور بات ہے۔ پندرہ بیس دن پہلے جب اسے پتہ چلا کہ اس کی دوا سے جمیلہ کی حالت خراب ہو گئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ مر بھی جائے تو فقیرے کو اپنی جان کا خطرہ پڑ گیا۔ وہ آدھی رات کو خاموشی سے میرا ڈیرہ چھوڑ گیا۔ دو ہفتے تک پتہ نہیں کہاں کہاں پھرتا رہا۔ چار دن پہلے میرے ایک نوکر نذر محمد نے اسے ''وڈالا پیر'' کے عُرس میں دیکھا۔ اسے سخت بخار تھا اور نیم بے ہوشی کی حالت میں کھلے آسمان تلے پڑا تھا۔ نذر محمد عُرس سے واپس آیا تو اسے اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ میں شاہ کوٹ سے باہر گیا ہوا تھا۔ کل ہی آیا ہوں۔ سوچ رہا تھا کہ آج اسے آپ کے سامنے پیش کر دوں گا مگر آپ نے پہلے ہی پکڑ لیا۔''

ملوکا سنگھ نے اپنی جھوٹی سچی صفائی پیش کر دی تھی۔ میرے لیے سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر فقیرا صرف چار روز پہلے ڈیرے پر واپس آیا ہے اور ملوکا سنگھ کے خاص نوکروں کے سوا کسی کو اُس کی واپسی کا پتہ نہیں تو جمیلہ کو کیسے پتہ چل گیا اور وہ رات کے اندھیرے میں سیدھی اُس کے پاس کیسے پہنچ گئی۔ میں نے ملوکا سنگھ سے پوچھا۔''فقیرے اور جمیلہ میں کیا چکر ہے۔''

میرے اچانک سوال نے ملوکا سنگھ کو بوکھلا دیا۔ مجھے صاف اندازہ ہوا کہ وہ اس چکر کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ بہرحال اُس نے حیران ہونے کی اداکاری کی اور بولا۔''آپ کس چکر کی بات کر رہے ہیں، مم...... میں کچھ سمجھا نہیں۔''

میں نے کہا۔''مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارے ڈیرے پر جمیلہ اور فقیرے کی ملاقاتیں ہوتی تھیں اور وہ بند کمرے میں وقت گزارتے تھے۔''

''یہ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے جی۔'' ملوکا سنگھ نے کہا۔''فقیرا تو درویش بندہ ہے۔ اور جمیلہ بھی ایسی لڑکی نہیں ہے۔''

''مطلب ہے کہ میں بکواس کر رہا ہوں۔''

''نہیں...... نہیں جی! میرا مطلب ہے کہ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔''

چند ضروری سوال کرنے کے بعد میں نے ملوکا سنگھ کو واپس بھیج دیا اور فقیرے کو بلا لیا۔ وہ سر جھکائے میرے سامنے کرسی پر آ بیٹھا اور خاموشی سے میز کی سطح کو گھورنے لگا۔ قصبے میں وہ نیم پاگل مشہور تھا مگر مجھے اُس میں پاگلوں یا نیم پاگلوں والی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ہاں کچھ کھویا کھویا ضرور نظر آتا تھا وہ۔ میں نے اُس سے پہلا سوال یہی پوچھا کہ جمیلہ سے اُس کا

کیا رشتہ ہے میں سمجھتا تھا کہ وہ یہ سوال سن کر چونکے گا۔ مگر اُس نے اطمینان سے سوال سنا اور بولا۔ ''کوئی رشتہ نہیں ہے جی!'' اس کے ساتھ ہی اُس کا سر کچھ اور جھک گیا۔

میں نے کہا ''صرف دو گھنٹے پہلے وہ ڈیرے پر تمہارے ساتھ بند کمرے میں تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ خود آئی تھی اور زبردستی اندر گھس بیٹھی تھی......اس......اس سے پہلے بھی وہ ایسی حرکتیں کرتی رہی ہے۔''

''مثلاً اور کیا حرکت کی ہے اُس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں...... یہ بچھو والا ڈھونگ بھی تو اُسی نے رچایا تھا اور اس سے پہلے بھی پتہ نہیں کیا کچھ کرتی رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''فقیرے! پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو بات بھی ہے سیدھے سادے الفاظ میں بتاؤ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ بلکہ اگر تمہیں کسی طرح کی مدد چاہیے تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ بولو یہ کیا چکر ہے اور کتنی دیر سے چلا ہوا ہے؟''

فقیرا کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ معلوم نہیں اداکاری کر رہا تھا یا واقعی کسی اُلجھن میں تھا۔ آخر اُس نے زبان کا تالا کھولتے ہوئے کہا۔ ''یہ لڑکی تین چار ماہ سے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ تنگ کرنے کا موقع ڈھونڈتی ہے اور واہیاتی کرنے سے بھی باز نہیں آتی۔''

اس انکشاف کے بعد فقیرے نے جو تفصیل بتائی اُس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

فقیرا جس قدر دامن بچانے کی کوشش کرتا تھا جمیلہ اتنا ہی اُس کے پیچھے لگی رہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فقیرا پرانی بارہ دری اور تالاب کے آس پاس گھومتا رہتا ہے اُس نے وہاں آنے جانے کے لیے مٹی کھودنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا تھا۔ تالاب کے اردگرد کی مٹی بہت چکنی تھی اور دیواروں کو لیپنے میں استعمال ہو سکتی تھی۔ وہ ایک دو سہیلیوں کے ساتھ اکثر وہاں مٹی کھودنے پہنچ جاتی تھی۔ اُس کی کئی سہیلیوں کو یہ بات معلوم تھی کہ جمیلہ جڑی بوٹیوں والے فقیرے کے چکر میں ہے۔ تین ہفتے پہلے ''بچھو کاٹنے'' کا ڈرامہ بھی جمیلہ نے فقیرے کے لیے ہی کیا تھا۔ اُس نے کسی نوکیلی شے سے پیٹ پر زخم لگایا تھا اور بچھو کا واویلا کرنے لگی تھی۔ اُس شوخ کا مقصد یہی تھا کہ بچھو کا زہر چوسنے کے لیے فقیرے کو بلایا جائے گا اور وہ اُس کے پیٹ پر اپنے ہونٹ رکھے گا......لیکن فقیرے سے یہ بے شرمی کا کام نہ ہو سکا۔ وہ جانتا تھا کہ جمیلہ فراڈ کر رہی ہے۔ وہ صاف کنی کترا گیا۔ جب جمیلہ کے باپ نے زیادہ مجبور کیا تو اُس نے ایک کھلانے والی دوا اُسے دے دی اور جان چھڑا کر وہاں سے چلا آیا۔

میں نے فقیرے سے پوچھا۔ ''تم جانتے نہیں تھے کہ اُس دوا کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ اگر وہ مر جاتی تو؟''

وہ بولا۔ ''میں تو خود حیران ہوں وہ دوا ایسی نہیں ہے کہ اُس سے نقصان پہنچتا۔ ہو سکتا ہے اُس کی طبیعت کسی اور وجہ سے بگڑی ہو۔ میرے پہنچنے سے پہلے گھر والوں نے اپنے طور پر بھی اُس کا دوا دارو کیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کون سی دوا دی تھی تم نے اسے؟''

اُس نے کپڑے کے ایک جھولے میں سے سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی سی بوتل نکالی۔ اس میں گل قند جیسی کوئی دوائی تھی۔ میں نے یہ بوتل اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے اُس کا جھولا دیکھا۔ جھولے میں چند سوکھی ہوئی جڑی بوٹیاں اور تین چار شکستہ بوتلیں تھیں۔ میں نے یہ جھولا بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔

''تم نے کہیں سے حکمت سیکھی بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی......جی ہاں! ہوشیار پور میں ایک استاد تھا میرا۔'' فقیرے نے مختصر جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''جمیلہ آج تم سے ملنے کیوں گئی تھی؟''

''وہ من موجی لڑکی ہے جی۔'' فقیرے نے کہا۔ ''کب کیا کرے گی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میرا تو خیال تھا کہ اب وہ پیچھا چھوڑ دے گی لیکن آج صبح سویرے اُس نے پھر دروازہ آ کھٹکھٹایا۔ اندر آ کر وہ رونے لگی۔ کہنے لگی کہ میں اُسے معاف کر دوں۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت پریشانی اٹھانی پڑی ہے۔ اُس نے اقرار کیا کہ بچھو کے کاٹنے کا اُس نے صرف ڈھونگ رچایا تھا۔''

''پھر تم نے اسے کیا جواب دیا؟''

''میں نے کیا کہنا تھا جی! یہی کہا کہ میں نے اُسے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔ وہ اپنا چلن ٹھیک کر لے۔ اس میں بدنامی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔''

میں نے پوچھا ''تم نے یہ نہیں کہا کہ تم شادی شدہ ہو اور ہوشیار پور میں تمہارے بیوی بچے ہیں۔''

اس سوال پر وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ اُس کے ماضی کے بارے میں نے جب بھی کوئی سوال پوچھا وہ اسی طرح گم صم ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ فقیرا اپنے بارے میں بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ میں یہ بھی

جانتا تھا کہ اگر میں نے اُسے واپس بھیج دیا تو وہ پھر غائب ہو جائے گا۔ میں نے اُسے لاک اپ میں بند کر دیا اور بلال شاہ کو ہوشیار پور بھیجا کہ وہ وہاں سے مرکزی تھانے کے رجسٹرار ہدایت شاہ کو بلا لائے۔ ہدایت شاہ صاحب علاقے کے سب سے پرانے پولیس ملازم تھے۔ باریش آدمی تھے۔ ملازمت کے علاوہ حکمت بھی کرتے تھے اور ہوشیار پور میں اُن کا مطلب تھا جہاں وہ باقاعدگی سے بیٹھتے تھے۔

وہ بلال شاہ کے ساتھ ہی شاہ کوٹ چلے آئے۔ رات ہو چکی تھی میں نے انہیں کھانا وغیرہ کھلایا، پھر فقیرے کا جھولا اُن کے سامنے کھول دیا۔ وہ یہ جڑی بوٹیاں اور بوتلیں وغیرہ دیکھ کر حیران ہوئے۔ میں نے پوچھا۔ ''شاہ جی! یہ کیا کچھ ہے؟''

وہ بڑے غور سے دیکھتے رہے بوتلیں کھول کر دوائیوں کو چکھا، سونگھا، خشک پتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور آخر میں بولے۔ ''کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ بے کار ہے۔ صرف ایک بوٹی ہے جس کے پانی سے زخم دھوتے ہیں۔ اس بوٹی میں نہ جانے کیا کچھ ملا کر یہ گل قندسی بنادی گئی ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔''

شاہ صاحب نے اُسی دوا کی طرف اشارہ کیا تھا جو فقیرے نے جمیلہ کو کھلائی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''اگر یہ دوا کسی کو کھلائی جائے تو؟''

وہ بولے۔ ''کوئی پاگل ہی ایسا کرے گا یا پھر مریض کا دشمن ہوگا۔''

میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا اور وہ فقیرے کو حوالات میں سے نکال کر لے آیا۔

فقیرے نے میری میز پر اپنے جھولے کا سامان کھلا پڑا دیکھا اور حکیم نما شخص پر بھی نظر پڑی تو وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ میں نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ لرزتا کانپتا بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے فقیرے! حکیم صاحب تو کہتے ہیں کہ یہ دوا زہر کی طرح ہے۔ تم نے یہ دوا کیوں کھلائی عطا محمد کی لڑکی کو؟''

وہ منمنایا ''میرا تجربہ اتنا نہیں ہے جی! میں نے کبھی خود کو حکیم نہیں کہا۔ اگر کوئی مجبور کر کے مجھ سے دوائی لے لے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

شاہ صاحب نے کہا۔ ''اور یہ سب کیا اکٹھا کر رکھا ہے تم نے۔ اگر یہ جڑی بوٹیاں ہیں تو پھر گائے بھینسوں کو کھلانے کی کیا شے ہوتی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں کون بیوقوف حکیم یا سنیاسی کہتا ہے۔''

اس کے بعد شاہ صاحب نے فقیرے سے چند ایک سوالات پوچھے وہ کسی کا بھی ٹھیک جواب نہیں دے سکا، نہ ہی وہ ہوشیار پور کے اُس حکیم کا نام بتا سکا جسے وہ اپنا استاد بتاتا تھا۔

وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ جب میں نے اُس پر آنکھیں نکالیں اور چھتروں کی دھمکی دی تو وہ مان گیا کہ وہ حکیم وغیرہ نہیں ہے اور نہ ہی جڑی بوٹیوں کی الف ب کا اُسے پتہ ہے۔ اُس نے خدا کی قسم کھاتے ہوئے کہا کہ جمیلہ کو غلط دوا دینے میں اُس کی بری نیت کو دخل نہیں تھا۔ درحقیقت وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ اس دوا کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔

میں نے پوچھا ''اگر حکیم نہیں ہو تو کون ہو اور یہاں کیا کرتے پھرتے ہو؟''

وہ ایکا ایکی پھر گم صم ہو گیا۔ اُس کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ میں اُسے لے کر علیٰحدہ کمرے میں آ گیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو! میں ایک بار پھر تمہیں یہ مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے اور میرا بھی وقت ضائع نہیں ہوگا۔ دوسری صورت میں ہم دونوں نقصان میں رہیں گے۔''

وہ کچھ دیر اپنی پیشانی مسلتا رہا پھر بولا۔ ''پتہ نہیں جی آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جو قانون کے خلاف ہو۔ میرا گھر بار اور کاروبار ختم ہو چکا ہے۔ کوئی کام کاج ہے نہیں اس لیے اکیلا پھرتا رہتا ہوں......''

وہ اپنی صفائی پیش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا وہ میری نگاہ میں مشکوک ہو چکا تھا اور جب تک وہ زبان نہ کھولتا میں اُس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اُس کے اندر جمی ہوئی خاموشی کی برف پگھلانے میں مجھے دیر تو لگی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ بالآخر وہ پے در پے سوالوں کے سامنے بے بس ہو گیا اور اُس کے ہونٹوں پر وہ سچ آ گیا جسے وہ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے درخواست کی کہ جو بات وہ بتانے لگا ہے وہ میرے اور اُس کے درمیان رہے میں نے ''اوپرے'' دل سے وعدہ کر لیا اور کہا کہ اگر اُس بات کو چھپانا مناسب ہوا تو ضرور چھپا لوں گا......

اُس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میں ہوشیار پور کی قریبی آبادی کٹڑی رام سنگھ کا رہنے والا ہوں جناب! میرے والد کا نام اللہ جوایا تھا۔ لوگ انہیں میاں جی کہتے تھے۔ میاں جی جوانی میں کپڑے کا کام کرتے تھے۔ ہوشیار پور میں ان کی دکان سب سے مشہور تھی۔ اُس زمانے میں انہوں نے کافی پیسہ بھی کمایا لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ کاروبار کم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ چالیس پینتالیس سال کی عمر میں وہ ہوشیار پور والی دکان ختم کر کے کٹڑی رام سنگھ میں آ گئے۔ اور یہاں ایک چھوٹے سے بازار میں چھوٹی سی دکان کھول لی۔ کاروبار چھوٹا ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن کی اولاد میں سے کوئی بھی کاروبار سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ ان کی چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹے صرف دو تھے۔ بڑا بیٹا

پیدائشی گونگا تھا اور چھوٹا یعنی میں بالکل اور طبیعت کا مالک تھا۔ میرا دل کبھی بھی کاروبار میں نہیں لگا، نہ بچپن میں اور نہ بڑے ہو کر۔ میں نے ہوشیار پور سے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ اُس میں فیل ہو گیا۔ پھر فرنیچر بنانے کا کام سیکھ لیا اور امرتسر چلا گیا۔ وہاں کچھ عرصہ گھوم پھر کر کام کرتا رہا۔ پھر ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ اسی دوران میری شادی بھی ہو گئی میرے والد کو مجھ سے بہت محبت تھی میں بھی اُن کا بہت عزت احترام کرتا تھا۔ ہمارے خاندان میں یہ بات مشہور تھی کہ میرے والد نے اپنی جمع پونجی کہیں چھپا رکھی ہے (اُس زمانے میں اکثر دیہاتی اپنی بچتیں اسی طرح کہیں دبا دیتے تھے) میری ایک خالہ کا کہنا تھا کہ سن بائیس میں میاں جی کے پاس سونے کی بہت سی اشرفیاں اور چاندی کے روپے تھے۔ اس کے علاوہ گہنوں کی شکل میں بھی بڑی رقم تھی۔ یہ سب کچھ انہوں نے تانبے کی ایک بڑی ناند میں رکھ کر گندم کے بھڑولے میں چھپایا ہوا تھا۔ بعد میں انہوں نے یہ ناند کہیں دبا دی تھی۔

خاندان میں اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ میاں جی نے مجھے اپنی جمع پونجی کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے لیکن یہ اندازہ غلط تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ ایک بار میں نے ہمت کر کے پوچھا تو میاں جی کی باتوں سے پتہ چلا کہ واقعی انہوں نے پندرہ بیس برس پہلے اپنی جمع پونجی کہیں چھپائی تھیں۔ وہ بولے۔ ''تمہارے سوا میرا اور کون ہے۔ گھبراؤ نہیں وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔'' پھر ایک روز باتوں باتوں میں انہوں نے اشارہ دیا کہ وہ رقم انہوں نے میرے نانا کے ساتھ مل کر دبائی تھی۔ اشرفیوں اور چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی ناند لے کر وہ میرے نانا کے گھر شاہ کوٹ آئے تھے اور یہاں گھر کے پچھواڑے درختوں کے جھنڈ میں انہوں نے ناند دبا دی تھی۔ وہ بولے۔ ''اس بقرعید پر میں تمہیں اپنے ساتھ شاہ کوٹ لے کر جاؤں گا۔ ہم وہ ناند وہاں سے اکھاڑ کر لے آئیں گے۔'' میاں جی بڑے یقین کے ساتھ یہ بات کر رہے تھے۔ جیسے انہیں پورا بھروسہ ہو کہ ناند اب بھی وہیں موجود ہو گی۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ پچھلے پندرہ برسوں میں وہ کم از کم تین مرتبہ شاہ کوٹ جا کر اس ناند کو دیکھ چکے ہیں اور میری سب سے چھوٹی بہن کی شادی کے موقع پر وہ وہاں سے کچھ گہنے اور اشرفیاں نکال کر بھی لائے تھے۔ انہوں نے ناند سے نکالی ہوئی دو اشرفیاں بھی مجھے دکھائیں۔

میں بہت خوش تھا کہ اب ہمارے دن پھر جائیں گے لیکن بقرعید سے ڈھائی تین ماہ پہلے ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے نہ صرف میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا بلکہ میری دُنیا ہی اندھیر کر دی۔ میاں جی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی صحت بہت اچھی تھی کسی کے وہم و

گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اچانک وہ منہ موڑ جائیں گے۔ انہیں اچانک دمے کی شکایت ہوئی۔ رات کو دوائی کھا کر سو گئے۔ رمضان کے دن تھے۔ سحری کے وقت میری بیوی انہیں جگانے گئی تو وہ دروازے کے پاس بے سدھ پڑے تھے۔ دو تین گھنٹے پہلے اُن کی جان نکل چکی تھی۔ والد کی موت کا صدمہ میرے لیے برداشت سے باہر تھا۔ کئی ہفتے تک مجھے کھانے پینے کا ہوش نہ رہا۔ پھر آہستہ آہستہ دل ٹھکانے پر آنے لگا لیکن ابھی ایک اور قیامت مجھ پر گزرنا تھی۔ چند ہفتے بعد میری بیوی کے مردہ بچہ پیدا ہوا اور وہ جو پہلے ہی بہت گم صم رہتی تھی بالکل ہی چپ لگا بیٹھی۔ نہ وہ کسی سے بات کرتی تھی نہ گھر کے کام کاج میں اُسے دلچسپی تھی۔ میں نے اُسے کئی بار سمجھایا کہ وہ ایک بات کو دل سے لگا کر نہ بیٹھ جائے۔ ابھی اُسے پوری زندگی گزارنی ہے لیکن اُس پر تو جیسے کسی نے جادو ٹونا کر دیا تھا۔ میں جتنا سمجھاتا تھا وہ اتنا ہی بگڑتی چلی جاتی تھی ایک روز میں نے اُسے پیٹ ڈالا وہ خاموشی سے مار کھاتی رہی اور اگلے روز مجھ سے ایک لفظ کہے بغیر اپنے میکے چلی گئی۔ میری اکلوتی بچی بھی اُس کے ساتھ تھی۔ وہ دن اور آج کا دن اُس عورت نے مجھے اپنی صورت نہیں دکھائی۔ نہ جانے کیوں مجھے وہم ہے کہ اُسے کوئی بیماری لگ چکی ہے اور اُس بیماری کی وجہ سے ہی وہ مجھ سے دور چلی جانا چاہتی تھی میری مار پیٹ تو بہانہ بن گئی۔ یہ بہانہ نہ بنتا تو وہ کوئی اور بہانہ ڈھونڈ لیتی۔ میں نے سنا ہے کہ کئی بیماریاں چھوت کی ہوتی ہیں جیسے ٹی بی وغیرہ۔ کیا پتہ اُسے بھی کوئی ایسا روگ ہو یا پھر اُسے وہم ہو گیا ہو کہ اُسے روگ ہے وہ بڑی نیک اور گھر گرہستن عورت تھی۔ یقین نہیں آتا کہ وہ مجھے اس حالت میں چھوڑ کر جا چکی ہے۔

کاروبار تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب گھر بار بھی نہیں رہا۔ میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی کام نہیں کہ اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی پونجی ڈھونڈنے کی کوشش کروں۔ میرا نانا کوئی بارہ برس پہلے فوت ہو گیا تھا۔ دو ڈھائی سال بعد اُس کے بال بچے بھی شاہ کوٹ چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ساری زمین سیم اور کلر کا شکار ہو گئی تھی۔ کھیتیاں برباد ہو گئی تھیں۔ ایک دانہ نہیں اُگتا تھا یہاں۔ شاید آپ جانتے ہی ہوں بارہ دری سے آگے جہاں کھلا میدان ہے وہاں آبادی ہوتی تھی اب وہاں جھاڑ جھنکاڑ کے سوا اور کچھ نہیں۔ بس بنیادوں کے نشان ہی باقی رہ گئے ہیں۔ میں نے نانا کے مکان کا پتہ تو چلا لیا ہے مگر ناند والی جگہ تک پہنچنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اب آپ کو بتانے لگا ہوں تو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔ میں نے وہیں بارہ دری کے اندر ایک جگہ کدال اور کھرپا وغیرہ چھپا رکھا ہے۔ جن جن جگہوں پر مجھے زیادہ شک تھا کھدائی کر چکا ہوں مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔''

فقیر محمد جٹ عرف فقیرے کی روداد کافی دلچسپ اور اثر انگیز تھی۔ مجھے اس روداد پر سچ کی چھاپ صاف طور پر نظر آ رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا ''اگر تمہارا بیان درست مان لیا جائے تو یہ جڑی بوٹیوں کا کیا چکر ہے؟''

وہ بولا۔'' کچھ بھی نہیں۔ لوگ پوچھتے تھے کیا کرتے پھرتے ہو۔ میں نے کہا۔ دوائی کے لیے جڑی بوٹیاں ڈھونڈتا ہوں۔ باقی باتیں لوگوں نے اپنے پاس سے لگا لیں۔ مجھے فقیرے کا نام دے دیا گیا۔ کوئی مجھے حکیم کہنے لگا۔ کوئی سنیاسی اور کسی نے کہا کہ میں سانپ اور بچھو کے کاٹے کا زبردست علاج جانتا ہوں۔''

میں نے کہا۔'' تم نے ایک بچی کا زہر نکالا تو تھا۔''

وہ بولا۔''بس اسی وجہ سے لوگوں نے مجھے سنیاسی مشہور کر دیا۔ حالانکہ وہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ بچی پگڈنڈی پر گری پڑی تھی اور تڑپ رہی تھی۔ وہ میری ہی بچی کی ہم عمر تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے اپنی رانو یاد آ گئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ تازے زخم کو چوس لیا جائے تو زہر کا بہت تھوڑا اثر باقی رہ جاتا ہے۔ میں نے بچی کے زخمی پاؤں پر منہ رکھ کر زخم چوس لیا۔ بس اتنی سی بات تھی......''

فقیرے سے میری گفتگو قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ اس گفتگو سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اب اُس نے جو بیان دیا ہے وہ بہت حد تک درست ہے اور وہ واقعی تانبے کے اُس برتن یعنی ناند کی تلاش میں یہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اُس کا یہ خیال بھی تھا کہ اس کی بیوی پر کسی نے تعویذ کر دیئے ہیں جس کی وجہ سے وہ بیمار ہے اور اپنے آپ میں گھلتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح باپ کی جمع پونجی اُس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اپنی بیمار بیوی کا ''روحانی'' اور جسمانی علاج کروائے اور اپنا اُجڑا ہوا گھر پھر سے آباد کر دے۔

فقیر دیکھنے میں ایک صحت مند اور پُرکشش مرد تھا۔ ایسے مرد ناراض بیویوں کو منانے کی بجائے نئے سہرے باندھنے کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں لیکن فقیرے نے اپنی شریکِ حیات کے لیے دُنیا اندھیر کر رکھی تھی۔ کاروبار تباہ کر لیا تھا اور گلیوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ اُس کا وہ بیان بھی صحیح ہے جو اُس نے جمیلہ کے بارے میں دیا ہے۔ بعدازاں یہ اندازہ درست نکلا۔ یہ جمیلہ ہی تھی جو اُس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور ہر اچھے برے طریقے سے اُسے اپنے قریب کرنے کی فکر میں تھی۔

☆======☆======☆

فقیرے کی خواہش تھی کہ تانبے کے مدفون برتن کی بات ہم دونوں کے درمیان

رہے۔ اُس نے کسی سے سن رکھا تھا کہ زمین کے اندر سے ملنے والی قیمتی اشیاء میں سرکار کا حصہ ہوتا ہے۔ روپے میں سے دس گیارہ آنے سرکار کو چلے جاتے ہیں اور صرف پانچ آنے نکالنے والے کو ملتے ہیں۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ وہ بیوقوفی کی بات کر رہا ہے۔ گورنمنٹ کو حصہ اُس وقت ملتا ہے جب برآمد ہونے والی دولت کا کوئی والی وارث نہ ہو۔ یہ اشرفیاں اور گہنے تو اُس کے باپ نے ورثے کے طور پر چھوڑے ہیں اور ایسے ہی نہ جانے کتنے لوگوں نے حفاظت کی غرض سے اپنی پونجیاں دبا رکھی ہیں۔ ان پونجیوں پر دفینوں (ٹریزرز) کا قانون لاگو نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں اُسے میری بات سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ وہ میری ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

میں نے اُس سے کہا۔''ہو سکتا ہے تمہارے والد نے ناند کی جگہ کے بارے میں کہیں کچھ لکھ رکھا ہو۔ یا کسی ہمراز شخص کو کچھ بتا رکھا ہو۔''

وہ بولا۔''میں نے اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی ہے جی! لکھنے کی تو انہیں عادت ہی نہیں تھی۔ بڑے لمبے لمبے حساب زبانی کر لیا کرتے تھے۔ شروع میں وہ تھوک کا کام بھی کرتے تھے۔ لوگ اُن سے ادھار لے جاتے تھے۔ وہ ادھار کا حساب کتاب بھی زبانی ہی یاد رکھتے تھے۔ بڑی زبردست یادداشت تھی ان کی جہاں تک کسی کو بتانے کی بات ہے میرے نانا کے علاوہ انہیں کسی پر بھروسہ نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے بعد میں انہوں نے میری والدہ کو بھی بتا دیا ہو لیکن وہ بھی آٹھ دس برس پہلے فوت ہو چکی ہیں۔''

ایک روز صبح سویرے میں فقیرے کو ساتھ لے کر بارہ دری والے میدان میں چلا گیا۔ کئی روز کی بارش کے بعد دھوپ نکلی تھی اور بہت بھلی لگ رہی تھی۔ کھنڈر تالاب میں باسی پانی پر کائی جمی ہوئی تھی۔ تالاب کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں پر دو مریل بلیاں گھوم رہی تھیں۔ قریب ہی کیکر کے ایک ٹنڈ منڈ درخت پر بے شمار دھجیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ دور دراز دیہات کے سادہ لوح لوگوں کا خاص انداز ہوتا ہے۔ وہ کوئی منت مانتے ہیں اور پھر اُس منت کے نام پر رنگین کپڑے کی ایک دھجی درخت سے باندھ دیتے ہیں۔ اس دھجیوں والے درخت سے چالیس پچاس گز دور زمین پر اُن مکانوں کے آثار موجود تھے جو پندرہ سولہ برس پہلے یہاں پائے جاتے تھے۔ دو فٹ اونچی اور دو تین گز لمبی ایک شکستہ دیوار کے پاس کھڑے ہو کر فقیرے نے بتایا کہ یہ اُس کے نانا کا مکان تھا۔

مکان کے پچھواڑے کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ نظر آ رہا تھا اور دور ایک ٹوٹی پھوٹی برجی پر ایک گدھ اداس بیٹھا تھا۔ جیسے بیتے دنوں کے خاموش ماتم میں مصروف ہو۔ فقیرے نے

انگلی کے اشارے ایک حد کھینچتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے جی کہ اُس بر جی سے لے کر اُس جھاڑی تک اور وہاں سے اس دیوار تک...... یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ ناند موجود ہونی چاہیے۔''

پھر وہ گھوم پھر کر مجھے وہ چند جگہیں دکھانے لگا جہاں اُس نے اپنے طور پر کھدائی کی تھی۔ یہ دو تین فٹ قطر کے پانچ گڑھے تھے۔ انہیں کھودنے کے بعد دوبارہ بھر کر برابر کر دیا گیا تھا۔ پچھلے دنوں جو بارشیں ہوئی تھیں اُن سے مٹی بیٹھ گئی تھی اور ایک دو گڑھوں کے آثار صاف نظر آ رہے تھے...... میں نے موقع محل کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ فقیرے نے جس رقبے کی نشاندہی کی تھی وہ کم از کم ایک ایکڑ پر مشتمل تھا۔ اس پورے ایکڑ میں سے گہرائی میں دبا ہوا تانبے کا برتن ڈھونڈ نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ فقیرا تنہا شاید ڈیڑھ دو سال بھی لگا رہتا تو کامیابی حاصل نہ کر پاتا۔

میں نے فقیرے سے پوچھا ''تمہارے خیال میں ایسی کون سی جگہیں ہیں جہاں کھدائی ہونا زیادہ ضروری ہے۔''

وہ بولا۔ ''میاں جی سے میری جو بات ہوئی تھی اُس کے مطابق ناند درختوں کے جھنڈ میں دبائی گئی تھی۔ اب درخت تو زیادہ تر کٹ چکے ہیں یا گر چکے ہیں۔ بس اُن کی جڑیں ہی موجود ہیں۔ میں نے گھوم پھر کر کوئی دو درجن ایسی جگہیں ڈھونڈی ہیں جہاں نشانوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں درخت تھے۔ اُن جگہوں پر گہرائی تک کھودا جائے تو ضرور کھوج لگ سکتا ہے۔''

اگلے روز میں نے اپنے اے ایس آئی فرزند علی کو بلایا اور ساری بات سمجھانے کے بعد اُس کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ دس پندرہ مزدوروں کا انتظام کرے اور بارہ دری کے اردگرد جہاں جہاں فقیرا کہتا ہے زمین کھودی جائے۔

اے ایس آئی نے بڑی ہوشیاری سے میری ہدایات پر عمل کیا۔ قصبے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ یہ کھدائی کس سلسلے میں ہو رہی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ پولیس کوئی مسروقہ سامان برآمد کرنے کی کوشش کر رہی ہے یا پھر کسی آلہ قتل کی تلاش میں ہے۔ یہ سلسلہ تین چار روز جاری رہا لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ بڑ گڑ بڑ والا معاملہ تھا۔ مزدور فی سبیل اللہ تو کام نہیں کر رہے تھے۔ انہیں روز دیہاڑی دینا پڑتی تھی اور یہ میں اپنے پلے سے دے رہا تھا۔ اگر فقیرے کی ناند مل جاتی تو یہ خرچہ نکل سکتا تھا۔ (اور مجھے اس خرچے کے علاوہ کوئی لالچ بھی نہیں تھا) لیکن اگر سب کچھ ٹائیں ٹائیں فش ہو جاتا تو سارا بوجھ میری

جیب پر ہی پڑنا تھا۔ فقیرے نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ کنگلا ہے۔ لہٰذا عقلمندی یہ تھی کہ میں اتنا ہی بوجھ اٹھاؤں جتنا میری برداشت میں ہے۔ چوتھے روز شام کو اپنی حلال کی کمائی میں سے پندرہ مزدوروں کو دیہاڑی دینے کے بعد میں نے کہا۔ ''بھئی بس...... اب تم لوگ چھٹی فرماؤ۔ اپنا اپنا کام کرو اور ہمیں بھی اپنا کام کرنے دو۔''

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اُن میں سے آدھے مزدوروں نے کہا کہ وہ ایک آدھ روز مزید کھدائی جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر انہیں دیہاڑی بھی نہ ملے تو کوئی بات نہیں۔ ہاں اگر برتن مل جائے تو وہ اپنی خوشی سے جو چاہیں دے دیں۔

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ اے ایس آئی فرزند علی کو میں نے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ کسی مزدور کو کھدائی کا اصل مقصد نہیں بتائے گا لیکن یہاں وہ سب کے سب آگاہ ہو چکے تھے۔ تفتیش کی تو پتہ چلا کہ یہ سب بلال شاہ کا کیا دھرا ہے۔ وہ اس معاملے میں بہت دلچسپی لے رہا تھا اور جب سے کھدائی شروع ہوئی تھی بارہ دری میں بیٹھا رہتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھ گچھ کی تو کہنے لگا۔ ''خاں صاحب! آپ خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں۔ جہاں اتنی محنت کی ہے تھوڑی اور کر کے دیکھ لیں۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن تمہیں ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب ہرا یرا غیرا کدال پکڑ کر یہاں چلا آئے گا۔''

وہ بولا۔ ''لیکن ہمیں کیا فرق پڑے گا جناب! آدھی سے زیادہ جگہ تو کھود ہی ڈالی ہے ہم نے۔ جو باقی رہ گئی ہے وہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ دھڑکو (وسوسہ) نکل جائے گا۔ پھر لوگ جو مرضی کرتے پھریں۔ جگہ ہی کھودیں گے ناں۔ کھودتے رہیں۔ ہوسکتا ہے اسی بہانے یہاں کھیتی باڑی شروع ہو جائے۔'' وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ اس کی منطق ایسی ہی نرالی ہوتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم زیادہ ارسطو بننے کی کوشش نہ کرو۔ ایک تو غلطی کرتے ہو اوپر سے دلیلیں جھاڑتے ہو۔''

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''خان صاحب! نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ یہاں سے کچھ نہ کچھ نکلے گا ضرور۔ آپ کی بھرجائی کا خواب کبھی جھوٹا نہیں نکلتا۔ میں نے بہت دفعہ آزما کر دیکھا ہے۔ ڈیڑھ دو مہینے پہلے وہ کہہ رہی تھی ''میں نے خواب دیکھا ہے کہ ہمارے گھر کے پچھواڑے زمین کے اندر سے سونے چاندی سے بھری ہوئی گیارہ دیگیں نکلی ہیں۔ ان دیگوں پر کالے رنگ کا ایک شیش ناگ پہرہ دے رہا ہے۔ میں جھاڑو مار مار کر اُس ناگ کو بھگاتی ہوں اور وہ دیگیں نکال کر باہر لے آتی ہوں۔'' خان صاحب! کیا پتہ اس کھدائی

میں اُس خواب کو ہی تعبیر ملنی ہو۔''

جی چاہا ایک جھانپڑ ماروں ''شاہ جی'' کے سر پر لیکن کچھ بھی تھا وہ عُمر میں مجھ سے بڑا تھا۔ میں نے کہا۔ ''حضرت صاحب! آپ ہر معاملے میں پنگے مت لیا کریں۔ ورنہ کسی دن سچ مچ جھگڑا ہو جائے گا آپ سے۔''

وہ بولا۔ ''لیکن آپ کی بھرجائی کا خواب تو......''

''خواب کو مارو گولا۔'' میں نے اُس کی بات کاٹی۔ ''خواب کی تعبیر تو کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ اور اکثر یہ تعبیر اُلٹی ہوتی ہے۔ میرا تو خیال ہے وہ گیارہ دیگیں گیارہ عدد بچے ہیں۔ اُن میں سے دس عدد تو وہ تمہیں دے چکی ہے۔ ایک آدھ مٹی میں دبا ہو گا۔ وہ بھی جلد ہی باہر آ جائے گا۔ بس پھر ان خزینوں کے درمیان بیٹھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لیا کرنا۔ اور وہ جو کالا ناگ ہے ناں میرے خیال میں تمہارا سسر تھا۔ وہ درمیان میں سے ہٹا ہے تو دیگیں تمہیں ملی ہیں ناں۔''

بلال شاہ بُرے بُرے منہ بنا رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا فرزند علی اندر آ گیا اور اُسے چپ ہونا پڑا۔

اگلے روز چھ سات مزدوروں نے اے ایس آئی اور بلال شاہ کی زیرِ نگرانی کھدائی جاری رکھی۔ اُس روز شام کے وقت ایک کانسٹیبل بھاگا بھاگا تھانے آیا۔ کہنے لگا ''جناب! آپ کو اے ایس آئی صاحب بُلا رہے ہیں۔ وہاں تالاب کے پاس سے کچھ ملا ہے۔''

میں کانسٹیبل کے ساتھ فوراً موقعے پر پہنچا۔ تالاب سے قریباً پچاس گز دور دو ٹنڈ منڈ درختوں کے پاس مجمع لگا تھا۔ مزدوروں کے علاوہ بلال شاہ، فرزند علی اور عملے کے کچھ مزید افراد بڑے غور سے کسی شے کا معائنہ کر رہے تھے۔ عام لوگوں کو اُس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی ورنہ شاید پورا قصبہ اکٹھا ہو جاتا۔ میرے پہنچنے پر مزدور اِدھر اُدھر ہو گئے۔ ایک درخت کی جڑ کے پاس چار پانچ فٹ قطر کا گڑھا نظر آ رہا تھا۔ گڑھا قریباً پانچ فٹ گہرا تھا۔ مٹی کے اندر سے ایک بوسیدہ موم جامے کا کونا باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ لوہے کا ایک سریا نما ٹکڑا بھی نظر آ رہا تھا۔ اس ٹکڑے کے ایک سرے پر لکڑی کا دستہ تھا۔ اے ایس آئی فرزند علی نے ایک زنگ آلود کھرپی مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں جناب! اس دستے کا دوسرا حصہ یہ ہے۔''

میں نے دونوں ٹکڑے جوڑ کر دیکھے۔ یہ دودھ فروشوں کے استعمال میں آنے والی ایک لمبی سی کھرپی تھی۔ اس پر جگہ جگہ زنگ لگا ہوا تھا۔ میں نے مومی جامے کو بغور دیکھا۔

اُسے دہرا کیا گیا تھا اور غالباً اُس پر کوئی دیسی یا ولائتی کیمیکل بھی لگا ہوا تھا۔ ایک مزدور، فرزند علی کی ہدایت کے مطابق احتیاط سے کھرپا چلا رہا تھا اور موم جامے کے اردگرد سے مٹی ہٹاتا چلا جا رہا تھا۔ تمام نگاہیں ڈوبتے سورج کی روشنی میں بڑے تجسّس سے گڑھے کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا بلال شاہ کا چہرہ جوش سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

پانچ دس منٹ میں موم جامے کا بڑا حصہ مٹی سے باہر آ گیا اور اس کے ساتھ ہی کسی دھاتی برتن کا کنارہ زمین سے ابھرا۔ یہ تانبے کا برتن تھا۔ دو مزدوروں نے جلدی جلدی کھرپے چلائے اور تھوڑی ہی دیر میں تانبے کی گول مٹول ناند ہمارے سامنے آ گئی۔ ناند کا سائز عام مٹکے کے برابر تھا اور وہ تین اطراف سے مومی کپڑے میں ڈھکی ہوئی تھی اسے اکھاڑ کر باہر لایا گیا۔ اُس کا نیلگوں تانبہ اور تانبے پر بنے ہوئے مدھم نقش و نگار کہیں کہیں سے صاف دکھائی دے رہے تھے اور غروب ہوتے سورج کی روشنی میں دمک رہے تھے میں نے ناند کا ڈھکنا اٹھایا...... وہ اندر سے بالکل خالی تھی۔

☆======☆======☆

یہ معاملہ اب ایک بالکل نیا رخ اختیار کر گیا تھا۔ یہ ناند وہی تھی جو قریباً بیس برس پہلے فقیرے کے والد نے اپنے سسر کے مکان کے پچھواڑے دبائی تھی لیکن چھ سات ماہ پہلے اس جگہ کو کھودا گیا تھا اور ناند خالی کر دی گئی تھی۔ یہ کام کرنے والا کون تھا؟ فقیرے کے بیان سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے باپ نے ناند کو آخری بار قریباً تین برس پہلے چھیڑا تھا۔ جب اُس نے سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی کی تھی اور ناند میں سے کچھ اشرفیاں اور گہنے نکالے تھے لیکن گڑھے سے دریافت ہونے والے آثار بتاتے تھے کہ اس جگہ کی کھدائی صرف چھ سات ماہ پہلے ہوئی ہے۔ یعنی میاں جی کی موت سے پہلے یا فوراً بعد ناند کے اوپر سے مٹی کھودی گئی وہ نرم تھی اور علاقے کے سب سے تجربہ کار گورکن علاؤالدین کا کہنا تھا کہ یہ گڑھا زیادہ سے زیادہ سات آٹھ ماہ پہلے کھودا گیا ہے۔ پھر آہنی کھرپی پر لگے ہوئے زنگ سے بھی یہی پتہ چلتا تھا کہ اس لوہے کو دفن ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ یہ کھرپی ایک دو جگہوں کے سوا قریباً زنگ سے محفوظ تھی جب کہ مٹی سے برآمد ہونے والی لوہے کی ایک دو بے کار اشیاء بری طرح زنگ آلود تھیں۔

اس کا مطلب تھا کہ کوئی تیسرا شخص ہے جو اس ناند کی ٹھیک ٹھیک جگہ سے آگاہ تھا۔ وہ آیا اور سب کچھ سمیٹ کر خاموشی سے چلتا بنا۔ ممکن تھا کہ ناند خالی کرنے کے لیے اُس نے جھولا یا بوری وغیرہ استعمال کی ہو۔ موقعے سے ملنے والی کھرپی بھی یقیناً اُسی کی تھی۔ کھدائی

کے دوران یا آخری مرحلے میں یہ کھرپی ٹوٹ گئی تھی۔ اور وہ عجلت میں اُسے وہیں چھوڑ گیا تھا۔ ایک طرح سے یہ زنگ آلود کھرپی اس شخص کا واحد سراغ تھی جس نے چھ سات ماہ پہلے اس دفینے پر ڈاکہ مارا تھا۔

ناند خالی نکلنے سے جہاں فقیرے کو صدمہ پہنچا تھا وہاں بلال شاہ اور ''رضا کار'' مزدوروں کے منہ بھی لٹک گئے تھے۔ ایک طرح سے اب یہ پولیس کیس بھی بن گیا تھا۔ فقیرا چاہتا تو نامعلوم ملزم کے خلاف پرچہ کٹوا سکتا تھا۔ میں نے اکیلے میں بیٹھ کر فقیرے سے پوچھا۔ ''اگر کسی پر شک ہے تو بتاؤ۔''

اُس کی پیشانی پر لکیروں کا جال پھیل گیا۔ داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''میں کیا بتاؤں جی! میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

میں نے پوچھا۔ ''خاندان میں کوئی ایسا شخص جو اس ناند والے معاملے میں خاص طور پر دلچسپی لیتا ہو۔''

وہ پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''میرا ایک چچا تھا۔ جب بھی ابا کے پاس بیٹھتا تھا ہنسی مذاق میں اشرفیوں اور گہنوں کی باتیں کرنے لگتا تھا۔ کہتا تھا آپ نے ضرور کہیں کچھ چھپا رکھا ہے۔ ابا جی اس کے ہنسی مذاق کو ہنسی مذاق میں ٹال دیتے اور کہتے ہاں چھپایا ہوا ہے میں نے خزانہ۔ دیگیں دفن کی ہوئی ہیں گھر کے پچھلے برانڈے میں۔ میرے اُس چچا کا نام اسحاق ہے لیکن وہ تو پچھلے چار سال سے جیل میں ہے۔ ٹرک ڈرائیوری کرتا تھا وہ۔ اُس کے ٹرک کے نیچے آ کر ایک بڑا سرکاری افسر اور اُس کا ملازم مارا گیا۔ بس اُس وقت سے جیل میں سڑ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کہیں جیل سے بھاگ تو نہیں آیا وہ؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا جی! لیکن وہ ایسا بندہ تو نہیں ہے۔''

انہی دنوں مجھے ایک کیس کے سلسلے میں امرتسر جانا پڑ گیا۔ یہ اغوا برائے تاوان کا کیس تھا اور اس کی روداد آپ انہی صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ سلجھتے سلجھتے آٹھ دس روز لگ گئے۔ فارغ ہو کر میں دو ہفتے بعد واپس شاہ کوٹ پہنچ سکا۔ اے ایس آئی فرزند علی کے پاس میرے لیے ایک اہم اطلاع تھی۔ اُس نے بتایا کہ فقیرا ہوشیار پور اپنے گھر گیا تھا اور وہاں سے لاپتہ ہو گیا ہے۔ اُس کی گمشدگی کی اطلاع دینے والا اُس کا گونگا بھائی خدا بخش تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ مقامی تھانے پہنچا تھا اور اُن دونوں نے ایس ایچ او کو بتایا تھا کہ فقیرا گھر سے غائب ہے۔ اس واقعے کو اب دس روز ہو چکے تھے لیکن اُس کا کہیں سراغ

نہیں ملا تھا۔ یہ بڑی خاص اطلاع تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے خود ہوشیار پور جانا چاہیے۔ ایک رات آرام کرنے کے بعد میں اگلے روز ہوشیار پور روانہ ہو گیا۔ میری اطلاع کے مطابق فقیرے کا گھر ہوشیار پور کی ایک نواحی بستی کٹڑی رام سنگھ میں تھا۔ یہ کرائے کا مکان تھا اور پچھلے چھ سات مہینے سے خالی پڑا تھا لہٰذا مالک مکان نے وہاں نئے کرائے دار داخل کر دیئے تھے۔ اسی گلی میں فقیرے کے بڑے بھائی گونگے خدا بخش کا گھر بھی تھا۔ میں کٹڑی پہنچ کر سیدھا اُسی کے گھر میں گیا۔ وہ اور اُس کی بیوی گھر ہی میں تھے۔ گونگے کی شکل صورت فقیرے سے ملتی تھی لیکن وہ اُس کے مقابلے میں کافی موٹا تھا۔ اس کی بیوی مجھے ایک ہوشیار چالاک عورت نظر آئی۔ ایک بچی آنگن میں کھیل رہی تھی۔ دوسرا بچہ ماں کی گود میں تھا اور تیسرا شاید پیٹ میں۔ عورت نے مجھ سے پردہ نہیں کیا۔ اپنے خاوند کی ترجمانی کرنے کے لیے وہ تمام وقت ہمارے پاس ہی موجود رہی۔ اپنے دیور کے پاس وہ بہت فکرمند نظر آتی تھی۔

کہنے لگی۔ ''تھانیدار جی! فقیرا پچھلی سے پچھلی اتوار کو آیا تھا۔ ہم سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کئی مہینے بعد اُس کی صورت دیکھی تھی۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ میاں جی کی رقم اور زیوروں کا پتہ چل گیا ہے پر موقعے سے صرف ناند ہی ملی ہے باقی چیزیں کوئی نکال کر لے گیا ہے۔ وہ اس بارے میں بڑا پریشان نظر آتا تھا لگتا تھا کہ اسے کسی پر شک ہے لیکن نام بتانا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے دن صبح سویرے گھر سے نکلا اور شام کو واپس آیا۔ پھر ذکیہ کی طرف چلا گیا۔ ذکیہ اُس کی منہ بولی بہن ہے۔ یہیں ہوشیار پور کی ''نویں آبادی'' میں رہتی ہے۔ کہنے لگا ''میں ذکیہ بہن کی طرف جا رہا ہوں۔ سات آٹھ بجے تک آ جاؤں گا۔ تم میرے لیے مٹروں والے چاول پکا کر رکھنا۔'' مٹروں والے چاول بڑے شوق سے کھاتا ہے وہ۔ میں نے چاول پکائے۔ ساتھ میں آلو کا شوربہ بنایا اور اُس کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ ساری رات ہم دونوں اس کی راہ دیکھتے رہے لیکن وہ نہیں آیا۔ صبح میں نے گڈی کے ابے کو ''نویں آبادی'' بھیجا۔ ذکیہ سے پتہ چلا کہ فقیرا شام چھ بجے کے قریب آیا تھا۔ بچوں کے لیے مٹھائی لایا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھا اور پھر چائے وغیرہ پی کر واپس چلا گیا۔ کہتا تھا میں نے کسی بندے سے ملنے جانا ہے۔''

میں نے ڈیڑھ دو گھنٹے تک خدا بخش اور اُس کی بیوی سے بات چیت کی، لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ خدا بخش کی بیوی شہناز بہت گہری عورت ہے۔ کسی وقت وہ سیدھی سادی گھر گرہستن لگتی تھی۔ جسے اپنے دیور سے محبت تھی اور وہ اُس کی گمشدگی پر

ایک بڑی بہن یا ماں کی طرح پریشان تھی۔ گونگے خدا بخش نے بھی اشاروں کنایوں سے اظہار خیال کیا۔ وہ کوئی ایسا ذہین شخص نہیں تھا اور صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔ اُس نے اشاروں کی زبان میں بتایا کہ فقیرے کی گمشدگی نے اُسے ہلکان کر رکھا ہے اور اُسے ڈر ہے کہ کہیں کسی نے رقم اور گہنوں کی خاطر اُسے جان سے نہ مار ڈالا ہو۔ اُس نے کہا کہ شاہ کوٹ سے نکلنے والی ناند پر فقیرے کے بچوں اور اُس کے اپنے بچوں کا حق تھا لیکن اگر اس ناند کی وجہ سے فقیرے کی زندگی خطرے میں ہے تو وہ اُس پر لعنت بھیجتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ غوں غاں کر کے اور ہاتھ پیر ہلا کر نہ جانے کیا کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔

میں نے شہناز سے اُس کے سسر اور دوسرے عزیزوں کے بارے میں کئی ایک سوالات کیے۔ ان میں سے کچھ سوالوں کے جواب شہناز نے تسلی بخش دیے لیکن کچھ کے جواب غیر تسلی بخش تھے۔ مثلاً وہ یہ نہیں بتا سکی کہ فقیرے والا مکان کرائے پر لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ اس مکان میں بھی دونوں گھرانے با آسانی رہ سکتے تھے۔ شہناز اس سوال کا بھی معقول جواب نہیں دے سکی کہ جب فقیرا شام کے بعد گھر واپس نہیں آیا تو میاں بیوی نے فوری طور پر اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی اور کیوں رات بھر اس کا انتظار کرتے رہے۔

آخر میں مَیں نے شہناز سے پوچھا۔ ’’کیا تم لوگوں کو پتہ تھا کہ میاں جی کی جمع پونجی شاہ کوٹ میں ہے اور فقیرا یہ پونجی وہاں کھوجتا پھرتا ہے؟‘‘

شہناز نے نفی میں سر ہلایا۔ کہنے لگی۔ ’’ہمیں اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی خبر تھی کہ وہ شاہ کوٹ میں ہے۔ میاں جی سے اُسے پیار تھا۔ اُن کے مرنے کے بعد وہ چپ رہتا تھا پھر جب بیوی بھی لڑ جھگڑ کر میکے جا بیٹھی تو وہ کچھ زیادہ ہی چپ رہنے لگا تھا۔ امرتسر میں فرنیچر کی دکان تھی۔ اُس پر ایک شاگرد نے قبضہ جما لیا۔ یہ کچھ عرصہ یہیں ہوشیار پور میں ڈانواں ڈول پھرتا رہا۔ پھر ایک دن ویسے ہی غائب ہو گیا۔ اپنے طور پر ہم نے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی پھر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ کوئی دو مہینے پہلے ایک بندے نے خبر دی تھی کہ اُس نے فقیرے کو شاہ کوٹ کے قریب ایک بس سٹاپ پر کھڑے دیکھا تھا۔ میرا بڑا دل چاہتا تھا کہ کوئی شاہ کوٹ جائے اور اس کا پتہ کرے، پر کوئی سبب ہی نہیں بن رہا تھا۔‘‘

فقیرے کے بھائی اور بھابی سے ملاقات کے بعد میں نے اُس کی منہ بولی بہن ذکیہ سے ملنے کا فیصلہ کیا اور تانگے پر سوار ہو کر ’’نویں آبادی‘‘ جا پہنچا۔ ایک سکھ ہیڈ کانسٹیبل بھی

میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں سادہ لباس میں تھے...... کہنے کو تو ذکیہ کا گھر نویں آبادی میں تھا لیکن اصل میں نویں آبادی کے پچھواڑے ایک چھوٹی سی کچی بستی میں تھا۔ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا یہ ذرا پرانا سا مکان تھا۔ خدا بخش اور شہناز سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں اُن کے مطابق ذکیہ شادی شدہ تھی۔ اُس کے دو بچے تھے اور اُس کے شوہر کا نام گلاب دین تھا۔

گلاب دین گھر میں نہیں تھا۔ ذکیہ اور اُس کی بہت بوڑھی ساس سے ملاقات ہوئی۔ غالباً مقامی پولیس کے اہلکار تفتیش کے لیے پہلے بھی یہاں آ چکے تھے لہٰذا ہمیں دیکھ کر گھر والوں کو کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ ذکیہ نے ہمیں گھر کی بیٹھک میں بٹھایا اور پڑوسیوں کے ایک لڑکے کو گلاب دین کی طرف بھیج دیا۔ گلاب دین کے آنے تک وقت ضائع کرنے کی بجائے میں نے ذکیہ سے سوال جواب شروع کر دیے۔ وہ بہت آزردہ خاطر نظر آ رہی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ رو رو کر اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ میرے پوچھنے پر اُس نے کہا۔ ’’بھائی فقیر پانچ چھ بجے آئے تھے۔ میرے بچوں کے لیے مٹھائی لائے تھے مجھے بہت بہت پیار دیا۔ کہنے لگے اب میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ ہمیشہ ہوشیار پور میں رہوں گا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اُن سے کہا کہ وہ بھابی کو منا لائیں۔ کہنے لگے میرے بس میں ہو تو میں ایک منٹ کی دیر نہ کروں، پر میں جانتا ہوں وہ مانے گی نہیں۔ میں نے کہا، کیوں نہیں مانے گی۔ ہم دونوں بہن بھائی جائیں گے اور اُسے لے کر آئیں گے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے یہ بھی کر کے دیکھ لیں گے۔ پھر بولے کہ میرے لیے کوئی تکلف نہ کرنا، مجھے جلدی جانا ہے۔ ایک ضروری کام ہے پھر ملنے آؤں گا۔ میرے شوہر سے بھی نہیں ملے اور اُٹھ کر چلے گئے۔ صبح سویرے بھائی خدا بخش آئے اور اُن سے پتہ چلا کہ وہ تو رات بھر گھر نہیں پہنچے۔‘‘

میں نے ذکیہ سے پوچھا۔ ’’فقیرے نے تم سے اشرفیوں اور گہنوں والی ناند کی کوئی بات کی تھی؟‘‘

وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ ’’نہیں جی! ہمیں تو کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ تو جب پولیس آئی اور بھائی خدا بخش نے پولیس کو بتایا کہ میاں جی کی چھوڑی ہوئی ناند کا چکر بھی ہے تو ہمیں پتہ چلا۔‘‘

نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ ذکیہ رٹا رٹایا بیان دے رہی ہے۔ بار بار اُس کی زبان اُس کے لہجے کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کوئی بھاری بوجھ ہے اُس کے ذہن پر۔ ہماری گفتگو کے دوران ہی ذکیہ کا خاوند بھی گھر آ گیا۔ میں نے اُسے کھڑکی میں سے دیکھا۔ وہ برآمدے کی طرف آ رہا تھا۔ اونچا لمبا صحت مند شخص تھا۔ اُس

نے کندھے پر دہی کے چار پانچ خالی کونڈے رکھے ہوئے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ شخص شِیر فروش ہے...... اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ زنگ آلود کھرپی لپک گئی جو بارہ دری والے میدان میں ناند کے پاس سے ملی تھی۔ وہ ٹوٹی ہوئی کھرپی کسی شِیر فروش ہی کی تھی۔ دہی کے کونڈے برآمدے میں رکھنے کے بعد گلاب دین صافی سے ہاتھ پونچھتا ہوا بیٹھک میں آ گیا۔ میں نے ایک بھرپور نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالی اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں ''ناند کے چور'' کے آس پاس پہنچ گیا ہوں۔

☆======☆======☆

گلاب دین سے ملاقات کے بعد میں اُس کے بارے میں کچھ اور شک میں پڑ گیا۔ وہ اکثر شِیر فروشوں کی طرح ایک اکھڑ شخص تھا اور اس کے علاوہ گھمنڈی اور غصیلا بھی تھا۔ بازار میں اُس کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ کبھی کھولتا تھا اور کبھی بند رکھتا تھا۔ ذکیہ پر اُس کا بہت رعب تھا اور اس کے سامنے وہ مجھے سہمی سہمی نظر آئی...... ذکیہ اور گلاب دین سے مل کر میں سیدھا مقامی تھانے پہنچا۔ بارہ روز پہلے فقیرے کے بھائی اور بھابی نے اس کی گمشدگی کی اطلاع یہیں پر دی تھی۔ ایک سکھ سب انسپکٹر مت سنگھ یہاں کا انچارج تھا۔ اس سلسلے میں جو تھوڑی بہت تفتیش ہوئی تھی وہ مت سنگھ نے ہی کی تھی۔

مت سنگھ مجھے گرمجوشی سے ملا۔ شام کے کھانے کے بعد ہم کیس کی پیش رفت پر بات کرتے رہے۔ مت سنگھ نے اب تک جو کارروائی کی تھی میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے بھی اپنی معلومات سے اسے آگاہ کیا۔ میرے کہنے پر مت سنگھ نے فوری طور پر دو سادہ پوش جوانوں کا انتظام کیا اور انہیں ''نویں آبادی'' بھیج دیا۔ ان جوانوں کے ذمے گلاب دین کی نگرانی کا کام لگایا گیا تھا...... ان جوانوں میں سے ایک سپاہی تھا اور دوسرا ہیڈ کانسٹیبل۔ مت سنگھ نے ہیڈ کانسٹیبل کو ایک عدد سکوٹر بھی فراہم کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ٹیلیفون پر امرتسر ہیڈ کوارٹر میں بات کی اور اُس قیدی کا پتہ کرایا جو امرتسر جیل میں تھا اور جس کے بارے میں فقیرے نے بتایا تھا کہ وہ اُس کا سگا چچا ہے۔ اس چچا کے بارے میں اگلے روز گیارہ بجے کے قریب رپورٹ ملی...... یہ شخص جیل ہی میں تھا اور چین تسلی سے اپنی سزا بھگت رہا تھا۔ اب اس شخص پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہی تھی۔ میرا شک گلاب دین پر کچھ اور مضبوط ہو گیا۔

مت سنگھ کی خواہش تھی کہ میں جب تک ہوشیار پور میں ہوں اُسی کے تھانے قیام کروں۔ وہ خود بھی تھانے کے اندر ہی رہائش رکھتا تھا۔ کھلے احاطے میں ایک طرف

ملازمین کے لیے تین چار کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کوارٹر میں میرا بستر لگا دیا گیا۔ عام پولیس والوں کے برعکس مت سنگھ ایک خوش مزاج شخص تھا۔ ہنسی مذاق بہت کرتا تھا اور گالیاں بھی دیتا تھا تو ایسی مخولیا قسم کی کہ گالی کھانے والا سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ ہنسے یا غصہ کرے۔ مت سنگھ تاش کا رسیا تھا۔ شام ہوتے ہی اُس نے اپنے کوارٹر میں تاش کی محفل سجا لی اور مجھے بھی کھینچ کھانچ کر وہاں لے آیا۔ تاش کا کھیل وقت کا ویری ہوتا ہے۔ جس کا وقت قیمتی ہو اُسے تاش کو چھونا بھی نہیں چاہیے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کب دن چڑھا اور کب شام ہو گئی۔ ہم بھی رات قریباً بارہ بجے تک کھیلتے رہے اور ساتھ ساتھ مونگ پھلی ٹھکورتے رہے۔

مت سنگھ پوری طرح تازہ دم تھا لیکن باقیوں کی نیند کی وجہ سے مت ماری جا رہی تھی۔ آخر جب میرے ساتھی حوالدار نے تیسری مرتبہ بیگم کا یکہ پھینک دیا تو میں پتے پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مت سنگھ نے بھی پتے پھینک دیے...... عین اُس وقت تھانے کے احاطے سے ''لمبریٹا'' سکوٹر کی آواز آئی۔ یہ وہی سکوٹر تھا جو گلاب دین کی نگرانی کرنے والا کانسٹیبل لے کر گیا تھا۔ سکوٹر کے علاوہ ایک گاڑی کا شور بھی سنائی دیا۔ میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ احاطے میں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ٹیکسی کے اوپر جنگلے پر ایک ٹرنک اور بستر رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر سپاہی بیٹھا تھا اور لمبریٹا پر ہیڈ کانسٹیبل کے پیچھے ذکیہ کا خاوند گلاب دین نظر آ رہا تھا۔ یہ بڑی حیران کن صورتِ حال تھی۔ ہم فوراً باہر نکلے۔ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر ذکیہ کے علاوہ اس کی ساس اور بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ اُن سب کے رنگ اُڑے ہوئے تھے اور گلاب دین تو لٹھے کی طرح سفید نظر آ رہا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ ٹیکسی کے پیچھے ہی پیچھے ایک موٹر سائیکل بھی اندر داخل ہوئی۔ موٹر سائیکل پر ایک اے ایس آئی اور رائفل مین بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کا تعلق کسی دوسرے تھانے سے تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل سکوٹر سٹینڈ کر کے ہمارے پاس آیا اور سیلوٹ کر کے بولا۔ ''ان لوگوں کو ہم نے سٹیشن کے قریب سے پکڑا ہے جناب۔ لگتا ہے بھاگ رہے تھے۔''

میں نے گلاب دین کی طرف دیکھا۔ اُس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کا چہرہ ہی بتا رہا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آدھی رات کے وقت یوں خاموشی سے گھر چھوڑنے والا یقیناً بھاگ ہی رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ ''ہم نے اسٹیشن کے قریب گلاب دین کو روکا تو یہ ہم سے اُلجھنے لگا۔ وہ تو شکر ہوا کہ یہ اے ایس آئی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے اور ان کی مدد سے ہم اُسے تھانے لانے میں کامیاب ہو گئے۔''

مت سنگھ نے گلاب دین کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا اور بولا۔ ''اوئے ماں کے

چھنکنے! کہاں بھاگ رہے تھے۔''

ذکیہ روتی ہوئی ٹیکسی سے باہر آئی۔ ''خدا کے لیے ان کو کچھ مت کہو۔ ہم بالکل بے قصور ہیں۔''

''قصوروار اور بے قصور کا پتہ تو ابھی چل جائے گا کاکی۔'' مت سنگھ نے اپنا بھاری بھر کم سر اُوپر نیچے ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔ ''سامان نیچے اتارو اور اچھی طرح تلاشی لو۔''

ٹیکسی کا سامان نیچے اتارا گیا۔ ڈگی میں سے بھی ایک ٹرنک اور دو گٹھریاں برآمد ہوئیں۔ ذکیہ مسلسل آہ وزاری کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ وہ بے قصور ہیں انہیں چھوڑ دیا جائے۔ جب ٹیکسی کی چھت سے اتارے جانے والے بوسیدہ بستر کو کھولا گیا تو سب کی آنکھیں ہی کھلی رہ گئیں۔ لحاف کی تہوں میں ایک تکیے کا غلاف سونے کی اشرفیوں چاندی کے سکوں اور زیورات سے بھرا ہوا تھا......

عین اُس وقت گم صم کھڑے گلاب دین نے جھپٹا مار کر اے ایس آئی کے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا۔ یہ واقعہ اتنی تیزی سے ہوا کہ چند لمحوں کے لیے سب ساکت کھڑے رہ گئے۔ ریوالور کھینچتے ہی گلاب دین نے سب سے پہلے اے ایس آئی کی ٹانگ میں گولی ماری اور پھر دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اور مت سنگھ بے ساختہ اُس کے پیچھے بھاگے۔ اُس نے بھاگتے بھاگتے گھوم کر ایک فائر کیا۔ دھماکے سے شعلہ نکلا اور گولی ہمارے پیچھے کھڑی ٹیکسی کے شیشے میں لگی۔ ایک چھناکے کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ اس کے ساتھ ہی ذکیہ اور بچوں کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دیں۔ رائفل مین نے بھی بھاگتے ہوئے ملزم پر ایک فائر کیا لیکن وہ مزید فائر نہیں کر سکا۔ کیونکہ تھانے کا گیٹ ایک مصروف سڑک پر تھا اور گلاب دین پر چلائی جانے والی گولی کسی راہگیر کو بھی چاٹ سکتی تھی۔

یہ بڑی ہتک کی بات تھی اگر تھانے کے احاطے میں سے ملزم یوں ریوالور چھین کر فرار ہو جاتا۔ میں نے اور مت سنگھ نے پوری قوت سے اُس کا پیچھا کیا۔ میں آگے تھا اور مت سنگھ مجھ سے پانچ چھ قدم پیچھے۔ یہ آدھی رات کا وقت تھا مگر کسی قریبی سینما میں شو ٹوٹا تھا اور سڑک پر آمد و رفت جاری تھی۔ گلاب دین نے تیز رفتار گاڑیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پھرتی سے سڑک پار کی۔ مجھے بھی ایسی ہی تیزی دکھانی پڑی۔ سڑک سے دس پندرہ گز آگے جا کر ملزم پھسل کر گرا اور لڑھکتا ہوا بجلی کے ایک کھمبے سے جا ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کروٹ لے کر سیدھا ہوتا اور مجھ پر گولی چلاتا۔ میں نے اُسے چھاپ لیا۔ سب سے پہلے میں نے اُس کی

ریوالور والی کلائی قابو میں کی اور پھر بلال شاہ والے انداز میں جن چھا مار لیا۔

گلاب دین کو غیر مسلح کرنے کے بعد تھوڑی سی پھینٹی لگائی گئی اور پھر حوالات میں دھکیل دیا گیا۔ ذکیہ مسلسل رو رہی تھی اور اس کی بوڑھی ساس واویلا کرنے میں مصروف تھی۔ ذکیہ نے مجھے پاس بلایا اور آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ ''تھانیدار صاحب! بھائی فقیر ہمارے ہی گھر میں بند ہیں۔ وہ سخت زخمی ہیں۔ آپ ان کی جان بچائیں۔''

یہ اطلاع انکشاف انگیز تھی۔ ہم نے گلاب دین کے اہل خانہ اور ٹیکسی ڈرائیور کو اے ایس آئی کی نگرانی میں چھوڑا اور فوراً ''نویں آبادی'' روانہ ہوئے۔ نشاندہی کے لیے ذکیہ کو ساتھ لے لیا گیا تھا۔ ہماری جیپ ہوشیار پور کی خالی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی قریباً دس منٹ میں گلاب دین کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازے پر تالا لگا تھا۔ ذکیہ نے اپنے آزار بند سے کنجی نکال کر تالا کھولا۔ صحن اور برآمدے کے بلب روشن کیے گئے۔ ایک بڑے کمرے کے اندر سے گزر کر ہم ایک چھوٹے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ یہاں بھی تالا لگا تھا۔ ذکیہ نے یہ تالا بھی کھولا۔ یہ کمرہ ایک تنگ و تاریک سٹور جیسا تھا۔ اس میں بلب نہیں تھا لیکن بڑے کمرے کی روشنی میں اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا......اور یہ منظر حیران کن تھا۔ اس کے منہ میں ایک پرانا کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ فقیرے کے سر پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ ایک گہرا زخم تھا اور کئی روز پہلے اِس زخم سے جو خون فواروں کی صورت چھوٹا تھا وہ فقیرے کی سفید قمیض پر سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہا تھا۔

فقیرے نے نیم وا آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور حلق سے ''غوں غاں'' کی آوازیں نکالنے لگا۔ ذکیہ اُس کے قریب بیٹھ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ اپنی انگلیاں بار بار فقیرے کے بالوں میں پھیر رہی تھی۔ ''مجھے معاف کر دو بھائی...... مجھے معاف کر دو'' اُس کے ہونٹوں سے بار بار یہ الفاظ نکل رہے تھے۔

کچھ عجیب سی حالت ہو رہی تھی ذکیہ کی۔ چہرہ جیسے بخار میں تپ رہا تھا اور آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ یوں لگتا تھا کسی شے نے اُس کے سینے میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ جب پولیس اہلکار فقیرے کی بندشیں کھول رہے تھے ذکیہ روتے ہوئے میری طرف مڑی اور بولی۔ ''تھانیدار جی! بھائی فقیرے کے والد ''میاں جی'' بیماری سے فوت نہیں ہوئے تھے انہیں قتل کیا گیا تھا۔''

یہ اطلاع کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ میں نے غور سے ذکیہ کی طرف دیکھا۔ وہ جذباتی ضرور ہو رہی تھی لیکن پورے ہوش و حواس میں تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

وہ بولی۔ ''ٹھیک کہہ رہی ہوں جناب! میاں جی کو مفلر سے گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا۔''

''کس نے کیا تھا یہ کام؟''

''میرے شوہر نے۔'' ذکیہ نے اعتراف کیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

منظر پولیس ہیڈ کوارٹر کا تھا۔ میٹنگ روم میں ایس پی مسٹر اسمتھ اور ڈی ایس پی کرن کمار کے علاوہ آٹھ دس پولیس اہلکار موجود تھے۔ مجھے اُن کے سامنے اس کیس کی تفصیلات بتانی تھیں۔ درحقیقت چار پانچ دن کے اندر یہ کیس دور ونزدیک مشہور ہو گیا تھا اور ہر کوئی اس کے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا۔ اس مشہوری کی سب سے بڑی وجہ اشرفیوں اور گہنوں سے بھری ہوئی ناند تھی...... قیمتی دفینوں اور ان دفینوں کی باتوں میں دلچسپی لینا شاید انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ہر خطے اور ہر دور میں طالع آزما ایسے چکروں میں رہتے ہیں۔ کہیں فرعونوں کے مقبرے کھودے گئے ہیں اور کہیں صحراؤں کی ریت چھانی گئی ہے۔ کہیں سمندر کی تہہ میں غرقاب جہازوں کو کھنگالا گیا ہے اور کہیں ویران کھنڈروں میں قسمت آزمائی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرتِ انسان نے زمین کے سینے سے معدنیات کے جو خزانے نکالے ہیں، وہ اسی کھوجی فطرت کے سبب نکالے ہیں۔

میٹنگ روم میں ہر کوئی یہ جاننے کا خواہش مند تھا کہ ناند کس نے دفن کی کس نے نکالی اور کیونکر نکالی؟ میں نے یہ روداد شروع سے سناتے ہوئے بتایا کہ یہ ناند قریباً بیس برس پہلے اللہ جوایا نام کے ایک پیسے والے لیکن ان پڑھ شخص نے شاہ کوٹ کی بارہ دری کے قریب زمین میں دبائی تھی۔ ان انیس بیس برسوں میں وہ کئی بار ہوشیار پور سے شاہ کوٹ پہنچا اور بڑی رازداری سے زمین کھود کر ناند کی موجودگی کی تسلی کرنے کے علاوہ اُس نے دوبارہ اپنی ضروریات کے لیے ناند سے رقم بھی نکالی۔ خاندان میں اللہ جوایا کو میاں جی کہا جاتا تھا۔ میاں جی کے اکثر عزیزوں کو شک تھا کہ انہوں نے اپنی جمع پونجی کہیں دفن کر رکھی ہے اور اُس جگہ کا پتہ اُن کے چھوٹے بیٹے فقیر محمد کو ہے۔ لیکن یہ بات بھی غلط تھی۔ میاں جی نے بیٹے کو بھی ناند کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا شاید وہ اس کے لیے کسی بہتر موقعے کا انتظار کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بیٹے کو صرف اتنا اشارہ دیا تھا کہ ناند اُس کے نانا کے گھر کے پچھواڑے درختوں میں دفن ہے......

فقیرے کی منہ بولی بہن ذکیہ ہے۔ ذکیہ اپنے شوہر گلاب دین کے ساتھ نویں آبادی کے قریب کرائے کے مکان میں رہتی ہے۔ جہاں میاں جی کے کئی عزیزوں کو ناند کے بارے میں تجسس تھا، وہاں گلاب دین کو بھی تھا۔ گلاب دین ایک اُجڈ اور بے حد لالچی شخص ہے۔ گھر کے قریب ہی اُس کی دودھ دہی کی چھوٹی سی دکان ہے۔ اکثر لڑائی جھگڑے بھی کرتا رہتا ہے۔ ایک برس پہلے جوئے کی بیٹھک میں اُس کا ایک عادی جواری سے جھگڑا ہو گیا اور اس جھگڑے میں جواری کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ نتیجے میں گلاب دین پر کیس چلا جو ابھی تک زیر سماعت ہے۔

گلاب دین نے جب سے میاں جی کی ناند کے بارے میں سنا تھا اسے ایک بے قراری سی لاحق ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بیوی یعنی فقیرے کی منہ بولی بہن کے ساتھ اکثر فقیرے کے گھر جاتا رہتا تھا۔ وہاں میاں جی سے بھی ملاقات ہوتی۔ وہ کبھی ہنسی مذاق میں اور کبھی سنجیدگی کے ساتھ انہیں ''ناند'' کے بارے میں ٹٹولتا لیکن میاں جی بھی ایک کایاں تھے وہ ایسی باتوں میں بھلا کہاں آتے۔ ایک دو بار انہوں نے گلاب دین کو رُکھائی سے بھی جواب دیا تاکہ وہ اس ذکر کو بار بار نہ چھیڑے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ گلاب دین دراصل کس قماش کا شخص ہے اور اندر ہی اندر اُس میں کیا لاوا پک رہا ہے۔ وہ اپنی طرف قدم قدم سرکتے ہوئے مہیب خطرے سے بے خبر رہے۔ یہاں تک کہ وہ تاریک رات پہنچ گئی جس کی بے رحم سیاہی نے انہیں ایک بلا کی طرح جکڑ لیا اور یوں بے بس کیا کہ وہ زندوں میں رہے اور نہ مُردوں میں اور پھر کربناک چہرے اور کھلی آنکھوں کے ساتھ کمرے کے ٹھنڈے فرش پر پڑے رہ گئے...... وہ ایک بہت سرد اور خاموش رات تھی۔ فقیرا امرتسر میں تھا وہ مہینے میں دو تین بار ہی ہوشیار پور آتا تھا۔ گھر میں فقیرے کی بیوی سلطانہ اُس کے بچوں اور میاں جی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ نصف شب کے بعد گلاب دین نے دیوار پھاندی اور خاموشی سے گھر میں گھس آیا۔ اُس کے پاس بھرا ہوا پستول تھا اور اُس نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے سلطانہ کو جگایا اور پستول دکھا کر اُس کو دوسرے کمرے میں لے آیا جہاں میاں جی سو رہے تھے۔ اُس کے پاس ایک مضبوط رسی بھی تھی۔ اُس نے سلطانہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے سسر کو رسی کے ساتھ چارپائی سے باندھ دے۔ اسی دوران میاں جی جاگ گئے لیکن گلاب دین کے ہاتھ میں پستول اور آنکھوں میں خون دیکھ کر انہیں شور مچانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ سلطانہ کو گلاب دین نے اس حد تک خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ معمول کی طرح اُس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ اُس نے میاں جی کو چارپائی کے ساتھ باندھ دیا۔ اس

دوران گلاب دین پستول تانے اُس کے سر پر کھڑا رہا اور خوفناک دھمکیاں دیتا رہا۔

میاں جی بندھ چکے تو گلاب دین نے اُن سے ناند کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کی۔ پہلے تو میاں جی انکار کرتے رہے کہ انہوں نے کہیں کوئی شے نہیں چھپا رکھی لیکن جب بھرے ہوئے گلاب دین نے اُن کی جواں سال بہو کو اُن کے سامنے زمین پر گرا لیا اور اُن کے کپڑوں کے چیتھڑے اُڑانے لگا تو وہ گلاب دین کی منتیں سماجتیں کرنے لگے۔ مگر یہ سب منتیں سماجتیں بے کار گئیں اور گلاب دین نے جو انسان سے زیادہ حیوان نظر آ رہا تھا پستول کے زور پر سلطانہ کو بے آبرو کر دیا۔ پھر وہ غرا کر بولا ''بڈھے ابھی تُو نے کچھ نہیں دیکھا میں پہلے تیری بہو کو اور پھر پوتی کو تیرے سامنے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ جب وہ معصوم بچی کو دبوچ کر کمرے میں لایا تو دادے کی ہمت جواب دے گئی۔ اُس نے گلاب دین کو سب کچھ بتا دیا۔ ہر وہ بات بتا دی جو وہ شیطان پوچھنا چاہتا تھا لیکن یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی گلاب دین نے بدنصیب شخص کو معاف نہیں کیا۔ غالباً اپنی کارروائی کے دوران ہی اُس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ ان لوگوں کو زندہ چھوڑ کر چلا گیا تو اُس کا راز راز نہیں رہ سکے گا۔ اُس پر خون سوار ہو چکا تھا لہٰذا ان تین جانوں کو ختم کرنا اُسے کوئی زیادہ کٹھن کام نظر نہیں آیا۔ اُس نے سلطانہ اور اُس کی بچی کو ساتھ والے کمرے میں بند کیا اور پہلے ''میاں جی'' کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا۔ کمرے کی بتی بجھا کر اُس نے اپنے شکار کے گلے میں مفلر کا پھندا ڈالا اور اس وقت تک زور لگاتا رہا جب تک جسم روح سے آزاد نہیں ہو گیا۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں سلطانہ اور بچی کے پاس آیا۔ سلطانہ اُس کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک دیکھ چکی تھی اور یہ بھی جان چکی تھی کہ اس وحشی نے دوسرے کمرے میں اُس کے سسر کی جان لے لی ہے۔ اپنی اور اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے وہ اُس کی منتیں سماجتیں کرنے لگی۔ اُس نے بڑی بڑی قسمیں کھا کر عہد کیا کہ وہ اُن دونوں کی جان بخش دے تو وہ ہمیشہ خاموش رہے گی۔ جو کچھ ہوا ہے اُس کے بارے میں کسی کو ایک لفظ نہیں بتائے گی۔ پوری زندگی یہ راز اُس کے سینے میں دفن رہے گا۔ اُس نے کہا کہ اُس کا سسر بیمار تھا۔ کل شام اُس پر دمے کا شدید حملہ ہوا تھا۔ وہ کہہ دے گی کہ وہ دمے کی وجہ سے فوت ہوئے ہیں...... وہ بہت دیر یونہی گلاب دین کے سامنے آہ و پکار کرتی رہی۔ نہ جانے گلاب دین کے دل میں کیا آئی کہ وہ ماں بچی کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس نے سلطانہ کا ہاتھ بچی کے سر پر رکھوا کر بڑی سخت قسم لی کہ وہ اس واقعے کے بارے میں ہمیشہ اپنے ہونٹ بند رکھے گی اور اپنے سسر کے بارے میں لوگوں کو وہی کچھ بتائے گی جو وہ کہہ رہی ہے...... بعدازاں اُس نے میاں جی کا مردہ جسم

چارپائی سے کھول کر دروازے کے قریب فرش پر ڈال دیا۔ تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ وہ دمے کے دورے میں گر کر ہلاک ہوئے ہیں۔

جونہی فقیرے کے والد کی رسم قل ادا ہوئی گلاب دین شاہ کوٹ پہنچ گیا۔ اُس نے مطلوبہ جگہ تلاش کی اور رات کی تاریکی میں وہاں کھدائی کر کے ناند سے سارا سونا چاندی نکال لیا۔ کھدائی کے لیے اُس نے لوہے کی کھرپی استعمال کی تھی۔ کھدائی کے دوران یہ کھرپی ٹوٹ گئی اور گلاب دین جلدی میں اُسے وہیں چھوڑ آیا۔ بعدازاں یہ کھرپی ہمارے لیے بہت مددگار ثابت ہوئی۔ اب کھرپی کی وجہ سے مجھے گلاب دین پر شک ہوا اور میں نے سادہ پوش کے ذریعے اُس کی نگرانی کرانے کا فیصلہ کیا۔

گلاب دین کو توقع نہیں تھی کہ ناند والی جگہ کی دوبارہ کھدائی ہو گی اور وہاں سے برآمد ہونے والی کھرپی کے سبب فقیرا اُس کے بارے میں شک کرنے لگے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ گڑھے سے کھرپی برآمد ہونے کے بعد جلد ہی فقیرے کا دھیان گلاب دین کی طرف چلا گیا تھا۔ لیکن گلاب دین اُس کی منہ بولی بہن کا شوہر تھا۔ اُس نے گلاب دین کا نام پولیس کو بتانے کی بجائے پہلے خود ''پرچول'' کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ہوشیار پور پہنچا اور ایک رات اپنے بھائی خدا بخش کے گھر رہنے کے بعد گلاب دین سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔ وہ دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ اس کا اندیشہ غلط نکلے اور اس کی منہ بولی بہن کا سہاگ اس معاملے میں ملوث نہ ہو لیکن یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ گلاب دین کے گھر علیٰحدہ کمرے میں جب فقیرے نے گلاب دین سے بات چیت کی تو خود بخود بات کھلنی شروع ہو گئی۔ فقیرے کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ گلاب دین کی ''اصل'' کتنی خطرناک ہے اور وہ اس سے پوچھ گچھ کر کے اپنے لیے کیا خطرات پیدا کر رہا ہے۔ جب گلاب دین نے خود کو پھنستے دیکھا تو فقیرے پر بھی جھپٹ پڑا۔ اُس نے نمک مرچ پیسنے والے ڈنڈے کی شدید ضرب فقیرے کے سر پر لگائی اور اُسے بے ہوش کر ڈالا۔ بعدازاں اسے گھر کی ایک تاریک کوٹھڑی میں رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ وہ تیرہ روز مسلسل اُس چارپائی سے جکڑا پڑا رہا۔ ضروری حاجات کے لیے اُس کی چارپائی کے نیچے لوہے کی بالٹی رکھ دی جاتی تھی۔ اس کے سر کا زخم خراب ہو گیا اور اُسے شدید بخار رہنے لگا۔ فقیرے کی منہ بولی بہن ذکیہ تمام حالات سے آگاہ ہو چکی تھی اور یہ خیال اُس کے لیے سوہانِ روح تھا کہ اُس کا بھائی اُس کے اپنے ہی گھر میں قیدیوں کی طرح پڑا زندگی کے لیے سسک رہا ہے۔ ایک طرف اُس کا شوہر تھا اور دوسری طرف بھائی۔ وہ رشتوں کے ایک سنگین دوراہے پر کھڑی تھی۔ بھائی کی ہمدردی کرتی تو سہاگ پھانسی پر جھولتا نظر آتا تھا۔

سہاگ کی خاطر لبوں پر مہر لگا لیتی تو بھائی کی جان جاتی تھی۔ آخر وہ عورت تھی۔ اُسے بچپن سے بتایا گیا تھا کہ شوہر کیسا بھی ہو مجازی خدا ہوتا ہے۔ ڈولی پر سوار ہوتے وقت اُس کے کانوں میں پھونکا گیا تھا کہ اب شوہر کا رشتہ اُس کے لیے سب سے مقدم ہے۔ سسرال کے صحن سے اب اُس کا جنازہ ہی اٹھنا چاہیے...... اُس نے جیتے جی خود کو ''جنازہ'' سمجھ لیا اور دل پر پتھر رکھ کر وہ کچھ کرنے لگی جو اُس کا شوہر کہتا تھا...... یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ گلاب دین نے فقیرے کو زندہ رکھنے کا خطرہ کیوں مول لیا۔ وہ اُسے قتل بھی کر سکتا تھا۔ یقیناً کر سکتا تھا اور شاید ذکیہ کی تمام منت ساجت کے باوجود کر بھی دیتا لیکن اُسے قتل کیے بغیر بھی اُس کا مسئلہ حل ہو رہا تھا۔ وہ ہوشیار پور چھوڑ کر آزاد قبائلی علاقے میں آباد ہونے کا پکا پروگرام بنا چکا تھا۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ گلاب دین کے ننھیالی رشتے داروں میں ایک دو پختون گھرانے بھی شامل ہیں اور وہ لوگ خیبر ایجنسی میں کہیں رہتے ہیں۔ بہرحال تمام انتظام مکمل تھا۔ سوموار کی رات کو گلاب دین نے گھر کا ضروری سامان سمیٹا اور بیوی بچوں کے ساتھ خاموشی سے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر سے نکلتے وقت ذکیہ نے پانی کی نکاسی کا راستہ بند کر کے سارے نلکے کھول دیئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ جب رات پچھلے پہر پانی آئے تو نلکوں میں سے نکلنے لگے اور گٹر بند ہونے کے سبب گلی میں بہنے لگے۔ دو تین گھنٹے پانی یونہی بہتا رہتا تو تنگ گلی تالاب بن جاتی۔ مجبوراً کسی کو دیوار پھاند کر گھر میں گھسنا پڑتا اور نلکے بند کرنے کے دوران اُسے پتہ چل جاتا کہ ایک زخمی یہاں قید ہے۔''

میں نے مکمل رپورٹ پیش کر دی تو افسران نے مختلف سوال پوچھے۔ میں پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا اس لیے تسلی بخش جواب دیے۔ یوں یہ میٹنگ برخاست ہو گئی۔

☆======☆======☆

اب صورتِ حال پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ فقیرے کی بیوی کو لگی ہوئی چُپ کا سبب بھی سامنے آ گیا تھا۔ وہ نہ بیمار تھی اور نہ اُس پر کسی نے تعویذ کر رکھے تھے۔ وہ ایک ایسے عذاب سے گزری تھی جس نے اُسے گنگ کر دیا تھا۔ وہ کس دل سے اپنے شوہر کے گلے لگتی اُس کی محبت کا جواب محبت سے کیسے دیتی۔ اُس کا وجود تو اُس کے لیے ایک گالی بنا ہوا تھا۔ اُس کے دل میں اپنے سسر کی موت کا خونی راز تھا اور اُس کی آنکھوں میں ایک تاریک رات کے دلخراش منظر نقش تھے۔ اُسے چپ نہ لگتی تو کیا ہوتا۔ یہ اُس کا حوصلہ تھا کہ وہ سب کچھ سینے میں چھپا کر زندہ تھی۔ خود پر ہونے والی زیادتی کے دو ڈھائی ماہ بعد اُس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا۔ شاید اس بچے کی موت کا ''ذمے دار'' بھی گلاب دین ہی تھا۔ ایک

روز میں خاص طور پر اُس سے ملنے کے لیے شاہ کوٹ سے ہوشیار پور گیا۔ جب میں اُس کے دروازے پر پہنچا تو اُس کا شوہر فقیرا بھی میرے ساتھ تھا۔ ایک ہفتہ ہسپتال میں گزارنے کے بعد وہ صحت یاب ہو چکا تھا۔ جب سے سلطانہ ناراض ہو کر میکے آئی تھی وہ پہلی بار اُس سے ملنے آیا تھا۔ ہمیں گھر کی بیٹھک میں بٹھایا گیا۔ پہلے سلطانہ کے غمزدہ باپ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک سکول ٹیچر تھا۔ پھر میرے کہنے پر سلطانہ کو بھی بلا لیا گیا۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھی اور چہرے پر لمبا سا گھونگھٹ تھا۔ دو سال کی ایک پیاری سی بچی اُس کی گود میں تھی۔ میں نے اُسے کہا۔ ''دیکھو تم مجھے تھانیدار نہیں اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ اگر یہ گھونگھٹ تم پردے کے لیے نکالتی ہو تو ٹھیک ہے لیکن اگر کسی شرمندگی کی وجہ سے نکال رکھا ہے تو اسے ہٹا دو، تمہیں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے تمہیں شرمندہ ہونا پڑے۔ شرمندہ وہ ہو گا جسے اپنے کرتوتوں کی سزا پانے کے لیے تختہ دار کی سیڑھیاں چڑھنی پڑیں گی۔ میرا وعدہ ہے تم سے...... میں تمہیں اس کی لاش ایسی حالت میں دکھاؤں گا کہ اُس کی گردن ایک فٹ لمبی ہو چکی ہو گی......''

سلطانہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی، پھر ایک دم اُس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔ اُس کی ہچکیاں بلند ہوتی چلی گئیں۔ اُس کے ساتھ اُس کی بچی بھی رونے لگی۔ دونوں ماں بیٹی اس قدر روئیں کہ سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یوں لگا کہ اُس رات ایک بدبخت کے ہاتھوں اُن دونوں پر جو بیتی تھی وہ اُس کا شکوہ اپنے پیاروں سے آج کر رہی ہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ سلطانہ کی رُوح پر جمی ہوئی خاموشی کی برف پگھل رہی ہے۔

......فقیرا سلطانہ سے واقعی محبت کرتا تھا۔ اُس نے اس کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ایک دو ہفتوں میں سلطانہ کی حالت سنبھلنے لگی۔ اُس کی سب سے بڑی بیماری اُس کے دل کا بوجھ تھا۔ جب یہ بوجھ کم ہوا تو بیماری سمٹنے لگی۔ فقیرے نے ایک عقلمندی یہ کی کہ ہوشیار پور چھوڑ کر لاہور چلا گیا۔ باپ کا نصف ترکہ اُسے مل چکا تھا۔ یہ نصف ترکہ بھی 300 تولہ سونے اور سات سو تولہ چاندی سے کم نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں فقیر محمد اب ''امیر محمد'' بن چکا تھا۔ اُس میں اور شاہ کوٹ کے ویرانے میں گھومتے ہوئے بدحال شخص میں اب زمین آسمان کا فرق تھا۔ اُس نے لاہور میں اپنا ذاتی مکان لے لیا اور وہیں کاروبار شروع کرنے کے لیے پلاٹ خرید لیا۔ اپنے ماحول سے دور ہو کر سلطانہ جلد ہی نارمل ہو گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کرنے کا موقع مجھے ملا۔ سیشن اور ہائی کورٹ میں

دوسالہ کارروائی کے بعد گلاب دین ولد محمد بوٹا کو سزائے موت ہوئی اور جولائی 1944ء کی حبس زدہ صبح کو اُسے ڈسٹرکٹ جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ اگر سلطانہ چاہتی تو وہ اپنے مجرم کی ایک فٹ لمبی گردن دیکھ سکتی تھی کیونکہ اُسے یہ منظر دکھانے کے لیے میں نے جیل پولیس کے ایک انسپکٹر سے پیشگی بات کر لی تھی لیکن سلطانہ جیل آنے کی ہمت نہیں کر سکی اور غالباً یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اُس کے پرانے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے۔

...... یوں وہ کہانی جو شوخ جمیلہ کے جھوٹ اور فقیرے کے غلط علاج سے شروع ہوئی تھی۔ شاہ پور کی بارہ دری میں بھٹکنے کے بعد ہوشیار پور کے شیر فروش تک پہنچی اور رات کے آخری پہر ڈسٹرکٹ جیل کے پھانسی گھاٹ پر ختم ہو گئی۔

☆======☆======☆

کون دوست کون دشمن

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جس میں اے ایس آئی تھا۔ لاہور میں ان دنوں روپ کے شوری فلم اسٹوڈیو بہت مشہور تھا۔ یہاں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی اور کئی کئی فلموں کی بیک وقت شوٹنگ ہوتی تھی۔ فلمیں بنانے والے اور اُن میں کام کرنے والے اکثر ہندو ہوتے تھے لیکن اُن میں کہیں کہیں مسلمان اور سکھ بھی نظر پڑ جاتے تھے۔ فلم لائن والے عموماً اچھے لوگ ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی اُن میں جرائم پیشہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جس کے سبب اسٹوڈیوز میں جرائم کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلم اسٹوڈیوز اور فلم والوں پر پولیس کو گہری نظر رکھنا پڑتی ہے۔ اب کا حال تو ٹھیک طرح معلوم نہیں لیکن میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس وقت بمبئی، گجرات اور لاہور کے فلم اسٹوڈیوز میں عموماً پولیس کے مخبر موجود ہوتے تھے۔ یہ مخبر یا ''انفارمر'' اکثر مقامی لوگوں میں سے ہی ہوتے ہیں تاہم کبھی کبھی پولیس اہلکار بھی رُوپ دھار کر کسی محکمے یا ادارے میں شامل ہو جاتے ہیں اور ''انفارمر'' کی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔

اُن دنوں میں بھی ''انفارمر'' کے طور پر روپ کے شوری اسٹوڈیو میں تعینات تھا۔ اسٹوڈیو میں ایک مسلمان پروڈیوسر اللہ دتہ صاحب کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں اے ایس آئی ہوں اور میرا کام اسٹوڈیو میں آنے جانے والے لوگوں پر نگاہ رکھنا ہے۔ میں دن کا زیادہ وقت اللہ دتہ صاحب کے دفتر میں گزارتا تھا۔ اسٹوڈیو والے یہی جانتے تھے کہ دتہ صاحب نے مجھے دفتری کاموں کے لیے رکھا ہوا ہے۔ دتہ صاحب کے ملنے جلنے والے میری عزت کرتے تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ میں تھانے کچہری کے کاموں کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور وقت پڑنے پر اُن کی مدد کر سکتا ہوں۔ اسٹوڈیوز میں مجھے جاوید عمر کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

ایک روز علی الصبح میں اسٹوڈیو پہنچا تو اللہ دتہ صاحب سخت پریشان نظر آئے۔ چھوٹتے ہی بولے۔ ''نواز خان! میرے ساتھ پندرہ ہزار روپے کا گھپلا ہو گیا ہے۔ کل دوپہر کے بعد دو موٹر سائیکل سوار لڑکے دفتر آئے۔ انہوں نے میرے اسسٹنٹ ذکی احمد کا نام لیا اور کچھ ایسی باتیں کیں کہ مجھے اُن پر سو فیصد اعتبار آ گیا۔ میں نے انہیں رقم دے دی۔ اب اُن کا کوئی پتہ

نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ذکی صاحب کیا فرماتے ہیں؟''

اللہ دتہ صاحب بولے۔ ''وہ سرے سے انکار کر رہا ہے کہ اس نے کوئی آدمی بھیجا تھا۔''

میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''دتہ صاحب! آپ نے ابھی پوری بات بتائی نہیں۔ شاید آپ کچھ ہچکچا رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے...... آپ نے دو اجنبیوں کو پندرہ ہزار روپیہ تھمایا ہوگا تو کسی بات پر تھمایا ہوگا۔ آپ جیسے دانا بینا آدمی سے ایسی غلطی ہونے لگے تو پھر ہم جیسوں کو تو لوگ بیچ کر کھا جائیں۔''

اللہ دتہ صاحب نے اپنی کش مکش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''نواز میاں! دراصل معاملہ کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ ذکی احمد پر مجھے پورا اعتبار ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا کام نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے پولیس میں اطلاع نہیں دی...... لیکن اُلجھن یہ ہے کہ کل دوپہر ذکی نے خود ٹیلی فون پر مجھ سے کہا تھا کہ مجھے شوٹنگ کے سلسلے میں بازار سے کچھ سامان خریدنا ہے اور اس کے لیے پندرہ ہزار روپے درکار ہیں۔ میں دو لڑکوں وحید اور عثمان کو بھیج رہا ہوں اُن کے ہاتھ پیسے پہنچا دیں۔''

میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ کی بات سمجھ میں آ رہی ہے...... اس کا مطلب ہے ذکی اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہے۔''

''لیکن وہ تو کہتا ہے کہ اُس نے کل سرے سے مجھے ٹیلی فون ہی نہیں کیا۔ اُس کا کہنا ہے کہ مجھے دھوکا ہوا ہے۔ بلکہ ابھی غصے میں یہاں تک کہہ رہا تھا کہ میں نے نشہ کر رکھا ہوگا۔ جب کہ میں نے کل ایک گھونٹ نہیں پی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے کل نشے کو ہاتھ نہیں لگایا، اُس نے ٹیلی فون کو ہاتھ نہیں لگایا، پھر یہ گڑبڑ کہاں ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی بجائے اُس نے نشہ کر رکھا ہو؟''

''مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ کہہ کے گیا تھا کہ مجھے بلال گنج سے لوہے کا بہت سا سامان خریدنا ہے۔ میرا خیال ہے گھر میں نشہ کر کے پڑا رہا ہوگا...... ویسے اس بات کا مجھے یقین ہے کہ بقائمی ہوش وحواس وہ ہیرا پھیری نہیں کر سکتا۔ ہزاروں کا لین دین اُس کے ہاتھ سے ہوتا ہے بلکہ کئی بار تو میں اُسے سیف کی چابیاں بھی سونپ جاتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''واقعی کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو اُس کی آواز پہچاننے میں دشواری ہوئی ہو۔''

اللہ دتہ صاحب قدرے جھنجھلا کر بولے۔ ''یار! تم کیسی بات کر رہے ہو۔ وہ دو میل دور

سے بول رہا تھا اور مجھے صاف آواز آ رہی تھی۔ پھر مجھ سے پہلے میرے ملازم روشن خاں نے اُس سے بات کی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ ذکی صاحب کا فون ہے۔'' بات ختم کرتے ہی اللہ دتہ صاحب روشن خاں کو آوازیں دینے لگے۔ دوسری آواز پر لمبا تڑنگا روشن خاں جھک کر سلام کرتا ہوا اندر آ گیا۔ میرے سامنے دتہ صاحب نے اُس سے کل کی ٹیلی فون کال کے بارے بات کی۔ روشن خان نے سینے پر ہاتھ مار کر پورے وثوق سے کہا کہ بولنے والا ذکی احمد ہی تھا۔ روشن خان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ہمیشہ سچ بولنے والا شخص ہے اور نہایت حاضر دماغ بھی۔

اتنے میں دفتر سے باہر موٹر سائیکل رُکنے کی آواز آئی۔ دتہ صاحب نے کھڑکی سے جھانکا اور بولے۔ ''ذکی آ رہا ہے۔ تم اس پر کسی شبہے کا اظہار نہ کرنا۔ اس موقع پر کوئی بھی رائے قائم کرنا مناسب نہیں۔''

ذکی چوبیس پچیس سال کا جوان تھا۔ رنگ سفید بال گھنگھریالے اور جسم دبلا پتلا تھا۔ چہرے مہرے سے اسسٹنٹ ہی لگتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہ جوا وغیرہ بھی کھیلتا ہے۔ وہ تیز قدموں سے دفتر کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید اس کا نشہ پوری طرح اُتر چکا ہے اور اب وہ دتہ صاحب سے کہنے آیا ہے کہ...... ہاں کل اُس نے روپے منگوائے تھے۔ مگر میرا یہ قیاس غلط ثابت ہوا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل گئے۔ اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ دتہ صاحب نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''جاوید کو کسی نے کل کے واقعے کے بارے بتایا تھا۔ میری طرح اسے بھی سخت حیرانی ہے۔''

ذکی احمد پریشان لہجے میں بولا۔ ''جناب میں تو عاجز آ گیا ہوں۔ جہاں جاتا ہوں یہی قصہ چھڑا ہوتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اسٹوڈیو ہی چھوڑنا پڑے گا۔''

اللہ دتہ صاحب اپنے مخصوص انداز میں اُسے دلاسہ دینے لگے۔ ذکی احمد بیزار بیزار سا سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

☆======☆======☆

اُسی روز رات کے ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف دتہ صاحب تھے۔ اُن کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔

بولے۔ ''نواز! چور کا پتہ چل گیا ہے۔ تم اس وقت ماڈل ٹاؤن میرے گھر پہنچو۔''

میں نے کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دتہ صاحب! اتنی رات گئے اور میری گاڑی بھی ٹھیک نہیں۔''

وہ بولے۔ ''اچھا ٹھیک ہے میں تمہیں فون پر ہی بتا دیتا ہوں۔ یہاں اسٹوڈیو میں ابدال نامی ایک لڑکا ہے۔ سب اُسے آٹوگراف کے نام سے پکارتے ہیں......''

میں نے کہا۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔ وہ اسٹوڈیو کے سامنے چائے کی دکان بھی کرتا رہا ہے۔''

''ہاں بالکل وہی۔'' دتہ صاحب تیزی سے بولے۔ ''تمہیں معلوم ہو گا وہ ڈبنگ بھی کرواتا ہے اور کئی دوسرے اداکاروں کی آوازیں کامیابی سے نکال لیتا ہے......''

اچانک ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے اُسی لڑکے نے کل آپ سے بات کی تھی۔''

''سو فیصد یہی ہوا ہے۔'' دتہ صاحب نے کہا۔ ''یہ بات ابھی لیٹے لیٹے میرے ذہن میں آئی ہے۔ وہ خانہ خراب زبردست نقال ہے۔ ذکی کی آواز بنا لینا اُس کے لیے بالکل مشکل نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں ذکی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ کسی طرح اُسے پتہ چل گیا ہو گا کہ ذکی سامان خریدنے نکلا ہوا ہے۔ ایسے میں اُسے مزید رقم کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور میں باآسانی اُس کی کال کا اعتبار کر سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اب کیا کرنا چاہیے۔''

دتہ صاحب بولے۔ ''میاں شبہے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ پوری ''لائن'' میں آوازوں کے دو ہی نقال ہیں۔ ایک تو پچھلے مہینے سے یونٹ کے ساتھ سنگاپور گیا ہوا ہے۔ دوسرا یہ حرام زادہ آٹوگراف ہے...... تم فوراً اپنے ڈی ایس پی سے ملو اور اُسے گرفتار کراؤ۔''

میں نے کہا۔ ''دتہ صاحب! ہمیں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ''آٹوگراف'' مجرم ہے تو میں اُسے بھاگنے نہیں دوں گا...... میں چاہتا ہوں کہ پرچہ کٹانے سے پہلے اُس سے مل کر تھوڑی سی تفتیش کر لوں۔ بعد میں آسانی رہے گی۔'' (درحقیقت مجھے یہ معاملہ فلمی سا لگ رہا تھا)

دتہ صاحب نے جوش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... ٹھیک ہے تم اس بارے میں بہتر سمجھتے ہو۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں یہ کام اُس خبیث کے علاوہ اور کسی کا نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جناب! آپ گھبرائیں نہیں۔ کل تک سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔''

...... اگلے روز علی الصبح میں نے ابدال احمد عرف آٹوگراف کو اُس کے رہائشی کوارٹر میں جا

لیا۔ اس نیم تاریک کوارٹر میں وہ اپنے کچھ ایکسٹرا دوستوں کے ساتھ مقیم تھا۔ پانچ چھ سو روپیہ کرایہ ہوگا جو سب مل ملا کر چکا دیتے ہوں گے۔ رات کسی شوٹنگ کے جاگے ہوئے یہ مست حال لڑکے گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے آٹو گراف کو جگایا تو وہ میری آمد پر بھونچکا رہ گیا۔ آٹو گراف کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم ایکسٹرا اداکاروں کی طرح فاقہ زدہ مگر چہرے پر ایک طرح کی معصومیت تھی۔ پیشانی پر بال تھوڑے سے اڑے ہوئے تھے۔ وہ مختلف اسٹوڈیوز میں اکثر گھومتا پھرتا نظر آ جاتا تھا۔ پروڈیوسروں کی خوشامدیں کرتا۔ ہدایت کاروں کی گاڑیوں کے دروازے کھولتا اور سینئر اداکاروں کی مٹھی چاپی کرتا۔ وہ ایک کامیاب نقال اور معروف ایکسٹرا اداکار تھا مگر اس کی اُجرت اتنی ہی تھی جتنی ایک راج مزدور کی ہوتی ہے۔ اُس کے چاروں طرف غربت کی دلدل تھی اور وہ ایکسٹرا سے ''ایکسٹرا آرڈینیری'' بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر تھوڑا سا خوف جھلکنے لگا۔ وہ اللہ دتہ صاحب کے ساتھ ہونے والے فراڈ کے متعلق جانتا تھا۔ میں نے اس حوالے سے بات آگے بڑھائی اور اُسے بتایا کہ اس سلسلے میں اُس پر شبہہ کیا جا رہا ہے۔ آٹو گراف کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ وہ بے ڈھنگے انداز میں اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ اُس کی باتوں میں مجھے کوئی خاص وزن محسوس نہیں ہوا۔ شاید اس بے وزنی کی وجہ اُس کی بدحواسی تھی۔ اُس کی آواز بھی مجھے کچھ پھٹی پھٹی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ابتدائی پوچھ گچھ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ مسئلہ تھانے پہنچ کر ہی حل ہو گا۔ میں جاوید عمر کی حیثیت سے ملزم کو تھانے لے جا سکتا تھا اور نہ اُس سے پوچھ گچھ کر سکتا تھا۔ میں نے آٹو گراف نامی اس لڑکے کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لیا اور سید ھادتہ صاحب کے گھر واقعہ ماڈل ٹاؤن پہنچ گیا۔ وہاں سے میں نے اپنے ڈی ایس پی دلجیت کمار کو فون کیا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ ایک سب انسپکٹر کو ضروری کارروائی کے لیے بھیج دیں۔ پندرہ ہزار اُن دنوں خاصی بڑی رقم تھی۔ ڈی ایس پی کو فوراً نوٹس لینا پڑا...... قصہ مختصر دوپہر سے پہلے پہلے ابدال عرف آٹو گراف حوالات میں پہنچ گیا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اُس پر ترس آ رہا تھا۔ میں نے سب انسپکٹر سے خاص طور پر سفارش کی کہ دورانِ تفتیش ملزم پر ہاتھ ''ذرا نرم'' رکھا جائے۔

میں دو بجے دوپہر اسٹوڈیو پہنچا اور اُس وقت وہ ٹیلی فون کال موصول ہوئی جس نے اس کیس کو ایک بالکل نیا رُخ دے دیا۔ یہ کال ایک ایسے شخص کی طرف سے تھی جس کی ہدایات کو نظرانداز کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کردار کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ کال کرنے والے نے اپنے اس شبہے کا اظہار کیا کہ تھوڑی دیر پہلے گرفتار ہونے والا شخص ابدال عرف آٹو

گراف مجرم نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے چاہیے کہ میں ذاتی طور پر اس معاملے کی تفتیش کروں اور کسی بے گناہ کو سزا نہ ہونے دوں۔ ہاں اگر جرم ثابت ہوتا ہے تو پھر کسی کی طرفداری کی ضرورت نہیں۔

مجھے یہ معاملہ خاصا اُلجھا ہوا اور پُراسرار لگ رہا تھا۔ اُس روز شام کو میں اسٹوڈیو کے سامنے والے بازار میں مجید پہلوان کے پاس پہنچا۔ مجید پہلوان ایک ''ایکسٹرا سپلائر'' تھا۔ خاصا زیرک شخص تھا اور پہلوان ہونے کے باوجود پڑھے لکھوں جیسی گفتگو کرتا تھا۔ آٹو گراف نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بتایا تھا کہ جمعرات کے روز جس وقت ذی شان فلمز کے دفتر میں واردات ہوئی۔ وہ مجید پہلوان کے ساتھ تھا اور ایک پنجابی فلم کے سیٹ پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ مجید پہلوان نے آٹو گراف کے بیان کی تصدیق کی اور بتایا کہ واردات کے روز آٹو گراف سیٹ پر موجود تھا اور دس پندرہ دوسرے افراد بھی اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''مجید پہلوان! اس تصدیق سے بھی کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس واردات میں آٹو گراف کا کردار صرف اتنا ہے کہ اُس نے ایک ٹیلی فون کال کی ہے۔ یہ کال وہ کسی بھی وقت کر سکتا تھا۔ پیشاب کرنے کے بہانے، چائے پینے کے بہانے...... یا کسی اور کام کی آڑ میں۔ اگر اُس نے اسٹوڈیو کے باہر کال کی ہو تو بھی زیادہ سے زیادہ دس منٹ درکار تھے۔

مجید پہلوان نے اُلجھن سے کہا۔ ''جناب یہ پیسے کا معاملہ ہے۔ میں یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بہرحال اتنا ضرور کہوں گا کہ اُس روز جو شوٹنگ ہو رہی تھی اس میں کسی ایکسٹرا کے لیے فلور سے باہر نکلنے کے مواقع بہت کم تھے۔ مسلسل شاٹ ہو رہے تھے۔ ڈائریکٹر نے سب کو ''ریڈی'' رکھا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''کتنے ایکسٹرا حصہ لے رہے تھے۔''

وہ بولا۔ ''دس لڑکے تھے۔ اُن میں سے پانچ چھ کے مکالمے بھی چل رہے تھے......''

بات کرتے کرتے مجید پہلوان اچانک چونک گیا تھوڑی دیر حیرت سے خود ہی کچھ سوچتا رہا۔ پھر ڈرامائی لہجے میں بولا۔

''آپ لوگوں کا خیال ہے نا...... کہ آٹو گراف نے ذکی کی آواز بنا کر ٹیلی فون کیا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ پورے یقین سے بولا۔

''یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ اس واردات میں آٹو گراف بے چارے کا کوئی ہاتھ نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم اتنے یقین سے کیوں کہہ رہے ہو؟''

اُس نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ''جناب جاوید صاحب...... آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اُس روز تو آٹوگراف کا گلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے یوں یاد آیا ہے کہ شوٹنگ میں چند ایکسٹراز کو مکالمے بھی بولنا تھے۔ ایک ایکسٹرا کے تو سات آٹھ فقرے تھے۔ ڈائریکٹر صاحب یہ فقرے آٹوگراف کو دینا چاہ رہے تھے مگر پتہ چلا کہ اُس کی آواز ہی خراب ہے۔ دراصل ایک رات پہلے وہ ایک ایکشن فلم کی ڈبنگ کراتا رہا تھا۔ چیخ چیخ کر اُس نے گلے کا ستیاناس کرلیا تھا......''

مجید پہلوان کی بات پر مجھے یاد آیا کہ صبح جب میں نے کوارٹر میں آٹوگراف سے بات کی تھی تو اُس وقت بھی اُس کی آواز پوری طرح ٹھیک نہیں تھی۔ ممکن ہے تین روز پہلے وہ زیادہ خراب رہی ہو...... مجید پہلوان کے بیان کے بعد میں نے موقع پر موجود چند دوسرے افراد سے بھی تصدیق کی۔ اندازہ ہوا کہ آٹوگراف کو اس کیس میں شاملِ تفتیش کرنا درست نہیں تھا۔

میں جب واپس آنے لگا تو مجید پہلوان نے قریب آ کر چپکے سے کہا۔ ''میں اس سلسلے میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہے تو گاڑی میں میرا انتظار کریں، میں آ رہا ہوں۔'' میں نے رضامندی ظاہر کی...... تھوڑی ہی دیر بعد میں اور مجید پہلوان ایک قریبی ریستوران میں بیٹھے مصروفِ گفتگو تھے۔

مجید پہلوان نے کہا۔ ''آٹوگراف سیدھا سادہ لڑکا ہے۔ زیادہ چکر فریب نہیں جانتا۔ میرا تو خیال ہے اسے پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

''کون ہوسکتا ہے اُس کا دشمن؟''

''وہی جس نے ٹیلی فون کیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے ذکی احمد؟''

''بالکل وہی۔''

''لیکن اللہ دتہ صاحب کو تو اُس پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ کہتے ہیں ہزاروں لاکھوں کا لین دین اُس کے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ اُسے کیا ضرورت تھی پندرہ ہزار کے لیے منہ کالا کرنے کی۔''

مجید بولا۔ ''یہی تو نکتہ ہے۔ اللہ دتہ صاحب ذکی پر شک کرنہیں سکتے تھے۔ اُن کا دھیان کسی اور طرف ہی جانا تھا...... اور اُس طرف گیا جس طرف ذکی احمد چاہتا تھا۔''

بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ذکی اور آٹوگراف میں کیا رقابت ہے۔''

مجید بولا۔ ''بہت بڑی رقابت ہے جی...... یہ اندرونِ خانہ باتیں تو ہم جانتے ہیں...... دراصل جاوید صاحب! یہ جو آٹوگراف ہے نا اس کو ایک رول مل رہا تھا فلم ''نیلا آسمان'' میں۔

آپ جانتے ہی ہیں۔ ''نیلا آسمان'' کتنی بڑی پروڈکشن ہے اور کتنے بڑے بجٹ سے بن رہی ہے۔ یہ رول بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ ایسے رول آٹوگراف جیسے جونیئر اداکاروں کی زندگی کا حسین ترین خواب ہوتے ہیں۔ اس رول کے لیے جو دوسرا نام زیرِ غور تھا وہ ذکی کا تھا۔ ذکی کے لیے بھی یہ ایک گولڈن چانس ہے...... وہ چاہتا ہے کہ جیسے بھی ہو یہ رول اُسے ملے۔ اُس کے تعلقات بھی کافی ہیں۔ سفارشیں وغیرہ بھی لڑاتا رہتا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں ڈائریکٹر صاحب کش مکش میں ہیں...... اس کردار کے چہرے پر جو تھوڑی سی معصومیت درکار ہے وہ ذکی کے پختہ چہرے پر نہیں۔ اس کے علاوہ......''

میں نے مجید کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے ذکی احمد نے ایک چال کھیلی ہے تاکہ آٹوگراف پر کیس بن جائے اور اس رول کے لیے اُس کا بڑا حریف مقابلے سے خارج ہوجائے۔''

''بالکل یہی بات ہے۔''

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ اگر واردات کے روز آٹوگراف کے گلے کا نقص ثابت نہ ہوا ہوتا تو میں مجید کی بات کو اتنی جلدی قابلِ یقین نہ جانتا۔ مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ چال ذکی احمد کی کھیلی ہوئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ دتہ صاحب اُس پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں اور تفتیش کا رُخ جلد یا بدیر آٹوگراف کی طرف مُڑ جائے گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُس نے اشاروں کنایوں میں یہ بات خود ہی دتہ صاحب کے ذہن میں ڈال دی ہو۔ بہرحال کچھ بھی تھا اُس نے ایک شاندار داؤ لگایا تھا...... میرے ذہن میں ایک اور سوال اُبھر رہا تھا اور یہ سوال آٹو گراف کے بارے میں تھا۔ اپنے نام ہی کی طرح اُس کی شخصیت بھی کچھ عجیب سی تھی۔ میرے ذہن میں خواہ مخواہ اُس کے متعلق تجسّس جاگ رہا تھا۔ مجید پہلوان کی صورت میں میرے سامنے ایک ایسا شخص موجود تھا جو انڈسٹری کا رمز شناس ہونے کا دعویدار تھا اور میرے تجسّس کو دور کرسکتا تھا۔ میں نے کہا۔

''مجید پہلوان! یہ آٹوگراف کا نام آٹوگراف کیسے پڑا۔''

مجید ہنستے ہوئے بولا۔ ''مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ آپ یہ سوال مجھ سے ضرور کریں گے۔ یہ چند سال پرانی بات ہے اور بہت کم لوگ اس بارے میں جانتے ہیں۔ جو جانتے ہیں وہ بھی بھول چکے ہیں۔ زندگی کی مارا ماری میں نام ہی یاد رہ جائیں تو بڑی بات ہے۔ اُن کے معنی پر کون غور کرتا ہے۔ اور پھر یہ واقعہ ایک معمولی ایکسٹرا کے ساتھ ہوا تھا اور ان بیچاروں پر اس سے بھی بڑے بڑے حادثے گزرتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ایک ایکسٹرا لڑکی جو لیڈی پولیس کی

وردی میں تھی کسی کام سے اسٹوڈیو سے باہر نکلی۔ گشتی پولیس والوں نے جعلسازی کے الزام میں اُسے پکڑ لیا اور تھانے لے گئے۔ جب تک کوئی ذمے دار شخص اُس کے پیچھے جاتا بیچاری فنکارہ کا حشر ہو گیا......''

مجید نے ایک بار پھر غیر متعلق موضوع چھیڑ دیا تھا۔ میں اُسے کھینچ کر واپس ''آٹوگراف'' پر لایا......اُس نے کہا۔'' کچھ سال پہلے آٹوگراف نے ایک پنجابی فلم میں مختصر سا رول کیا تھا۔ یہ ایک خوانچہ فروش کا کردار تھا جو ایک معروف بڑھک مار اداکار کی نقالی کا شوقین ہوتا ہے۔ لوگوں نے اس رول کو پسند کیا۔ مشکل سے پانچ چھ منٹ کا کام تھا۔ آٹوگراف اس پر بھی خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ غریب آدمی کے پاس خوابوں کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے۔ آٹوگراف نے بھی کامیابی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ اُس نے سوچا اب تھوڑے عرصے میں وہ مشہور اداکاروں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔ یار دوستوں نے بھی اُس کے جذبات کا خوب فائدہ اٹھایا۔ کئی دن تک اُدھار لے لے کر وہ انہیں مٹھائیاں کھلاتا اور فلمیں دکھاتا رہا لیکن ہونا تو وہی تھا جو مدتوں سے بے وسیلہ لوگوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ آٹوگراف کو کہیں سے کسی بڑے کردار کی آفر نہ ہوئی اور اُس نے ایک بار پھر فلمسازوں اور ہدایت کاروں کے دھکے کھانے شروع کر دیے۔ ایک روز دوستوں نے اُس کا مذاق اڑانے کے لیے کہا کہ ''میڈم شاہ تمہاری بہت تعریف کر رہی تھی۔ اُس نے تمہارا خوانچہ فروش والا رول دیکھا ہے۔ کہتی تھی اس شخص کے اندر ایک بڑا فنکار چھپا ہوا ہے۔''

ایک دوسرا دوست بولا۔'' بھئی اُس نے تو مجھے یہاں تک کہا تھا کہ وہ اس لڑکے سے ملنا چاہتی ہے۔''

آٹوگراف کے چہرے پر پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ اُن دنوں نیا نیا اسٹوڈیو میں آیا تھا۔ آج کل سے کچھ زیادہ ہی شرمیلا اور بھولا تھا۔ اُس کا بھولپن دیکھ کر ایک شخص کی رگِ ظرافت پھڑکی اور اُس نے کہا۔

''ابے تم ملنے کی بات کرتے ہو۔ میڈم شاہ تو اس کا آٹوگراف لینے کے لیے مچل رہی تھی۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ وہ اسٹوڈیو کس وقت آتا ہے...... میں نے کہا وہ چلتا پرزہ ہے اُس کا کوئی پتہ نہیں۔ کبھی یہاں......کبھی وہاں کہنے لگی......اچھا اُس سے کہنا اگر کسی وقت فراغت ہو تو کوٹھی آ کر مجھ سے مل لے......''

غرض دوستوں نے اُس کا خوب مضحکہ اڑایا اور چرب زبانی سے اُس پر ثابت کر دیا کہ ''م[illegible] شاہ'' اُس کا آٹوگراف لینا چاہتی ہے۔

فراغت ڈھونڈنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ صبح دس گیارہ بجے تک اسٹوڈیو میں دھکے کھانے کے بعد اُس کے پاس فراغت ہی فراغت تھی۔ اگلے روز اُس نے نہا دھو کر اپنا سب سے اچھا لباس پہنا اور جیب میں نیا فاؤنٹین پن ٹکا کر آٹوگراف دینے نکل کھڑا ہوا۔ اُس کے سادہ ذہن میں یہ بات بھی نہ آئی کہ آٹوگراف دینے والے یوں اپنے پرستاروں کا گھر ڈھونڈ کر دروازے نہیں کھٹکھٹایا کرتے۔ اُس کے ذہن میں بس اپنا خوانچہ فروش والا کردار تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا قلعہ سر کر چکا ہے......''

اپنی ہی بات قطع کر کے مجید پہلوان نے کہا۔''تم میڈم شاہ کے متعلق جانتے ہو۔''

میں اُس کے بارے میں جانتا تھا لیکن تفصیل سے جاننے کے لیے میں نے انڈسٹری کے دانائے راز مجید پہلوان کو بولنے کا موقع دیا۔ اُس نے کہا۔

''میڈم نبیلہ شاہ نام ہے ایک نازک اندام، خوش اور پری چہرہ لڑکی کا۔ فلم لائن سے اُس کا صرف اتنا سا تعلق ہے کہ وہ ایک کامیاب پروڈیوسر کی بیوہ ہے۔ آج سے کوئی چار سال پہلے اُس کی شادی ہوئی۔ چند ماہ سہاگن کی زندگی گزارنے کے بعد بیچاری پر نوعمری میں بیوگی کا عذاب ٹوٹ پڑا۔ اس شادی سے پہلے وہ کسی انگریزی سکول میں استانی تھی۔ ایک فنکشن میں مرحوم پروڈیوسر نے اُسے دیکھا اور دل ہی دل میں اپنی اگلی فلم کے لیے چُن لیا۔ مگر جب نبیلہ شاہ سے بات کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی صورت فلم میں کام نہیں کرے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پروڈیوسر نے اُسے اپنی زندگی کی فلم میں کاسٹ کر لیا۔ مگر یہ ''فلم'' جو دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک لگتی تھی چند ہی ''شوٹنگوں'' کے بعد دھڑام سے نیچے آن گری اور اس کے نیچے آ کر نبیلہ شاہ کے سہاگ کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجید پہلوان بولا ''اب نبیلہ شاہ صرف ایک مالدہ بیوہ ہے۔ ویسے اسے فلمی لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ فنکار نہیں مگر فن پرست ضرور ہے۔ کبھی کبھی پروڈیوسر اُس کے دست مبارک سے فلموں کا افتتاح بھی کرواتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے وہ ایک مہورت پر اسٹوڈیو آئی ہوئی تھی......''

میں نے کہا۔''ہاں! میں نے بھی اُسے دور سے دیکھا تھا۔''

مجید بولا۔''کسی اچھے خاندان کی ہے۔ غریب غربا کی مدد بھی کرتی رہتی ہے۔ ہمارے کئی چھچھورے سُپر سٹارز نے اُس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی مگر سب نے منہ کی کھائی۔ ایک بیچارا تو اُس کے عشق میں پاگل ہی ہوا پھرتا تھا۔ ویسے وہ ہے بھی پاگل کرنے والی۔ ایک فلم میں آ جائے تو ہماری ساری ہیروئنوں کی چھٹی کرا دے......''

مجید پہلوان ایک بار پھر حسبِ عادت موضوع سے ہٹ رہا تھا۔ میں اُسے کھینچ تان کر دوبارہ اصل مسئلے پر لایا۔ وہ کہنے لگا۔ ''ہاں......تو میں آٹوگراف کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ بن ٹھن کر نبیلہ شاہ کو ملنے چلا گیا۔ وہاں اُس پر جو بیتی اُس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ نبیلہ شاہ کے ملازموں نے اُس پر کتے چھوڑ دیے تھے جنہوں نے اُسے لہولہان کر دیا اور کپڑے پھاڑ کر رکھ دیے۔ کچھ کا خیال ہے کہ نبیلہ شاہ نے غصے میں آ کر اُسے سیڑھیوں میں دھکا دے دیا تھا اور بعد میں چھڑیوں سے بُری طرح پیٹا تھا۔ بہرحال یہ اعتراف تو خود آٹوگراف نے بھی کیا تھا کہ نبیلہ شاہ نے اُس کی دخل در معقولات پر اُسے تھپڑ مارے اور اُس کے نوکروں نے اُسے دھکے دیے جس کی وجہ سے اُس کا قلم ٹوٹ گیا اور اُس کی پشاوری چپل کا تسمہ نکل گیا۔ جس کے سبب اُسے چپل ہاتھ میں اٹھا کر آنا پڑا۔

تو جناب جاوید صاحب! نبیلہ شاہ کے ہاں آٹوگراف کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ نہایت افسوسناک تھا۔ ایک سادہ لوح شخص کی اس درجہ بے عزتی پر خون کے آنسو بہائے جاتے تو بھی کم تھا۔ مگر یہاں کون کسی کا درد محسوس کرتا ہے۔ یار لوگوں نے اُسے بھی ہنسی مذاق کا بہانہ بنایا۔ وہ اسٹوڈیو میں نظر آتا تو لوگ ''آٹوگراف......آٹوگراف'' کے آوازے نکالنے لگتے۔ پہلے پہل تو اُس نے اس چھیڑ چھاڑ کا بہت اثر قبول کیا۔ اسٹوڈیو آنا جانا ترک کر دیا۔ یاروں دوستوں سے نظر چرانے لگا۔ ''آٹوگراف'' اُس کی مستقل چھیڑ بن گئی اور اُس نے اس نام کو ذہنی طور پر قبول کر لیا...... بہرحال اس واقعے کے بعد میں نے آٹوگراف کے رویے میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ اُس کے اندر جیسے ایک آگ سی روشن ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کام میں پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگا اور اُس پر ترقی کرنے کا ایک جنون سا سوار ہو گیا...... یہ صورتِ حال کسی نہ کسی طرح اب تک برقرار ہے۔ اُس افسوسناک واقع کو اب قریباً تین سال ہونے کو آئے ہیں۔ اس دوران میں نے محسوس کیا ہے کہ آٹوگراف اپنے راستے پر بتدریج آگے بڑھ رہا ہے۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے بھی ہمت نہیں ہاری۔ اب وہ اپنے ایکسٹرا ساتھیوں سے آگے نکل چکا ہے۔ اُسے فلموں میں لائنیں بھی مل رہی ہیں۔ پچھلے مہینے اُس نے ایک فلم میں پندرہ بیس منٹ کا ایک کردار ادا کیا ہے۔ اب ''نیلا آسمان'' میں بھی اُسے کام ملنے کی اُمید ہے۔ اگر وہ اس پندرہ ہزار روپے کے چکر سے بچ گیا تو مجھے یقین ہے یہ رول اُسے ہی ملے گا۔ اور یہ رول ملنے کا مطلب ہے وہ معاون اداکاروں کی صف میں شامل ہو جائے گا......''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''وہ اس پندرہ ہزار روپے کے چکر سے ضرور بچے گا۔''

☆======☆======☆

ایک طرح سے مجید پہلوان کے بیان نے پوری صورتِ حال واضح کر دی تھی۔ یہ سب کیا دھرا ذکی احمد ہی کا تھا۔ اُس نے بڑی عیاری سے آٹوگراف کو پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل انور علی کو ذکی احمد کی ٹوہ میں لگایا اور اُس نے تیسرے ہی دن اندرونِ شہر رہنے والے اُن دو لڑکوں کا سراغ لگا لیا جو ذکی احمد کی ہدایت پر اللہ دتہ صاحب سے پندرہ ہزار روپے لینے پہنچے تھے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا تھا۔ ذکی احمد اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار ہوا اور آٹوگراف کو رہائی ملی۔ غم اور خوشی، اندھیرا اور اجالا، دُکھ اور سکھ ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے خلا چھوڑ جاتے ہیں۔ آٹوگراف بھی سازش کے اندھیرے سے نکلا تو ''نیلا آسمان'' کے چمکتے ہوئے رول نے اُس کا استقبال کیا۔ آٹوگراف کو ایک نیا خوبصورت فلمی نام دیا گیا اور فن کے حوالے سے اُس کے لیے نئے دور کا آغاز ہوا۔

''نیلا آسمان'' زیرِ تکمیل تھی کہ آٹوگراف کو کئی اور جاندار رول ملے۔ وہ نہایت تیزی سے ترقی کے ''خود کار زینوں'' پر آ گیا...... انہی دنوں مجھے ایک بار پھر وہی کال موصول ہوئی جس کے ذریعے چند ماہ پہلے مجھے کہا گیا تھا کہ میں آٹوگراف کے کیس کی چھان بین کروں اور اگر وہ بے گناہ ہے تو اُسے سزا سے بچاؤں۔ اس دفعہ مجھے کہا گیا کہ آٹوگراف کے حاسد پیدا ہو رہے ہیں۔ ذکی احمد اور اُس کے بہی خواہ بھی اُس سے بدلہ لینے کی فکر میں ہیں۔ لہٰذا میں اُس کی حفاظت کا انتظام کروں۔ اگر پولیس کی جانب سے مستقل تحفظ فراہم ہو سکتا ہے تو بہتر ہے ورنہ کوئی پرائیویٹ انتظام کروں۔ زیادہ مناسب ہے کہ آٹوگراف کو بھی اس انتظام کا علم نہ ہو۔''

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد میں نے ہیڈ کانسٹیبل انور علی کو آٹوگراف کے پاس پرائیویٹ سیکرٹری رکھا دیا۔ ویسے بھی آٹوگراف کو مختلف معاملات کے لیے ایک پڑھے لکھے شخص کی ضرورت تھی، وہ خود صرف میٹرک پاس تھا۔ انور علی جو دلیر ہونے کے علاوہ لڑائی بھڑائی میں بھی ماہر تھا خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دینے لگا۔

......وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک روز انور علی کی وساطت سے مجھے ایک حیرت انگیز اور خوش کن خبر ملی۔ انور علی نے بتایا کہ آٹوگراف اور میڈم نبیلہ شاہ میں کوئی بات چل رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹیلی فون کرتے ہیں اور ایک دو بار ہوٹل میں بھی ملاقات ہوئی ہے۔ ابھی یہ بات کسی کو معلوم نہیں لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں شادی کے موڈ میں ہیں...... فلمی دُنیا میں ایسی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہی رہتی ہے۔ راتوں رات تقدیریں پلٹتی ہیں۔ کبھی شام کے خاک نشیں، صبح کے عرش نشیں بن جاتے ہیں۔ اور کبھی انٹرکان میں ڈنر کرنے والے اگلے دن نان چھولے کے ناشتے کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ آٹوگراف بھی اب ایک اُبھرتا ہوا ستارہ تھا۔ اُس کا مستقبل درخشاں

تھا۔ وہ جوان تھا۔ خوبصورت نہیں تو بدصورت بھی نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دل موہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر اُس نے کل کی دشمن کو آج کی دوست بنالیا تھا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ کامیابی بہت بڑی طاقت ہوتی ہے اور زخموں کو پاٹنے کے لیے دولت ایک تیر بہدف مرہم ہے...... مگر ایک اندیشہ بھی میرے ذہن میں اُبھر رہا تھا۔ کہیں آٹوگراف...... نبیلہ شاہ سے انتقام لینے کے چکر میں تو نہیں۔ اس سلسلے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ جب تک معلوم نہ ہوتا کہ اُن کے نئے تعلقات کا آغاز کیسے ہوا اور وہ کیونکر پروان چڑھے...... صورتِ حال کا ایک پہلو نہایت تاریک تھا اور ایک نہایت روشن۔ بہرحال کچھ بھی تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ مستقبل قریب میں آٹوگراف اور میڈم شاہ کے رومانس کی خبر انڈسٹری کے لیے تہلکہ خیز ثابت ہوگی۔

وہ جنوری کی ایک سرد شام تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ بونداباندی ہو رہی تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح سرِ شام میں بھی بند ہوگیا تھا۔ کوئی چھ بجے کے لگ بھگ مجھے انور علی کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ اُس نے مجھے یہ اہم اطلاع دی کہ میڈم شاہ ایک سفید مورس کار میں آٹوگراف سے ملنے پہنچی ہے۔ وہ دونوں اس وقت شاید ڈرائینگ روم میں موجود ہیں۔

میڈم شاہ کا خود چل کر آٹوگراف سے ملنے پہنچنا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس آمد کے پیچھے کوئی خاص مقصد کارفرما ہے۔ کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے اس معاملے کو خود دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی کھٹارہ گاڑی گیراج سے نکال کر میں آٹوگراف کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ راج گڑھ میں ایک کنال کی یہ کوٹھی آٹوگراف نے چند ہفتے پہلے خریدی تھی۔ میرے غریب خانے سے اس کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ قریباً پانچ منٹ بعد میں وہاں پہنچ گیا۔ علاقے میں لائٹ گئی ہوئی تھی۔ پھر بھی ایک جانب تاریکی میں مجھے میڈم شاہ کی سفید مورس نظر آگئی۔ وہ عموماً شیورلیٹ استعمال کرتی تھی۔ مورس میں یہاں آنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رازداری چاہتی ہے۔ انور علی مجھے گیٹ کے پاس ہی کھڑا نظر آگیا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔

''مجھے تو کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔ میڈم شاہ پچھلے پندرہ منٹ سے ڈرائینگ روم میں اکیلی بیٹھی ہے۔ دو بار مجھ سے کہہ چکی ہے کہ صاحب کو بلاؤ۔ صاحب اطمینان سے چھت پر ٹہل رہا ہے۔ غصے میں بھرا ہوا ہے۔ کہتا ہے جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔''

میں انور علی کے ساتھ اندر آیا۔ وہ کوٹھی کے ہر گوشے سے واقف تھا۔ ایک راہداری سے گزر کر مجھے صحن کے ایک ایسے تاریک گوشے میں لے آیا جہاں سے باآسانی ڈرائنگ روم میں

جھانکا جا سکتا تھا۔ دیوار گیر آہنی گرل کی دوسری جانب شیشہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اور اندرونی آوازیں بھنبھناہٹ کی صورت میں سنائی دے رہی تھیں۔ آٹوگراف اب ڈرائینگ روم میں پہنچ چکا تھا۔ اُس کی جون بہت تیزی سے تبدیل ہوئی تھی۔ چند ماہ پہلے کا فاقہ زدہ ایکسٹرا اداکار اُس کی خوش پوشی اور خوداعتمادی کے پیچھے اوجھل ہو چکا تھا۔ میڈم شاہ خوبصورت ساڑھی میں ملبوس اُس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کی ترشی ہوئی سپید کہنی صوفے کے ہتھے پر تھی اور ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹکی ہوئی تھی۔ بڑا پیارا سا پوز تھا۔ گیس لیمپ کی روشنی میں اُس کے نقرئی بُندے ہولے ہولے شہابی گالوں پر لرز رہے تھے۔ اُس کے چہرے کے تاثرات سے صاف طور پر اندازہ ہوتا تھا کہ آٹوگراف اس سے رُوٹھا ہوا ہے اور وہ اُسے منا رہی ہے۔ پھر اُس نے آگے کو جھک کر آٹوگراف کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آٹوگراف کے چہرے کی بیزاری برقرار رہی۔ نبیلہ شاہ نے محبوبانہ انداز میں اٹھلاتے ہوئے کہا۔

''جناب! پتہ بھی چلے اب یہ موڈ کیسے ٹھیک ہوگا۔ تین روز سے ٹیلی فون کر رہی ہوں۔ دو دفعہ شرفو کو بھیجا ہے۔ اب خود سر کے بل چل کر آگئی ہوں۔ آپ کا مزاج ہے کہ بحال ہی نہیں ہو رہا۔''

آٹوگراف کی خشک اور کھردری آواز سنائی دی۔ ''اب یہ مزاج ایسا ہی رہے گا۔''

آٹوگراف کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میڈم شاہ بری طرح چونک گئی۔ اُس نے آٹوگراف کا ہاتھ چھوڑا اور گہری نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''ابدال! آخر بات کیا ہے۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔''

ابدال نے اٹھ کر شیشہ بند کیا اور پردہ برابر کر دیا۔ اب میں صرف اُن کی آوازیں ہی سن سکتا تھا اور وہ بھی کان لگا کر بڑی مشکل سے آٹوگراف کی تندوتیز کاٹ دار آواز سنائی دی۔

''میڈم شاہ! میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں کو اپنے راستے جدا کرنے ہوں گے۔''

''کیا کہہ رہے ہو ابدال!'' میڈم شاہ کی لرزاں آواز ابھری۔ ''کہیں...... کہیں تم نے نشہ تو نہیں کر رکھا۔''

''نہیں میڈم شاہ! میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ سچ پوچھتی ہو تو میں نے کبھی تم سے شادی کا نہیں سوچا۔''

چند لمحوں کی گھمبیر خاموشی کے بعد میڈم شاہ کی آواز ابھری۔ ''ابدال! تو پھر یہ سب کیا تھا۔''

''تمہاری سزا تھی۔'' ابدال نے صاف سیدھے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اپنی ہتک کا بدلہ لیا ہے۔ تمہارے اُن تھپڑوں کے جواب میں آج میں تمہارے منہ پر انکار کا تھپڑ مارتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔''

نبیلہ شاہ گھگھیائی۔ ''خدا کے لیے ابدال...... خدا کے لیے۔ ایسی بات مت کہو۔ سب کچھ بکھر جائے گا...... کچھ باقی نہیں رہے گا۔''

آٹوگراف نے ایک تضحیک آمیز قہقہہ لگایا۔ ''نبیلہ بیگم! فلموں کے یہ ڈائیلاگ اب گھر جا کر بولو تو زیادہ بہتر ہے۔ ٹائم کافی ہو چکا ہے۔ مجھے کچھ اور کام بھی کرنے ہیں۔''

پھر قدموں کی آواز آئی۔ آٹوگراف، میڈم نبیلہ کو کمرے میں چھوڑ کر واپس جا رہا تھا۔ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک گونجی، نبیلہ اضطراری کیفیت میں اُس کے پیچھے گئی تھی۔ ''ابدال'' اُس کی آواز سنائی دی۔ اس آواز میں التجا کی انتہا بھی تھی اور ایک تنبیہہ کی ابتداء بھی۔ ابدال نے یہ آواز نہیں سنی اور طیش کے بہرے پن میں سیدھا نکلتا چلا گیا۔ میڈم شاہ کمرے کے بیچ کھڑی چند لمحے سسکتی رہی۔ پھر اُس نے دروازہ کھولا اور تیز قدموں سے چلتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں اپنی جگہ کھڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میرا سارا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ انور علی کے ساتھ میں بھی کوٹھی سے باہر آ گیا۔ سفید مورس کار گلی کے موڑ پر اوجھل ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر شش و پنج میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر اپنی کھٹارہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

یہ بڑی عجیب سی صورتِ حال سامنے آئی تھی۔ میڈم شاہ جو بڑے بڑے شکاریوں کے جال میں نہیں آتی تھی ابدال عرف آٹوگراف پر مائل ہو گئی تھی۔ جبکہ آٹوگراف اس سلسلے میں حیران کن سنگدلی کا ثبوت دے رہا تھا۔ میرا یہ اندازہ بالکل درست نکلا تھا کہ وہ اُس سے انتقام لینے اور اُسے نیچا دکھانے کے چکر میں ہے۔ یہ فلمی دُنیا تھی اور اس دُنیا میں ہر وہ چیز ممکن ہوتی ہے جو باہر کی دُنیا میں ناممکن سمجھی جاتی ہے۔

ایک چھوٹے سے ہوٹل میں آلو انڈے اور تندوری روٹی کا ڈنر کر کے میں اسٹوڈیو پہنچا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ سردی عروج پر تھی اور بوندا باندی نے باقاعدہ بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ سڑکیں سنسان اور بازار ویران تھے لیکن اسٹوڈیو کے اندر کی دُنیا جگمگا رہی تھی۔ رات کی شفٹ میں دو فلوروں پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اللہ دتہ صاحب دفتر میں نہیں تھے۔ میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر ''فلمی میگزین'' دیکھنے لگا۔ دفعتہً فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف وہی جانی پہچانی آواز تھی جو اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھے آٹوگراف کے بارے میں ہدایات

دے چکی تھی۔ یہ پنجاب پولیس کے ایک سینئر آفیسر مشتاق شاہ صاحب تھے۔ محکمے میں اُن کا عہدہ ہی بڑا نہیں تھا، نام بھی بڑا تھا۔ ہر کس و ناکس اُن کی عزت کرتا تھا اور اُن کے حکم کو سر آنکھوں پر رکھتا تھا۔ مشتاق صاحب نے مجھے ہدایت کی کہ فوراً راج گڑھ پہنچوں۔ کیونکہ مشکوک لوگوں کو آٹوگراف کے گھر کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔

فون رکھتے ہی میں نے کوٹ کے نیچے اپنا ریوالور چیک کیا اور گاڑی کی طرف دوڑ لگائی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرا اُڑن کھٹولا لاہور کی بھیگی ہوئی سڑکوں پر کھڑ کھڑ بجتا راج گڑھ کی طرف جا رہا تھا۔ دس منٹ کے اندر میں آٹوگراف کی دومنزلہ کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا۔ مجھے دور ہی سے ایک کار نظر آ گئی۔ یہ کار کوٹھی کے گیٹ سے دس پندرہ گز دور ایک درخت تلے کھڑی تھی اور اُس کی چھوٹی بتیاں روشن تھیں۔ ذرا غور کیا تو پتہ چلا کہ اُس کے سائلنسر میں سے دھواں بھی نکل رہا ہے۔ یعنی گاڑی اسٹارٹ تھی۔ گاڑی کے اندر صرف ایک شخص کا ہیولا نظر آ رہا تھا اور یہ شخص یقیناً ڈرائیور تھا۔ گاڑی کو دیکھ کر میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے اپنا اڑن کھٹولا کوٹھی سے کچھ فاصلے پر روک دیا اور ایک تنگ گلی کی طرف بڑھا تاکہ کوٹھی کی عقبی سمت پہنچ سکوں لیکن پھر مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ کوٹھی کے اندر سے ایک مدھم لیکن بہت دہشت ناک نسوانی چیخ اُبھری اور یخ بستہ سناٹے کو جھنجھوڑ گئی۔ اب میرے لیے تاخیر مناسب نہیں تھی۔ میں براہِ راست گیٹ کی طرف بڑھا اور اُسے پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ بھیگا ہوا صحن عبور کرنے میں بمشکل دو سیکنڈ لگے جونہی میں نے برآمدے کا جالی دار دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دروازہ پُرشور آواز سے کھلا۔ اس کے ساتھ ہی نسوانی چیخ دوبارہ گونجی اور کوئی بھاگتا ہوا مجھ سے آ ٹکرایا۔ تصادم شدید تھا میں نے بہت کوشش سے خود کو اور ٹکرانے والی کو سنبھالا۔ وہ صرف ایک چادر لپیٹے ہوئے تھی اور اس ہلکی پھلکی چادر کے نیچے اس کے پُرشباب جسم کے نشیب و فراز چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا اعلان کر رہے تھے۔ میں نے اُسے شانوں سے تھام کر زور سے جھنجھوڑا مگر وہ ہسٹریائی انداز میں مسلسل چیختی چلی گئی۔ میں نے اسے دوبارہ برآمدے میں دھکیلا اور بازو سے کھینچتا ہوا اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔

ایک زینے کے پاس مجھے آٹوگراف کا ''سیکرٹری'' انور علی نظر آیا۔ وہ اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ گھٹنوں کے زور سے اُٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ عین اُس وقت مجھے بالائی منزل سے دھڑ دھڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ لوگ بڑے زور و شور سے کسی کمرے کا دروازہ پیٹ رہے تھے اور ساتھ ساتھ غلیظ گالیاں بک رہے تھے۔ پھر میں نے فائرنگ کی آواز سنی۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ ہوائی فائرنگ تھی اور آٹوگراف کو اُس باتھ روم

سے نکالنے کے لیے کی گئی تھی جہاں وہ جان بچانے کے لیے گھس گیا تھا۔ میں انور علی کو پھلانگ کر زینوں پر آیا اور بغیر آواز پیدا کیے بالائی منزل کی طرف لپکا۔ آخری زینے پر پہنچ کر میں نے دیکھا چار ہٹے کٹے افراد باتھ روم کے دروازے پر جمع تھے۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں اعشاریہ پچیس کا کولٹ ریوالور تھا جبکہ باقی ڈنڈے اور ہاکی وغیرہ سے مسلح تھے۔ ریوالور والا کیم شحیم تھا اور پیچھے ہٹ ہٹ کر باتھ روم کے دروازے کو اپنے کندھے سے ٹکریں رسید کر رہا تھا۔
جونہی میں آخری زینے پر پہنچا دو افراد نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں حیرت اور طیش کے جذبات ایک ساتھ اُبھرے۔ مجھے صرف ریوالور والے کی فکر تھی۔ میں نے تاک کر اُس کے ہاتھ کو نشانہ بنایا۔ پہلی گولی خطا گئی لیکن دوسری گولی عین اُس کی کلائی پر لگی اور کولٹ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چکنے فرش پر لڑھک گیا۔

دو مشٹنڈے تیزی سے مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ میں بھی پوری طرح لڑائی کے موڈ میں تھا۔ میں نے ایک کو جھکائی دے کر اس کا وار خالی دیا اور دوسرے کی ہاکی نیچے آنے سے پہلے ہی اُس کے سینے پر ایسی زوردار لات جمائی کہ وہ ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ کر پندرہ سولہ فٹ کی بلندی سے نیچے ایک کیاری میں جا گرا۔ (اُس کی گردن میں شدید چوٹ آئی اور بعد ازاں اُسے ہسپتال روانہ کرنا پڑا) ریوالور والا اپنی زخمی کلائی تھامے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اُس کے تیسرے ساتھی نے لپک کر ریوالور تک پہنچنا چاہا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے ریوالور کو زینوں سے نیچے پھینک دیا۔ اُس شخص نے بھنا کر اپنی ہاکی سے میرے سر کو نشانہ بنایا لیکن ہاکی اُچٹ کر کندھے پر لگی پھر بھی شدید ضرب تھی میں ڈگمگا کر رہ گیا۔ موقعہ غنیمت جان کر دوسرا شخص بھی مجھ پر جھپٹا۔ مگر اس دوران آٹو گراف نے ہمت کر کے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا۔ یہ کھلا ہوا دروازہ جھپٹنے والے کے منہ پر لگا اور وہ چلا کر رہ گیا...... آٹو گراف صرف ایک انڈرویئر میں تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کھلا ہوا استرا تھا جو اس نے باتھ روم میں سے لے لیا تھا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور اور آٹو گراف کے ہاتھ میں اُسترا دیکھ کر حملہ آور ایک دم دفاعی پوزیشن میں آ گئے۔ ''خبردار...... ہاتھ اوپر اٹھاؤ'' میں نے چلا کر کہا۔

ہاتھ اوپر اٹھانے کی بجائے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی اور وہ دوسرا بڑے اسٹائلش انداز میں قلابازیاں کھا کر قالین پوش زینوں پر سے اوجھل ہو گیا۔ تیسرا جو زخمی تھا اور کیم شحیم بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ اُسے میں نے دبوچ لیا اور اڑنگا لگا کر نیچے گرا دیا۔ اب زخمی انور علی بھی ڈگمگاتا ہوا اوپر آ گیا۔ میں نے اُس کا زخم دیکھا۔ زخم ایسا تھا کہ ٹانکوں کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ

باتھ روم میں گھس جائے اور ٹھنڈے پانی کے نیچے سر رکھے۔
برآمدے میں ملنے والی لڑکی کی طرح آٹو گراف بھی نیم عریاں نظر آ رہا تھا۔ اُس کے جسم پر انڈرویئر کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ کہ جس وقت حملہ آور کوٹھی میں گھسے آٹو گراف کس ''حالت'' میں تھا۔ دفعتہً میری نگاہ آٹو گراف کے پاؤں پر گئی اور میں ششدر رہ گیا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اُس کا پورا پاؤں خون میں ڈوبا ہوا تھا اور فرش پر جہاں جہاں اُس کا پاؤں پڑا تھا خونی پنجہ بن کر رہ گیا تھا۔ یہ گولی کا زخم تھا۔ کولٹ ریوالور کی گولی اُس کی پنڈلی میں لگی تھی اور ہڈی توڑ کر دوسری طرف نکل گئی تھی۔ یہ آٹو گراف کی ہمت تھی کہ اب تک اپنے پاؤں پر کھڑا تھا کوئی کمزور دل کا ہوتا تو اب تک بے ہوش ہو چکا ہوتا۔
میں نے انور علی سے ایک رسی منگوائی اور اُس کی مدد سے کیم شحیم شخص کی مشکیں کس دیں۔ اس کے بعد میں نے تھانے فون کر کے گاڑی منگوائی اور زخمی آٹو گراف کو اپنے اُڑن کھٹولے میں ڈال کر میو ہسپتال روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

ایکسرے کے بعد پتہ چلا کہ آٹو گراف کی پنڈلی کی دونوں ہڈیاں فریکچر ہو چکی ہیں۔ فوری طور پر اُس کا آپریشن ہوا اور پاؤں سے گھٹنے تک پلاستر چڑھا دیا گیا وہ صدمے سے نڈھال ہو رہا۔ ان شب و روز کا ہر لمحہ اُس کے لیے قیمتی تھا۔ وہ قدم قدم ترقی کے زینے پر چڑھ رہا تھا مگر اس چوٹ نے اُسے عرش سے فرش پر لا پھینکا تھا۔ اگر اس کی ٹانگ ٹھیک ہو بھی جاتی تو ضائع ہو جانے والے وقت کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو کر رہ جاتا۔

حملہ آوروں میں سے دو گرفتار ہوئے تھے۔ دونوں زخمی تھے۔ ایک کی کلائی زخمی ہوئی تھی اور دوسرے کی گردن بلندی سے گر کر خم کھا گئی تھی۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ حملہ آوروں کا تعلق ذکی گروپ سے تھا۔ یہ سب افراد فلم فائٹر تھے اور آسانی سے مات کھانے والے نہیں تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اُن میں سے ایک میری ٹانگ کھا کر بلندی سے نیچے جا گرا تھا اور دوسرے کی کلائی میری گولی نے چھید ڈالی تھی۔ بہرحال وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ ذکی احمد نے انہیں آٹو گراف کی ہڈیاں پسلیاں توڑنے کے لیے بھیجا تھا اور انہوں نے اُس کی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ اب وہ لاچار ہو کر اسٹوڈیو کی روشنیوں سے دور ہسپتال کے بستر پر پڑا تھا اور ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر تھا۔

حملہ آوروں سے اقبالی بیان کے بعد ذکی احمد کی کچی ضمانت بھی منسوخ ہو گئی اور اُسے

گرفتار کرلیا گیا۔ یاد رہے کہ اُس پر پندرہ ہزار روپے کے فراڈ کیس میں بھی مقدمہ چل رہا تھا۔ دوسری طرف ہسپتال کے آرتھوپیڈک وارڈ میں ابدال عرف آٹوگراف کا علاج ہونے لگا۔ لاہور میں ایک چھوٹے بھائی کے سوا آٹوگراف کا اور کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ اس کا نام شریف احمد تھا اور وہ ایک پرائمری سکول میں پڑھاتا تھا۔ آٹوگراف نے شریف احمد کو دیکھ بھال کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک روز شریف احمد بہت گھبرایا ہوا اسٹوڈیو پہنچا۔ میں اُس وقت دتہ صاحب کے پاس بیٹھا تھا اور ہم ایک حواس باختہ شاعر سے اُس کی بے تکی نظم سن رہے تھے۔ شریف احمد نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا کہ ابدال بھائی جان کی زخمی ٹانگ پر پھر چوٹ لگ گئی ہے اور ڈاکٹر انہیں آپریشن تھیٹر میں لے گئے ہیں۔ اب وہ خون کا مطالبہ کر رہے تھے اور شریف احمد بھاگم بھاگ یہاں پہنچ گیا تھا۔

بڑا نازک وقت تھا۔ پوچھنے کا موقع بھی نہیں تھا کہ چوٹ کیسے اور کب لگی۔ میں نے فوراً تین چار بندے اکٹھے کر کے گاڑی میں بٹھائے اور انہیں لے کر ہسپتال پہنچا...... تین بوتل خون کا انتظام ہوا اور پھر خدا خدا کر کے آپریشن انجام کو پہنچا۔ آپریشن کرنے والے سرجن نے بتایا کہ ٹانگ میں ہڈی چکنا چور ہو چکی ہے اس لیے ''پلیٹیں'' رکھنا پڑی ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یہ آخری آپریشن ہو۔ زخم خراب ہے اور کسی بھی وقت پھر سرجری کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

دوبارہ چوٹ لگنے کے بارے میں جو تفصیل معلوم ہوئی وہ بڑی حیران کن تھی۔ آٹوگراف کے بیان کے مطابق رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ وارڈ کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں صرف راہداری میں سے تھوڑی سی روشنی اندر آرہی تھی۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ کسی نے بیڈ کو ایک جانب سے اٹھا دیا ہے۔ وہ لڑھک کر پختہ فرش پر گر گیا۔ ڈاکٹروں نے ہلنے جلنے تک سے منع کر رکھا تھا کہاں یہ کہ وہ تین فٹ کی بلندی سے پورے وزن کے ساتھ گرا۔ اسی وقت پلاسٹر کے اندر سے خون بہنے لگا۔ اور وہ درد سے تڑپ تڑپ جانے لگا۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا شریف بستر کے ساتھ ہی لکڑی کی ایک چوکی پر سو رہا تھا۔ آواز سن کر چند دوسرے مریضوں کی طرح وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر ٹانگ سے لگا تار خون بہتے دیکھ کر ڈاکٹر کو پکارنے لگا۔

صورتِ حال سے اشارہ مل رہا تھا کہ آٹوگراف کو دوبارہ لگنے والی چوٹ بھی لگی نہیں بلکہ پہلی چوٹ کی طرح لگائی گئی ہے۔ یہ چوٹ لگانے والا کون ہوسکتا تھا۔ ذکی احمد تو بمعہ اپنے قریبی ساتھیوں کے جیل میں تھا۔ بہر حال وہ جو بھی تھا دیدہ دلیر ثابت ہوا تھا۔ وہ موقعہ تاک کر اسپیشل وارڈ میں گھسا تھا اور آٹوگراف کو زخمی کر کے چلتا بنا تھا۔ آٹوگراف کچی نیند میں تھا لہٰذا

اسے پتہ چل گیا کہ کسی نے بیڈ کو ترچھا کر کے اسے گرایا ہے۔ ورنہ یہی سمجھا جاتا کہ وہ نیند میں گر گیا ہے۔ میں نے وارڈ کے چوکیدار اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر اور نرسوں سے پوچھ گچھ کی۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے کسی مشکوک شخص کو وارڈ میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا وارڈ میں صرف مریض اور اُن کے لواحقین تھے یا اسٹاف تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل انور علی کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے ملزم اسٹاف میں سے ہی کوئی شخص ہو۔ اُسے ایک وارڈ بوائے پر شبہ تھا۔ ہم نے اس وارڈ بوائے سے پوچھ گچھ کی اور اُسے دس بارہ گھنٹے کے لیے تھانے میں بھی رکھا۔ وہ کرسچین تھا اور اُس کا نام ڈیسمنڈ تھا۔ کوشش کے باوجود ہم اُس سے کچھ معلوم نہ کر سکے۔ ڈیسمنڈ کا کہنا تھا کہ اگر مریض خود نہیں گرا اور اُسے کسی نے گرایا ہے تو پھر یہ شریف کے سوا کسی کا کام نہیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ وقوعہ کے وقت شریف ہی اس کے قریب موجود تھا۔

ڈیسمنڈ کی بات میں وزن تو تھا لیکن وہ مجھے قابلِ قبول نظر نہیں آتی تھی۔ آٹوگراف اور شریف بھائی تھے۔ شریف چھوٹا تھا اور آٹوگراف نے اُسے باپ بن کر پالا تھا وہ بھی بھائی کی بہت عزت کرتا تھا۔ جب سے بھائی بیمار ہوا تھا وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُس کی چارپائی سے لگا بیٹھا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اُن دونوں میں کوئی ایسا تنازعہ بھی نہیں تھا۔ سب سے بڑا ''تنازعہ'' جائیداد ہی ہوتی ہے اور یہاں جائیداد کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ پھر شریف احمد کو کیا تکلیف تھی اپنے بھائی کے صحت یاب ہونے کی اور کیوں وہ اُسے بستر سے گرا کر بے رحمی کا ثبوت دیتا۔

بستر سے گرنے کے بعد ابدل عرف آٹوگراف چند روز تو ٹھیک رہا مگر پھر اُس کی حالت بگڑنے لگی۔ ٹانگ کے زخم میں انفیکشن ہوگئی تھی۔ وہ دن رات درد سے تڑپنے لگا۔ یہاں تک کہ درد کش گولیوں اور انجکشنوں نے بھی کام چھوڑ دیا۔ پندرہ بیس روز بعد اس کا ایک اور آپریشن ہوا۔ اس آپریشن سے تکلیف کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی۔ ایک سرجن نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شاید ٹانگ کاٹنی پڑے۔ بڑی پریشان کن صورتِ حال تھی۔ شروع شروع میں فلم لائن کے اکثر لوگ آٹوگراف کی تیمارداری کے لیے آئے تھے لیکن پھر یہ تعداد گھٹنے لگی۔

جُوں جُوں تکلیف بڑھتی گئی توں توں آٹوگراف اکیلا ہوتا گیا۔ بینک میں جو روپیہ اُس نے جمع کر رکھا تھا وہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا۔ ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی اُس نے خرید رکھی تھی۔ اس موقعے پر وہ گاڑی بیچ کر کام چلا سکتا تھا لیکن وہ گاڑی بھی اُس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ گاڑی پر ہاتھ صاف کرنے والی ایک جولی نام کی لڑکی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو وقوعہ کے روز چیختی چلاتی مجھ سے آٹکرائی تھی۔ وہ اُن کئی لڑکیوں میں سے ایک تھی جو اُن دنوں آٹوگراف کے اردگرد چکرا رہی

تھیں۔ ایسی لڑکیاں فلم اسٹوڈیوز میں شکارنوں کی طرح گھومتی رہتی ہیں۔ جہاں پیسے کی ریل پیل ہو وہیں اپنے جسم کی دکان سجا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اُدھر پیسہ ختم ہوا اُدھر یہ پھر سے اُڑ گئیں۔ جُولی بھی پھر سے اُڑ گئی تھی اور ساتھ ہی آٹوگراف کی کار بھی اُڑا لے گئی تھی۔ اُس کا کوئی پتہ ٹھکانہ تھا اور نہ والی وارث۔ تلاش کیا جاتا تو کہاں؟

اُنہی دنوں مجھے مشتاق شاہ صاحب کی طرف سے پھر کچھ تازہ ہدایات ملیں۔ اس مرتبہ حکم جاری ہوا کہ میں آٹوگراف کو میو ہسپتال سے اٹھا کر پنڈی لے جاؤں اور ملٹری ہسپتال میں داخل کرا دوں۔ مشتاق شاہ پنڈی میں بات کر چکے تھے اور وہاں داخلے کے سلسلے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں نے ہدایت کے مطابق آٹوگراف کو میو ہسپتال سے ڈسچارج کروایا اور اپنی نگرانی میں پنڈی لے گیا۔ داخلے کے کاغذات تیار تھے۔ آٹوگراف کو ''ایڈمٹ'' ہونے میں دس منٹ بھی نہیں لگے...... ملٹری ہسپتال میں علاج معالجے کی سہولتیں بہتر تھیں۔ سرجن بھی ماہر ترین تھے۔ یہاں ہونے والا پہلا آپریشن ہی کامیاب رہا اور آٹوگراف کی حالت بہتر ہونے لگی۔ نہ صرف اسے درد میں افاقہ ہو گیا تھا بلکہ وہ اپنا پاؤں بھی ہلانے جلانے لگا تھا۔ امید تھی کہ وہ جلد ہی بیساکھیوں سے چلنے کے قابل ہو جائے گا۔

ایک روز میں اُسے دیکھنے کے لیے ہسپتال پہنچا۔ وہ اپنے بھائی کے کندھے کا سہارا لے کر پاؤں اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ''جاوید صاحب! آپ نے میرے لیے بڑی کوشش کی ہے۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

اُس کا چھوٹا بھائی شریف مٹھائی کا ڈبہ لے آیا اور میرا منہ میٹھا کرایا۔ بھائی کے کامیاب آپریشن کی خوشی میں اُس نے ایک من مٹھائی تقسیم کی تھی۔ دونوں بھائی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ میرے خیال میں اس خوشی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ آٹوگراف کے دشمن نمبر ایک ذکی احمد کو سیشن کورٹ میں سزا ہو گئی تھی۔ پہلے پندرہ ہزار روپے کا فراڈ اور پھر اپنے ''فلمی حریف'' پر قاتلانہ حملہ۔ یہ دونوں جرائم اُسے چار پانچ سال کی جیل کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس فیصلے کے خلاف اس نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی تھی مگر امید بہت کم تھی کہ وہ بری ہو سکے گا۔

آٹوگراف کی مزاج پُرسی کے بعد میں جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا جب ایک سنگین واقعہ رونما ہو گیا۔ آٹوگراف جو بالکل ہشاش بشاش تھا اچانک بجھ سا گیا۔ پہلے اُس کا جی متلایا پھر وہ قے کرنے لگا ہم نے اُسے سوڈا واٹر پلایا، مگر یہ سوڈا واٹر جیسے اُس کے حلق میں گیا تھا ویسے ہی باہر نکل آیا۔ ساتھ ہی اُس کے پیٹ میں شدید قسم کا درد ہونے لگا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر بھاگا

بھاگا آیا۔ اُس کے معائنہ کرتے کرتے آٹوگراف کو ایک زبردست قے ہوئی۔ اس قے میں خون بھی شامل تھا۔ چھوٹے ڈاکٹر کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اُس نے فوراً بڑے ڈاکٹر کو بلایا۔ آٹوگراف کی حالت لحہ بہ لحہ غیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

بڑے ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ زہر خورانی کا کیس ہے۔ فوراً مریض کا معدہ صاف کرنا ہو گا ورنہ جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ شریف دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور بار بار نیم جان بھائی کی پیشانی چومنے لگتا تھا۔ آٹوگراف کو فوراً تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ ہم بے قراری سے یہاں وہاں ٹہلنے لگے۔ رات گئے تو ڈاکٹروں نے مریض کی کوئی خبر نہیں دی۔ نصف شب کے بعد پتہ چلا کہ وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ اُس کے معدے سے نکلنے والے مواد میں زہر کی بڑی مقدار موجود تھی۔ اسی دوران آٹوگراف کے چھوٹے بھائی شریف کی طبیعت بھی خراب ہو چکی تھی۔ دوپہر سے اُس کا پیٹ بھی خراب تھا اور وہ گاہے گاہے اُلٹیاں کرنے لگتا تھا۔ یہ بات اب یقینی تھی کہ زہر کھانے میں ملا کر دیا گیا ہے۔ آٹوگراف کا بچا کھچا کھانا شریف نے کھایا تھا اور وہ بھی اوندھا ہو گیا تھا۔ بہرطور دوا اور انجکشن وغیرہ سے اُس کی حالت سنبھل گئی اور وہ نصف شب تک ٹھیک ہو گیا لیکن آٹوگراف بدستور بے ہوش تھا اور ڈاکٹر اُس کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔

کھانا ہسپتال کے باورچی خانے سے آیا تھا۔ باورچی خانے میں کام کرنے والے تین افراد کو شاملِ تفتیش کر لیا گیا اور حکام اُن سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ ان تین افراد میں ایک شخص ایسا تھا جو اس سے پہلے میو ہسپتال لاہور میں بھی کام کر رہا تھا۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ جن دنوں آٹوگراف ہسپتال کے بیڈ سے گر کر زخمی ہوا یہ شخص اُسی وارڈ میں تعینات تھا۔ ظاہر ہے تفتیش کرنے والوں کو اُس پر شک ہونا تھا۔ حکام نے اُس سے خصوصی طور پر پوچھ گچھ شروع کی۔

آٹوگراف اگلے روز دوپہر بارہ بجے کے بعد ہوش میں آیا لیکن اُس کی ذہنی حالت غیر تھی۔ وہ بے معنی باتیں کر رہا تھا اور کسی کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ اُس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے اُس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کوئی شخص ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ گیا ہے اور کسی صورت اُسے معاف کرنے کو تیار نہیں۔ شاید قارئین کا دھیان میڈم شاہ کی طرف چلا جائے جس کی محبت کو آٹوگراف نے ٹھکرایا تھا اور اُسے رسوا کر کے گھر سے نکال دیا تھا لیکن میں جانتا تھا یہ میڈم شاہ کا کام نہیں ہے۔ یہ کسی کا کام بھی ہو سکتا تھا لیکن میڈم نبیلہ شاہ کا نہیں۔

ذکی احمد خود تو جیل میں تھا لیکن عین ممکن تھا کہ اُس کے کچھ ہرکارے سرگرم ہوں اور بار

بار آٹو گراف کی زندگی کے لیے خطرہ بن رہے ہوں۔ میں نے انسپکٹر سے گزارش کی کہ وہ اُس لائن پر تفتیش کریں اور ذکی احمد کے ملنے جلنے والوں پر نگاہ رکھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آٹو گراف کی حفاظت کے لیے میں خود بھی زیادہ وقت ہسپتال میں ہی گزاروں گا...... زہر نے آٹو گراف کے ذہن پر اثر کیا تھا اور وہ کسی وقت عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا تھا۔ کبھی فلموں کے ڈائیلاگ بولتا، کبھی کہتا میں بہت بڑا اسٹار بن گیا ہوں۔ میں ہر فلم سائن نہیں کروں گا۔ صرف نسیم بانو، مینا اور ریحانہ کے ساتھ کام کروں گا۔ شریف اُس کی حالت دیکھ دیکھ کر روتا تھا اور ہر وقت اُسے کندھے سے لگائے گم صم بیٹھا رہتا تھا۔

☆======☆======☆

وہ دن میرے لیے بڑا انکشاف انگیز تھا۔ میں اپنے ایک دوست اے ایس آئی کو ملنے صدر تھانے گیا ہوا تھا۔ واپسی پر مجھے راجہ بازار سے کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ میں راجہ بازار پہنچ کر تانگے سے اُترا اور اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ شام ہو چکی تھی لیکن پنڈی کا راجہ بازار شام کے بعد بھی جگمگاتا رہتا تھا۔ میں ایک دکان سے گرم مفلر دیکھ رہا تھا جب اچانک میری نگاہ جولی پر پڑی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو چند ماہ پہلے آٹو گراف کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی تھی اور جب اُس پر برا وقت پڑا تھا تو اس کی کار لے کر رفو چکر ہو گئی تھی۔ میں نے جولی کو اس کی آواز سے پہچانا ورنہ وہ برقعے میں تھی اور میرے پاس سے بھی گزر جاتی تو میں بے خبر ہی رہتا۔ اُس نے آواز دے کر ایک رکشا کو روکا تھا۔ رکشا رکا اور وہ اپنا ریشمی برقعہ سمیٹتی ہوئی اندر گھس گئی۔ اُس کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے لفافے تھے۔ اگلے ہی لمحے رکشا روانہ ہو گیا۔ میں نے جیسے چونک کر اپنی جگہ سے حرکت کی اور پیچھے آنے والے ایک رکشا کو ہاتھ دے کر اُس میں سوار ہو گیا۔

''کہاں جاسو بابو صاحب؟'' رکشا والا نے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''جہاں یہ اگلا رکشا جائے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

رکشا والا چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اے ایس آئی ہوں اور آن ڈیوٹی ہوں اور اگر اُس کی سستی کی وجہ سے رکشا نکل گیا تو وہ مشکل میں پڑ جائے گا۔

میرے تحکمانہ لہجے نے خاطر خواہ اثر کیا اور رکشا والا جو چند لمحے پہلے رکشا روکنے کے موڈ میں نظر آنے لگا تھا ایک دم چوکس ہو گیا۔ پوٹھوہاری انداز میں بولا۔ ''ابھی لو جناب! ذرا قائم ہو کے بیٹھ سو اور دیکھ سو میں کیسے پکڑتا ہوں اسے۔''

''پکڑنا نہیں ہے لالہ۔'' میں نے اُسے ٹوکا۔ ''صرف پیچھا کرنا ہے اور زیادہ نزدیک بھی نہیں جانا۔''

رکشا والے نے طوفانی انداز میں گیئر لگائی اور روانہ ہو گیا۔ اگلے پندرہ بیس منٹ تک دونوں رکشے جیسے ہوا میں اُڑتے رہے۔ اگلا رکشا غالباً اس لیے تیز جا رہا تھا کہ اُس میں ایک نوجوان اور خوبصورت سواری تھی اور جب سواری خوبصورت ہو تو رکشا خود بخود ہوائی جہاز بن جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کا تعاقب کرنے کے لیے ظاہر ہے، دوسرے رکشے کو بھی ہوائی جہاز بننا پڑا۔ یہ دوڑ دھوپ سوسائٹی کے علاقے میں جا کر ختم ہوئی۔ رہائشی علاقے میں ایک کوٹھی نما مکان کے سامنے جا کر رکشا رُک گیا۔ ہمارا رکشا سیدھا آگے نکلتا چلا گیا اور پھر ایک گلی میں گھومنے کے بعد میں نے اُسے ٹھہرا لیا۔ کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کوٹھی کے خدوخال اچھی طرح دیکھ لیے تھے۔ لہٰذا تھوڑی دیر بعد جب میں چہل قدمی کرتا ہوا واپس وہاں پہنچا تو باآسانی پہچان گیا کہ وہ آفت جاں کون سی کوٹھی میں داخل ہوئی ہے۔ وہاں اب تاریکی کا راج تھا۔ گیٹ، صحن، برآمدہ، باغیچہ سب کچھ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ فقط کسی اندرونی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور ایک کھڑکی کے راستے یہ روشنی سرسبز لان کے تھوڑے سے حصے پر پڑ رہی تھی۔ کوٹھی میں چوکیدارے کا انتظام دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سڑک بھی سنسان تھی۔ ایسا سنہری موقع ضائع کرنا میرے لیے بہت مشکل ثابت ہوا کرتا تھا۔ میرے نوخیز بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اٹھیں۔ ارد گرد کا جائزہ لے کر میں نے دیوار پھاندی اور اندر داخل ہو گیا۔

دبے پاؤں کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزر کر میں اُس روشن کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا جو گیٹ سے نظر آ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ پشت لگا کر میں نے بڑی احتیاط سے اندر جھانکا۔ اندرونی پردے میں قریباً ایک فٹ چوڑا خلا موجود تھا۔ اس خلا میں سے کمرے کا منظر دیکھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ اور یہ منظر بڑا عجیب سا تھا۔ کمرے کی چھت سے رنگ برنگے ربن جھول رہے تھے۔ تمام دیواروں کو بھی سجایا گیا تھا۔ ایک خوبصورت میز پر ایک بہت خوبصورت کیک پڑا تھا اور اُس پر موم بتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ بیس پچیس موم بتیاں تھیں۔ کمرے میں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کھڑکیاں دروازے بھی سبھی بند تھے۔ میں اپنی جگہ حیران کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہیں کھڑا رہوں یا آگے پیچھے ہو جاؤں۔ دفعتاً باتوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ پھر کسی نے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھولا اور اندر آ گیا۔ یہ ایک نہیں دو افراد تھے۔ میں انہیں دیکھ کر دنگ رہ گیا...... اُن میں سے ایک تو جولی تھی اور دوسرا شریف احمد تھا...... آٹو گراف کا چھوٹا بھائی شریف احمد جو ہر وقت اُس کی چارپائی سے لگا بیٹھا رہتا تھا۔ اندر گھس کر شریف احمد کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ حیرت سے کمرے کی سجاوٹ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ رنگ برنگ کیک پر پڑی۔ اور وہ بولا۔ ''یہ...... یہ سب کیا ہے بھئی؟''

"تمہاری سالگرہ۔" جولی اٹھلا کر بولی۔ "آج بارہ تاریخ ہے جناب! تم بھول سکتے ہو۔ ساری دُنیا بھول سکتی ہے لیکن جولی نہیں بھول سکتی۔"

شریف احمد کچھ دیر تحیر کے عالم میں جولی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے لپک کر جولی کو بازوؤں میں بھر لیا اور جوش میں اُس پر پل پڑا۔ وہ ہنس رہی تھی اور خود کو اُس کی گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اندر کے واہیات منظر سے نگاہیں ہٹا لیں اور دیوار سے پشت لگا کر سوچنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ آٹوگراف شریف احمد پر جان چھڑکتا تھا۔ اس کے نزدیک دُنیا میں اگر کوئی اُس کا سچا خیر خواہ تھا تو وہ شریف احمد تھا لیکن وہی شریف احمد اس وقت اُس لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا جو اُسے دھوکہ دے کر بھاگ گئی تھی۔ وہ دونوں اپنے حال میں مست تھے اور آٹوگراف ہسپتال میں سسک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے تالیاں بجنے کی آواز آئی۔ میں نے ایک بار پھر آگے جھک کر اندر جھانکا۔ جولی اور شریف احمد کیک کاٹ چکے تھے اور اب ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرا رہے تھے۔ جولی نے تھرماس میں سے گرما گرم چائے کپ میں انڈیل کر شریف کے ہاتھ میں تھمائی۔ وہ چائے کی چسکیاں لیتا ہوا صوفے پر پھیل گیا۔ جُولی صوفے کے ہتھے پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور اپنی ایک ٹانگ شریف احمد کی گود میں رکھ دی۔ جو لفافے وہ راجہ بازار سے لائی تھی اُن میں سے ایک کے اندر گرم سوٹ تھا اور دوسرے میں شلوار قمیض کا کپڑا۔ یہ دونوں چیزیں جولی نے شریف کو سالگرہ کے تحفے میں دیں۔

شریف کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ "جولی! میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کہیں بہت دور جہاں آٹوگراف ہو نہ ذکی احمد اور نہ اُن دونوں کے بکھیڑے۔"

جولی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "مشن پورا کیے بغیر جاؤ گے؟"

وہ بولا۔ "اب کون سا مشن باقی رہ گیا ہے۔ اُس کی ٹانگ ناکارہ ہو چکی ہے۔ دماغ کی چولیں ڈھیلی ہو چکی ہیں۔ ہسپتال میں پڑا سسک رہا ہے۔ اب اور کیا چاہیے ذکی احمد کو۔"

وہ بولی۔ "ٹانگ ناکارہ نہیں ہوئی۔ قابلِ علاج ہے اور ٹھیک ہو رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ملٹری ہسپتال میں رہا تو ڈیڑھ دو ماہ میں بھلا چنگا ہو کر اسٹوڈیو پہنچ جائے گا۔"

وہ جھلاہٹ سے بولا۔ "تو پھر کیا کروں میں؟ جو کچھ کر چکا ہوں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ ہر کام کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ حد گزر چکی ہے۔ اب کسی بھی وقت پھنس سکتا ہوں میں۔"

وہ بولی۔ "کہیں تم بھی تو ذکی احمد کی طرح ستاروں کی چالوں پر یقین نہیں کرنے لگے؟

وہ تو پڑا رہتا ہے ہر وقت برجِ عقرب اور برجِ ثور کے چکر میں۔"

"میں ستاروں کی چال نہیں وقت کی چال دیکھتا ہوں۔" شریف احمد نے کہا۔ "ٹھیک ہے ذکی نے رقم خرچ کی ہے۔ اب میں بھی اُس رقم کو خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ اور رقم خرچ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زندہ رہے۔ بھائی کے قتل کے الزام میں پھانسی نہ پا جائے۔ تم جانتی نہیں ہو کہ میں نے اس مرتبہ کتنی مشکل سے جان بچائی ہے۔ لوگ آنکھوں دیکھی مکھی نہیں کھا سکتے میں نے زہر کھایا ہے۔ نہ کھاتا تو کیا کرتا۔ سب سے پہلے مجھ ہی پر شک ہونا تھا۔ پولیس فوراً تفتیش کے رگڑے میں رکھ لیتی۔"

جولی سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے بولی۔ "لیکن ذکی احمد اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اگر وہ خود جیل سے باہر نہ بھی آ سکا تو اس کے ہرکارے تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے......" باتیں کرتے کرتے وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ پہلے اُن کی آواز مدھم ہوئی پھر بالکل معدوم ہو گئی۔ میں سنسان راہداری کی ٹھٹھری ہوئی تاریکی میں ساکت کھڑا رہ گیا۔

اب میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ کوٹھی سے نکل کر کسی قریبی ٹیلی فون تک جاؤں اور وہاں سے تھانے میں رِنگ کر کے پولیس پارٹی بلوا لوں تاکہ یہ اوباش جوڑا رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ابھی کوٹھی میں ہی رہوں اور اسی طرح چھپ چھپا کر مزید ٹوہ لوں۔ ہو سکتا تھا کوئی ایسا سبب لگ جاتا کہ میں شریف اور جولی کی مزید گفتگو سننے میں کامیاب ہو جاتا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنا سرکاری ریوالور ہاتھ میں کر لیا تھا اور وہ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ سخت سردی میں انگلیاں ریوالور کے دستے پر اکڑ کر رہ گئی تھیں۔ میں نے ریوالور کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور محتاط قدموں سے کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ یہاں بھی ایک روشن دان سے روشنی جھلک رہی تھی تاہم آوازیں وغیرہ سنائی نہیں دیتی تھیں۔ میں عقبی زینوں پر آیا اور نیم تیرگی میں سنبھل سنبھل کر اُوپر چڑھنے لگا لیکن ابھی میں نے نصف زینے ہی طے کیے تھے کہ نیچے کسی اندرونی کمرے سے افراتفری کی آوازیں آئیں۔ پھر جولی نے چلا کر کہا۔

"خبردار شریفے! ہاتھ نہ لگانا مجھے۔"

اس کے بعد جولی کی گھُٹی گھُٹی چیخ سنائی دی اور کوئی وزنی چیز دھم سے پختہ فرش پر گری۔ میں نے دو چھلانگوں میں زینے طے کیے اور نیچے اُتر کر اندرونی حصے کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے کہ میں برآمدے میں قدم رکھتا مجھے ایک حیران کُن منظر نظر آیا اور میں ٹھٹک کر ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ جولی کے ہاتھ میں چھوٹے سائز کا پسٹل تھا اور وہ بڑی خونخوار نظروں سے

شریف احمد کو دیکھ رہی تھی۔ شریف احمد کی کنپٹی سے خون بہہ کر اُس کے پورے رخسار کو رنگین کر رہا تھا اور اُس کی قمیض کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو جولی کے دوسرے ہاتھ میں ایک کینوس کا بیگ نظر آیا۔ وہ بڑی مضبوطی سے اس بیگ کو تھامے ہوئے تھی اور قدم قدم پیچھے ہٹ رہی تھی پیچھے ہٹتے ہوئے وہ پھنکاری ''نہیں شریفے! جو شخص اپنے باپ جیسے بھائی کو دھوکا دے سکتا ہے وہ مجھے کیوں نہیں دے سکتا...... رُک جاؤ اپنی جگہ پر، نہیں تو میں گولی چلا دوں گی۔''

غصے سے پھنکارتی ہوئی یہ جولی اُس جولی سے بہت مختلف تھی جو تھوڑی دیر پہلے شریف کا برتھ ڈے کیک کاٹ رہی تھی اور اُس کے بازوؤں میں لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ یہ ایک خطرناک عورت تھی جو نہ صرف پستول اٹھائے ہوئے تھی بلکہ اُسے چلا بھی سکتی تھی۔ اور یہ بات شریف احمد بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پیچ و تاب کھانے کے باوجود جولی سے دُور تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ پچھلے دس پندرہ منٹ میں جُولی اور شریف کے درمیان ایسی کیا بات ہوئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے ہو گئے ہیں اور جولی کے ہاتھوں میں پستول اور بیگ کہاں سے آئے ہیں؟ ہاں...... ایک قیافہ سا تھا کہ کینوس کے بیگ میں وہی رقم ہے جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے شریف نے کیا تھا اور اس وقت جُولی یہ رقم لے کر یہاں سے رفو چکر ہونا چاہ رہی ہے بالکل اُسی طرح جیسے وہ چند ماہ پہلے آٹو گراف کی کار لے کر رفو چکر ہو گئی تھی۔

وہ اُلٹے پاؤں ہٹتی ہوئی میری ہی طرف آ رہی تھی۔ میرے لیے اُس پر قابو پانا بالکل آسان تھا۔ درحقیقت وہ دونوں ایک دوسرے میں اتنے گم تھے کہ میری موجودگی سے قطعی بے خبر رہے تھے۔ جونہی جولی مجھ سے مناسب فاصلے پر پہنچی میں جھپٹ کر ستون کی اوٹ سے نکلا اور اُسے عقب سے دبوچ لیا۔ یہ بڑی مکمل گرفت تھی میرا بایاں ہاتھ اُس کی گردن سے لپٹ گیا تھا جبکہ دائیں ہاتھ نے اُس کی پستول والی کلائی دبوچ کر پستول کا رُخ چھت کی طرف کر دیا تھا۔ جُولی کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ اُس نے مچھلی کی طرح تڑپ کر خود کو میری گرفت سے نکالنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ پھر اُس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک پُر شور دھماکے سے گولی چھت میں لگی۔ میں نے ایک جھٹکے سے پستول اُس کے ہاتھ سے آزاد کرا لیا۔

شریف احمد حیرت سے گنگ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے وہ ہوش میں آیا اور چہرے پر مسرت کے تاثرات سجا کر میری طرف لپکا۔ ''خبردار'' میں نے گرج کر اس کی خوشی خاک میں ملا دی۔ ''اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ ورنہ بھیجہ دیوار سے چپکا نظر آئے گا۔''

وہ لرز کر اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ گولی کی آواز دُور تک گونجی تھی۔ چند ہی لمحے بعد کوٹھی کے

گیٹ پر دو تین متحرک سائے نظر آنے لگے۔ ہم چونکہ برآمدے میں تھے لہٰذا سڑک تک سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ پھر کسی شخص نے پکار کر پوچھا۔ ''یہ گولی کیسی چلی ہے جی؟''

ایک دوسرے شخص نے برآمدے کی طرف اشارہ کیا اور پکار کر بولا۔ ''وہ دیکھو وہاں کوئی کھڑا ہے۔''

میں جولی کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا باہر صحن میں لے آیا۔ شریف احمد بدستور پسٹل کی زد میں تھا۔ صحن میں چونکہ اب روشنی تھی۔ لہٰذا گیٹ پر سے ہم تینوں کو دیکھ لیا گیا۔ اب گیٹ پر سات آٹھ افراد اکٹھے ہو چکے تھے۔ اندر کی صورتِ حال دیکھنے کے بعد وہ سب بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ اس موقع پر شریف احمد نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے اُس کے پاؤں میں فائر کر کے اُسے دھمکا دیا۔

☆======☆======☆

جولی اور شریف احمد دونوں حوالات میں پہنچ گئے۔ جُولی نے جو بیگ تھام رکھا تھا اُس میں سے میری توقع کے عین مطابق کرنسی نوٹ برآمد ہوئے۔ یہ قریباً بیس ہزار کی رقم تھی جو آج کے پانچ چھ لاکھ سے کسی صورت کم نہیں تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ کرنسی نوٹ گڈیوں میں نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا کسی بہت بڑی دکان کے کیش بکس پر ڈاکہ مارا گیا ہے۔ یا بنک لوٹا گیا ہے اور کرنسی نوٹ چھوٹے ہوں یا بڑے جس حال میں ملے ہیں بیگ میں ٹھونس لیے گئے ہیں۔

تھانے پہنچ کر شریف احمد نے پہلے تو کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا، مگر جب پٹائی ہوئی تو اُس نے صرف اتنا اعتراف کیا کہ وہ ایک عرصے سے جُولی کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ اُس کے بڑے بھائی کی کار لے کر بھاگی ہوئی ہے مگر اُس نے پولیس میں اطلاع اس لیے نہیں دی کہ جُولی نے اُس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کار واپس لوٹا دے گی یا اُس کے عوض جتنی رقم کہی جائے گی دے دے گی۔ نوٹوں سے بھرے ہوئے بیگ کا وارث نہ تو شریف بن رہا تھا اور نہ جُولی۔ وہ دونوں یہ مدعا ایک دوسرے پر ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دلچسپ بات تھی۔ جس رقم کے لیے وہ کچھ دیر پہلے تک ایک دوسرے کی جان لے رہے تھے اب اُن کے لیے وبال جان تھی اور وہ اُس سے لاتعلقی ثابت کرنے کے لیے سو سو بہانے تراش رہے تھے۔

بہرطور جُولی کے اعصاب زیادہ دیر اُس کا ساتھ نہ دے سکے اور جب اُس کے لیے خاص قسم کی سپاہنوں (لیڈی پولیس) کو زحمت دی گئی تو وہ رُورعایت کے وعدے پر سب کچھ بکنے پر آمادہ ہو گئی۔ اُس نے لرزتے کانپتے اور زار و قطار روتے ہوئے جو کچھ بتایا اُس کا ایک حصہ تو اُس کی اپنی ذات کے بارے میں تھا، جس سے پتہ چلا کہ وہ کس طرح ایک لڑکے کے فریب

میں آئی اور گھر کی چار دیواری چھوڑ کر دربدر بھٹکنے پر مجبور ہوگئی۔ اپنی روئیداد کے دوسرے حصے میں اُس نے شریف احمد کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ اپنا آپ چھپانے کے لیے شریف احمد نے جو کچھ اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا جولی نے اپنی باتوں سے اُس کے چیتھڑے اڑا دیے۔ اُس نے بتایا کہ شریف احمد ایک انتہائی خود غرض اور لالچی شخص ہے۔ وہ اپنے مفاد کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا چاہے یہ موقع حاصل کرنے کے لیے اُسے اپنے کتنے بھی قریبی رشتے کی قربانی دینی پڑے۔ اس مفاد پرستی کی تازہ ترین مثال اُس کے بھائی آٹوگراف والا معاملہ ہے۔ اپنے بھائی سے اُس کی ساری محبت اور ہمدردی منافقت تھی۔ جب ذکی احمد نے اُسے پیسے کی چمک دکھائی تو وہ اپنے ہی ''جان سے پیارے'' بھائی کا دشمن نمبر ایک بن گیا۔ اُس نے ذکی احمد سے بیس ہزار روپیہ وصول کرنے کے بعد عہد کیا کہ وہ آٹوگراف کو اس قابل نہیں چھوڑے گا کہ وہ دوبارہ اسٹوڈیو کا رُخ کر سکے۔ اُسے ہمیشہ کے لیے اپاہج کر دے گا اور ایسا نہ کر سکا تو اُس کی جان لے لے گا اور اگر یہ دونوں کام اُس سے نہ ہو سکے تو جتنی رقم اُس نے ذکی احمد سے لی ہے اُس سے دوگنی واپس کرے گا۔

معاوضہ وصول کرنے کے بعد فوراً وہ اپنے بھائی کی جان کا دشمن ہوگیا۔ جس حملے میں آٹوگراف کی ٹانگ ٹوٹی وہ شریف احمد کی شہہ پر ہی ہوا تھا۔ شریف احمد نے نہ صرف حملہ آوروں کو ضروری معلومات فراہم کیں بلکہ گھر کے اندر گھسنے میں بھی ان کی مدد کی۔ بعدازاں جب آٹوگراف زخمی ہو کر ہسپتال جا پڑا تو اُسے بیڈ سے گرا کر دوبارہ زخمی کرنے والا بھی شریف ہی تھا۔ وہ اپنے مقصد میں قریباً کامیاب ہو چکا تھا کیونکہ آٹوگراف کا زخم بری طرح بگڑ گیا تھا اور ڈاکٹر اس کی ٹانگ کاٹنے کا سوچ رہے تھے لیکن پھر مشتاق شاہ کی مداخلت پر میں آٹوگراف کو ملٹری ہسپتال لے گیا اور یوں بہتر علاج کے سبب اُس کی ٹانگ ضائع ہونے سے بچ گئی۔ اس موقع پر شریف پر جھلاہٹ سوار ہو چکی تھی۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ آٹوگراف کا گلا گھونٹ دیتا۔ آخر اُس نے یہ قاتلانہ قدم بھی اُٹھا ہی ڈالا۔ اپنا کام ''نبٹانے'' کے لیے وہ بھائی کو ابدی نیند سلانے پر آمادہ ہوگیا۔ اس موقعے پر اُس نے بڑی ذہانت سے منصوبہ بندی کی۔ وہ بھائی کو کھانے میں زہر دینا چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ اس سلسلے میں وہ خود بھی مشکوک ٹھہر سکتا ہے لہٰذا اُس نے تھوڑا سا رِسک لینے کا فیصلہ کیا۔ رِسک یہ تھا کہ بھائی کا بچا ہوا بہت تھوڑا سا کھانا اُس نے خود بھی کھا لیا۔ کھانے کی مقدار اتنی تھوڑی تھی کہ اُسے جان کے لالے نہیں پڑ سکتے تھے۔ ہاں وہ بیمار ہو سکتا تھا۔ یہ سارا کام اُس نے بہت سوچ سمجھ کر اور زہر فروش سے مشورے کے بعد کیا تھا لہٰذا وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ پولیس کی تفتیش غلط راستوں پر نکل

گئی اور شریف نے چند روز علیل رہنے کے بعد پھر سے چین اور ''عیش'' کی بانسری بجانی شروع کر دی۔ بہرحال عیش و عشرت کے اس کباب میں فکرمندی کی ہڈی بھی شامل تھی اور وہ فکرمندی آٹوگراف کی جانب سے تھی۔ وہ نہ تو جان سے گیا تھا اور نہ مکمل طور پر اپاہج ہوا تھا۔ شریف کو خدشہ تھا کہ اُس کا علاج معالجہ ہوتا رہا تو ایک دن وہ پھر بھلا چنگا ہو جائے گا اور اُس نے ذکی احمد سے جو عہد کر رکھا ہے وہ پورا نہیں ہو سکے گا...... وہ تازہ کوشش کرنے سے بھی خوفزدہ تھا لہٰذا اُس نے فیصلہ کیا کہ رقم اور جولی کے ساتھ راہِ فرار اختیار کی جائے لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ جس طرح وہ اپنے بھائی سے غداری کر رہا ہے جولی بھی اُس سے وفادار نہیں ہے۔ وہ شاطر لڑکی پورے بیس ہزار پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ جب کوٹھی چھوڑنے کا وقت آیا اور شریف نے رقم والا تھیلا ہاتھ میں لیا تو جولی نے ہاتھ میں پستول لے لیا۔ اگر میں موقعے پر موجود نہ ہوتا تو وہ یقیناً رقم والے بیگ کے ساتھ فرار ہو چکی ہوتی۔

☆======☆======☆

جولی کا مکمل بیان لینے کے بعد میں ہسپتال پہنچا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ معلوم ہوا کہ آٹوگراف اپنے بیڈ پر موجود نہیں ہے۔ وہ شام سے کچھ دیر بعد کسی طرح ہسپتال سے نکل گیا تھا اور اب عملہ اُسے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود نرس نے بتایا کہ وہ دوپہر سے اپنے بھائی کو یاد کر رہا تھا۔ بار بار اُس کا نام پکارتا تھا اور رونے لگتا تھا۔

درحقیقت شریف احمد سے اُسے چند لحوں کی جدائی بھی گوارا نہیں تھی۔ پہلے بھی اُسے شریف سے کم محبت نہیں رہی ہوگی لیکن بیمار ہونے کے بعد وہ اُس سے کچھ زیادہ ہی وابستہ ہوگیا تھا۔ ہر وقت اسے پہلو سے لگائے رکھتا تھا۔ اُس کے نزدیک شریف احمد کے علاوہ کوئی اُس کا خیرخواہ اور ہمدرد نہیں تھا...... اب وہ اُسے ڈھونڈنے نکل گیا تھا اور خبر نہیں کہ سخت سردی میں کہاں مارا مارا پھر رہا تھا...... اب صبح ہونے والی تھی ہم بھی اُس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ میرے ساتھ انور علی کے علاوہ سادہ لباس میں دو سپاہی بھی تھے۔ ہم ایک پرائیویٹ کار میں سوار تھے اور پنڈی کی مختلف سڑکوں پر چکرا رہے تھے۔ دفعتہً میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا اور اُس نے گاڑی کا رُخ اسٹیشن کی طرف پھیر دیا۔ عین ممکن تھا کہ ابدال عرف آٹوگراف پنڈی چھوڑنے کی کوشش کرتا۔ ایسی صورت میں وہ اسٹیشن کی طرف جا سکتا تھا۔

اسٹیشن کے اندر اور اردگرد کے علاقے میں ہم نے آٹوگراف کو بہت تلاش کیا لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ جب ہم پھر گاڑی میں بیٹھ رہے تھے ایک اُونچا لمبا مونچھوں والا شخص ہانپتا

ہوا میرے پاس پہنچا اور کھٹاک سے سیلوٹ کر کے اسلامُ علیکم کہا۔ میں اُسے پہچان گیا وہ ریٹائرڈ فوجی شبیر خان تھا اور میڈم شاہ کا باڈی گارڈ سمجھا جاتا تھا۔ اسٹوڈیو میں میں کئی مرتبہ اُسے میڈم شاہ کے حسین سراپے کی حفاظت کرتے دیکھ چکا تھا۔ اُس نے اپنے مخصوص لہجے میں سرگوشی کی۔

''جاوید صاحب! جس بندے کو آپ ڈھونڈتا ہے وہ اس وقت ہماری بیگم صاحبہ کا کوٹھی میں ہے۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے بیگم صاحبہ نے اُسے ننگے پاؤں اور ننگے سر صدر کے علاقے میں گھومتے دیکھا تھا۔ آیئے ہم آپ کو اُس سے ملاتا ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ میڈم شاہ ان دنوں پنڈی میں ہے لیکن یہ گمان نہیں تھا کہ آٹو گراف جو پورے پنڈی میں نہیں ملا میڈم شاہ کے پاس ملے گا۔ ہم نے شبیر خان کو گاڑی میں بٹھا لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد اُس کوٹھی کے صدر دروازے پر پہنچ گئے جس کی نیم پلیٹ پر ''نبیلہ لاج'' کے سنہری الفاظ چمک رہے تھے۔ ہماری گاڑی گیٹ پر رُکی تو اندر سرسبز لان میں ہلچل کے آثار دکھائی دیے۔ میں نے آٹو گراف کو دیکھا۔ وہ ابھی تک ہسپتال کے لباس میں تھا۔ اُس کے ساتھ میڈم شاہ تھی۔ اُس کے لمبے ریشمی بال براؤن اوورکوٹ کے شانوں پر بکھرے تھے وہ آٹو گراف کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ وہ اُس کے ہاتھوں سے نکل نکل کر جا رہا تھا۔

''چھوڑ دے مجھے۔'' وہ چیخ کر بولا۔ ''مجھے نفرت ہے تجھ سے اور تیری صورت سے مت ہاتھ لگا مجھے۔'' اُس نے میڈم شاہ کو زور سے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی گلاب کے پودوں پر جا گری پھر وہ تیز قدموں سے بلکہ بھاگنے والے انداز میں گیٹ کی طرف بڑھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کا راستہ روک لیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ابدال عرف آٹو گراف نبیلہ لاج کے وسیع ڈرائینگ روم میں سامنے بیٹھا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان تند و تیز مکالموں کا تبادلہ ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی لال لال آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ میڈم شاہ جس کو تم بار بار دھتکار رہے ہو، جانتے ہو کون ہے؟ یہی وہ تمہاری خیر خواہ ہے جو قدم قدم پر تمہارا ساتھ دے رہی ہے۔ تمہاری حفاظت کر رہی ہے، تمہارے دشمنوں سے دشمنیاں مول لے رہی ہے۔ اس عورت کے اتنے احسان ہیں تم پر کہ تم انہیں شمار نہیں کر سکتے...... اس عورت سے کچھ عرصہ پہلے ایک غلطی ہوئی تھی اور وہ غلطی یہ تھی کہ وہ تمہاری بیوقوفی پر طیش میں آ گئی تھی اور اُس نے تمہیں تھپڑ مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ بعد میں اُسے اپنے کیے پر شرمندگی ہوئی اور اس نے کفارہ ادا کرنا چاہا۔ وہ یہ کفارہ تم سے معافی مانگ کر یا تمہاری مٹھی میں چند سو روپے تھما کر بھی ادا کر سکتی تھی۔ مگر وہ ایک بڑی عورت تھی۔ اُس نے اس کفارے میں تمہاری زندگی سنوارنا

چاہی اور وہ بھی اس طرح کہ تمہاری عزت نفس پر کوئی اور دھبہ نہ لگے۔ تم اس عورت کو اتنا نہیں جانتے جتنا میں جانتا ہوں۔ اس عورت نے پس پردہ رہ کر ہر ہر قدم پر تمہیں زینہ فراہم کیا ہے۔ وہ نہایت خاموشی اور بے لوثی سے تمہیں سہارا دیتی رہی۔ تم اپنی ترقی پر اتراتے تھے لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ پچھلے ڈھائی تین برسوں میں تمہیں جو بھی اچھے رول ملے اُن میں کسی نہ کسی طرح اس عورت کا تعاون شامل تھا۔ وہ تمہارے لیے سوچتی رہی ہے اور تمہاری زندگی کو پلان کرتی رہی ہے۔ مجھ سے مت پوچھو کہ اُس نے تمہارے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ میں بھی تمہارے لیے جو کچھ کرتا رہا ہوں وہ میں نے نہیں اُس نے کیا ہے۔ اُسی کے کہنے پر کیا ہے۔ مشہور پولیس آفیسر مشتاق شاہ کا نام تو سنا ہو گا تم نے بھی وہ نبیلہ شاہ کے سگے چچا ہیں۔ انہی کے حکم پر میں نے حملہ آوروں سے تمہاری جان بچائی تھی اور بعد میں تمہیں ملٹری ہسپتال لے کر آیا تھا......''

میں بولتا رہا اور آٹو گراف کب تک سنتا رہا۔ اُس کا چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ میں نے کہا ''صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرنے والے ہمیشہ تمہاری طرح دھوکہ کھاتے ہیں جس کو تم اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے وہ تمہاری سچی خیر خواہ اور ہمدرد تھی اور جو تمہیں جان سے بڑھ کر عزیز اور پیارا تھا، وہ تمہارا سب سے بڑا بدخواہ اور تمہارے خون کا پیاسا تھا...... جانتے ہو میرا اشارہ کس کی طرف ہے؟ میرا خیال ہے نہیں جانتے۔ یہ وہی شخص ہے جسے ڈھونڈنے کے لیے تم ننگے پاؤں ہسپتال سے نکل آئے ہو۔ تمہارا بھائی تمہاری آنکھوں کا تارا، شریف احمد۔'' آٹو گراف کا منہ کھل گیا اور رنگ سرسوں کی طرح زرد پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ''وہ اس وقت تمہاری سابق محبوبہ جُولی کے ساتھ تھانہ صدر کے حوالات میں بند ہے اور اقبال کر چکا ہے کہ تمہیں بستر سے گرا کر دوبارہ زخمی کرنے والا اور بعدازاں زہر دینے والا وہی تھا......''

ابھی میرے فقرے کی بازگشت کمرے میں تھی کہ ابدال عرف آٹو گراف نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی مسلی اور چکرا کر صوفے پر گر گیا۔

☆======☆======☆

قدرت کیسے کیسے طریقوں سے انسانوں کی قسمتیں بگاڑتی اور سنوارتی ہے۔ ہونیاں، انہونیاں بن جاتی ہیں اور انہونیاں حقیقتوں کا رُوپ دھار لیتی ہیں۔ ابدال عرف آٹو گراف کے دوستوں نے اُس سے ایک بے رحمانہ مذاق کرتے ہوئے اُسے میڈم شاہ کی طرح بھیجا تھا لیکن اس بے رحمانہ مذاق نے آخر کار اُس کی قسمت سنوار دی۔ فلمی دُنیا جو ہمیشہ سے حیران کن واقعات کا محور رہی ہے جون 1938ء میں ایک اور ڈرامائی واقعے کی شاہد بن گئی۔ میڈم شاہ اور

ابدال عرف آٹوگراف رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ آٹوگراف کی ذہنی حالت اب پہلے سے بہتر تھی۔ ٹانگ کا زخم بھی بھر گیا تھا اور وہ بیساکھیوں کے بغیر با آسانی چل سکتا تھا۔ شادی کے بعد میڈم شاہ اُسے مزید علاج معالجے کے لیے لندن لے گئی۔

اس ساری روئیداد میں ایک بات ابھی وضاحت طلب ہے۔ قارئین کے ذہن میں سوال پیدا ہوا ہو گا کہ آٹوگراف کا حریف ذکی احمد جو خود بھی ایک معاون اداکار تھا اتنا صاحب حیثیت کیسے ہو گیا کہ اُس نے شریف احمد کو آٹوگراف کے قتل کے لیے بیس ہزار روپے دے دیے۔ اس سوال کا جواب بھی مجھے جولی نے ہی دیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ذکی احمد جوئے کا رسیا تھا اور ستاروں کی چالوں پر بھی بہت یقین رکھتا تھا۔ جب اُس کے اور شریف احمد کے درمیان آٹوگراف کے خلاف ہونے والی سازش کا تانا بانا بُنا جا رہا تھا ایک دن وہ دونوں ایک جوئے خانے پر گئے۔ ذکی احمد نے شریف سے کہا۔ ''چلو آج کھل کھلا کر کھیلتے ہیں۔ ستارے میرے حق میں ہیں۔ آج میں ضرور جیتوں گا۔ صبح تک میں جتنا بھی جیتوں وہ سب تمہارا ہو گا۔ اس کے بدلے تم آٹوگراف کا قصہ پاک کرو گے۔'' شریف نے ہامی بھر لی۔ جوئے خانے کی وہ رات واقعی ذکی احمد کی رات ثابت ہوئی۔ اُس نے ایک مشہور ایکٹر اُس کی بیوی اور ایک پروڈیوسر سے بیس ہزار روپے جیت لیے۔ اتنی بڑی رقم جیتنے کے بعد اُس کی نیت میں خلل آ گیا لیکن شریف احمد بھی ایک کایاں تھا۔ اُس نے ذکی کو وعدہ خلافی نہیں کرنے دی اور جیتے ہوئے سارے کرنسی نوٹ کینوس کے تھیلے میں بھر کر اپنے ساتھ لے آیا...... پھر نہ وہ نوٹ رہے نہ جولی جیسی چمکیلی محبوبہ رہی، نہ بھائی رہا نہ آزادی رہی۔ شریف احمد کا سب کچھ اس کی بدنیتی کے ریلے میں بہہ کر اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆======☆======☆

محبوب، محبوبہ اور شوہر

پچھلی دفعہ میں نے گوبند سنگھ نامی نوجوان کا ذکر کیا تھا۔ ارائیں گھرانے کا یہ لڑکا ایک دوڑ کے دوران گم ہو گیا تھا اور کوشش کے باوجود مل نہیں سکا تھا۔ گوبند کے ساتھ ''شاہی'' نام کے غنڈے کا ذکر بھی آیا تھا۔ شاہی ایک بھگوڑا فوجی تھا اور خود کو ڈوگرا بتاتا تھا۔ اس کے پاس ہر وقت ایک تلوار رہتی تھی اور مشہور تھا کہ وہ تلوار کے مقابلے میں اپنے سامنے کسی کو ٹکنے نہیں دیتا۔

گوبند کو گم ہوئے قریباً آٹھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک روز علاقے کا ایک مشہور جیب کترا جیکی میرے پاس آیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ عیسائی تھا۔ ڈلہوزی کے بدقماش افراد میں اُس کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور اردگرد کا ہر بدنام اڈہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ جیکی جیسے لوگ اپنی مرضی سے تھانوں کا رُخ کم ہی کرتے ہیں۔ اور جب کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ضرور کوئی اہم بات ہے۔ جیکی بھی ایک اہم معاملہ لے کر تھانے آیا تھا۔ رسمی بات چیت کے فوراً بعد وہ اصل موضوع پر آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''جنابِ عالی! میں ایک بڑی خاص خبر لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے آپ کا ٹائم بڑا قیمتی ہے۔ اگر یہ خبر خاص نہ ہوتی تو میں کبھی آپ کو تکلیف نہ دیتا۔'' ایک لمحے کے لیے رُک کر اُس نے گلا صاف کیا اور میز پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''جناب کل ہفتہ تھا۔ ہر ہفتے کی شام ''صدر'' کے ایک چائے خانے میں ناچ گانے کی محفل جمتی ہے۔ چائے خانے کے مالک کا نام گلزار خاں ہے۔ میرا خیال ہے آپ اُسے جانتے ہی ہوں گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... ہاں، تم آگے بولو۔''

وہ کہنے لگا۔ ''کل رات وہاں شاہی بھی موجود تھا۔ ناچ گانے کے بعد تاش کی بازی ہونے لگی۔ شاہی بھی کھیل رہا تھا۔ اُس نے رم کے کئی گلاس چڑھائے ہوئے تھے اور نشے میں دُھت تھا۔ کھیل کے دوران اس کا مہیش نامی ایک پٹھانکوٹی سے جھگڑا ہو گیا۔ دراصل مہیش نے کھیل میں بے ایمانی کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاہی آگ بگولا ہو گیا اس نے اُٹھ کر

میز الٹا دی اور مہیش کو گالیاں دینے لگا۔ گرماگرمی میں اُس کے منہ سے ایک عجیب بات نکل گئی کہنے لگا۔ ''یہ جوا ہے اور جوئے میں دھوکہ کرنے والے کا میں منہ توڑ دیتا ہوں۔ اُس حرامی گوبند کا نام سنا ہو گا تم نے۔ اُس نے بھی دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کتے کے پلے کا نشان مٹا دیا میں نے۔'' نشے کی وجہ سے اُسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا کہہ گیا ہے۔ موقعے پر موجود جن لوگوں کو اُس کی بات سمجھ میں آئی وہ حیرانی سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ حیران ہونے والوں میں مَیں بھی شامل تھا جنابِ عالی...... کل سے سوچ رہا تھا کہ اس بات کی اطلاع آپ کو ملنی چاہیے۔ گوبند ہمارے محلے کا لڑکا تھا۔ زیادہ میل جول نہ سہی، علیک سلیک تو تھی۔ ہمیں اُس کے نہ ملنے کا دُکھ ہے۔ اُس کی بوڑھی ماں کو دیکھتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔''

جیکی اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا اور میں ذہن میں زبردست ہلچل محسوس کرنے لگا۔ یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی اور جیکی کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے درست ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجرم کوئی جرم کرتا ہے اور جب جرم کرنے کے کافی عرصے بعد تک بھی اُسے کوئی سزا نہیں ملتی تو وہ اپنے جرم کے بارے میں لاپرواہ ہو جاتا ہے اور کسی وقت شیخی میں آ کر جرم کا اعلان بھی کر دیتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی کیس نظر آ رہا تھا۔ شاہی نشے میں تھا اور غصے کی حالت میں اُس کی زبان سے ایک نہایت اہم بات نکل گئی تھی۔ میں نے جیکی سے کچھ تفصیلات پوچھیں اور اس کے فوراً بعد شاہی پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسا کہ میں نے پچھلی کہانی میں بتایا تھا شاہی نے تیمور والے کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری کرائی تھی لیکن یہ ایک بالکل دوسرا معاملہ تھا۔ اور اس میں مَیں بلا روک ٹوک شاہی کو ہتھکڑی لگا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا شاہی ایک خطرناک غنڈہ ہے اور آسانی سے گرفتاری نہیں دے گا۔ لہٰذا میں نے خود اس کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک حوالدار اور دو کانسٹیبل لے کر میں اُس کی طرف روانہ ہوا۔ جیکی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ ''شاہی'' اس وقت اپنے ڈیرے پر ہو گا اس کا ڈیرہ ''ست دھارا'' کے راستے میں پیر توکل کے مزار کے قریب تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈیرے پر ہر وقت لوفروں کا مجمع لگا رہتا ہے اور ان لوفروں میں بعض اوقات خطرناک غنڈے بھی اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ڈیرے میں گھس کر شاہی پر ہاتھ ڈالنا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے شاہی کو کسی بہانے ڈیرے سے باہر بلایا جائے اور پھر موقع دیکھ کر ہتھکڑی ڈال دی جائے۔ اس مقصد کے لیے ہیڈ کانسٹیبل قادری کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔ قادری صرف دو روز پہلے میرے تھانے میں تبدیل ہو کر آیا تھا۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں

تھا کہ وہ پولیس کا آدمی ہے۔ میں اُسے سادہ کپڑوں میں لایا تھا۔ وہ اندر جا کر شاہی کو بہانے سے باہر لا سکتا تھا۔ قادری کو پوری بات سمجھا کر میں نے شاہی کے ڈیرے پر بھیج دیا اور خود قریبی درختوں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ حوالدار پربت سنگھ اور ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل کے پاس تھری ناٹ تھری رائفل اور میرے پاس 38 بور کا ریوالور تھا۔ گاڑی ہم نے قریباً ایک فرلانگ پیچھے ہی کھڑی کر دی تھی اور امید نہیں تھی کہ وہ شاہی یا کسی دوسرے شخص کی نظر میں آ سکے گی۔

ہیڈ کانسٹیبل قادری اندر چلا گیا اور ہم پوری طرح چوکس ہو کر شاہی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ قریباً پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ شاہی نکلا نہ قادری کی صورت نظر آئی اور نہ ہی کوئی تیسرا شخص دکھائی دیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو سمجھایا تھا کہ وہ اندر پہنچتے ہی شاہی سے بات کرے اور اُسے بتائے کہ پشاور سے دو آدمی اُسے ملنے آئے ہیں۔ وہ ڈیرے پر آنا نہیں چاہتے اس لیے باہر کھڑے ہیں (پشاور میں کچھ جرائم پیشہ لوگوں سے شاہی کے تعلقات تھے اور مجھے امید تھی کہ پشاور کے مہمانوں کا ذکر سن کر وہ افراتفری میں باہر آ جائے گا) میرا خیال تھا کہ شاہی کے باہر آنے میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے...... لیکن اب آٹھ منٹ ہونے کو آئے تھے۔ گزرنے والے ہر سیکنڈ کے ساتھ ہماری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ یقیناً اندر کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ چند ہی لمحے بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اچانک ڈیرے کا بیرونی پھاٹک ایک جھٹکے سے کھلا اور کوئی شخص لڑھکتا ہوا باہر آ گرا۔ میں نے سفید لباس سے پہچانا، وہ قادری کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یوں لگا جیسے قادری نے بھاگ کر پھاٹک سے گزرنے کی کوشش کی اور کسی نے زوردار طریقے سے اُسے دھکا دے دیا۔ جونہی قادری دوبارہ اٹھا تین افراد بھوکے کتوں کی طرح اُس سے لپٹ گئے۔ وہ اُسے مار رہے تھے اور کھینچ کر پھر اندر لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں شاہی بھی تھا۔ اپنے لمبے قد اور چمکتی ٹنڈ کی وجہ سے وہ صاف پہچانا جا رہا تھا۔

قادری کی مار پٹائی کا منظر دیکھ کر ہمارے لیے خاموش کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ نہ ہی یہ سوچنے کا وقت تھا کہ اس مار پٹائی تک نوبت کیونکر اور کیسے پہنچی۔ میں نے ریوالور ہولسٹر سے باہر کیا اور تیزی سے لپک کر شاہی وغیرہ کے سر پر پہنچ گیا۔ رائفل بدست ہیڈ کانسٹیبل اور حوالدار میرے پیچھے تھے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی شاہی طیش سے سرخ ہو گیا۔ وہ ایک سر پھرا خطرناک غنڈہ تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا ان سنگین لمحات میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ریوالور کی لبلبی پر میری انگلی پوری طرح تیار تھی۔

''خبردار شاہی! پیچھے ہٹ جاؤ۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ شاہی رُخ پھیر کر بھاگ نکلے گا لیکن اگلے ہی لمحے اُس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ کوئی معمولی بدمعاش نہیں تھا۔ ڈلہوزی کا ''بہرام شاہ'' تھا۔ وہ یوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتا تو کیا ''عزت'' رہ جاتی اس کی...... اُس نے بھاگنے کی بجائے مجھے بھگانے کا فیصلہ کیا اور ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنے پہلو سے بندھی ہوئی تلوار بے نیام کر لی۔ وہ کوئی تین فٹ لمبی خم دار تلوار تھی اور پارے کی طرح چمک رہی تھی۔ اور یہ تلوار ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جو اسے استعمال کرنے کا فن بھی جانتا تھا۔ میں نے شاہی کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی دیوانگی دیکھی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولی چلا دی۔ دھماکے کے ساتھ آدھ انچ لمبا سکہ شاہی کی کلائی میں گھس گیا۔ اس نے تڑپ کر تلوار دوسرے ہاتھ میں تھامنی چاہی لیکن عین اُس لمحے میں جب تلوار پر کسی ہاتھ کی گرفت بھی مضبوط نہیں تھی میرے ہیڈ کانسٹیبل نے ٹانگ چلائی اور اُس کی ٹھوکر سے تلوار ہوا میں اُڑ گئی۔ میں نے جست لگا کر شاہی کو دبوچ لیا اور پھر فوراً ہی ایک فٹ زمین سے اوپر اٹھا کر پٹخ دیا۔ شاہی کے ایک ساتھی نے ہیڈ کانسٹیبل پر چاقو سے وار کرنا چاہا لیکن رائفل کی دھمکی کام آئی اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ میرا گھٹنا شاہی کی گردن پر تھا اور ریوالور اُس کی کنپٹی سے لگا ہوا تھا۔ اپنے سرغنہ کو اس حالت میں دیکھ کر کسی چمچے چانٹے کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ پولیس پارٹی پر حملہ کر سکتا۔ میرے گرانڈیل حوالدار نے شاہی کا ایک بازو مروڑ کر اپنے گھٹنے کے نیچے دبایا اور اُسے ہتھکڑی لگا دی۔ شاہی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ کشمیری کے علاوہ اُردو اور ہندی میں بھی گالیاں بک رہا تھا۔

☆======☆======☆

شاہی جیسے غنڈوں کو سیدھا کرنے کے لیے پولیس کے پاس بہت ہتھکنڈے ہوتے ہیں۔ میں نے کوشش کی کہ مجھے شاہی پر کوئی ایسا ہتھکنڈا استعمال نہ کرنا پڑے لیکن جب وہ کسی طور قابو میں نہیں آیا تو میں نے حوالات میں اُسے حوالدار پربت سنگھ اور اس کے تین ماتحتوں کے حوالے کر دیا۔ پربت سنگھ حوالاتیوں کے لیے عزرائیل سمجھا جاتا تھا۔ میری ماتحتی میں آ کر وہ ایک عرصے سے بیکار ہی تھا۔ مدت بعد جب اُسے کام ملا تو اُس نے خوب دل لگا کر کیا۔ شاہی کو ایسی فنکارانہ پھینٹی لگائی گئی کہ 48 گھنٹے کے اندر اندر اُس کی ساری اکڑفوں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی اور وہ اپنی جان حوالدار کے پنجے سے چھڑانے کے لیے سب کچھ اُگلنے پر راضی ہو گیا۔ حوالدار کا کمال یہ تھا کہ اُس کی لگائی ہوئی پھینٹی کا نشان تک حوالاتی

کے جسم پر نہیں ملتا تھا۔ یعنی بقول شاعر تم قتل کرو ہو کہ کمالات کرو ہو۔ میں شاہی کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ نہ اُس کے چہرے پر کوئی نشان تھا نہ ہاتھ پاؤں پر نہ جسم کے کسی اور حصے پر لیکن وہ چوٹوں سے چور چور نظر آتا تھا۔ شاہی کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ 48 گھنٹے حوالات میں مار کھاتا رہا ہے اس کے باوجود اُس کے مالکوں میں سے کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ جیسا کہ قارئین پچھلی کہانی میں پڑھ چکے ہیں شاہی کے مالک سردار اشوک وغیرہ تھے لیکن یہ لوگ شاہی کے غیر قانونی کاموں میں اُس کا بچاؤ کرنے پر تیار نہیں تھے۔ سردار اشوک ایک بھلا مانس آدمی تھا اور وہ صاف طور پر مجھ سے کہہ چکا تھا کہ اگر ''شاہی'' مجرم ہے تو اُسے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔ اور اب حسن اتفاق سے شاہی کے جرم کا انکشاف اُس کی اپنی زبان سے ہو گیا تھا۔ بھری محفل میں اُس نے کہا تھا کہ گوبند سنگھ کے ساتھ اُس نے ''کچھ کیا'' ہے۔ سردار اب اس کی مدد کو کیسے آسکتے تھے۔

اپنے دفتر میں مَیں نے شاہی سے پوچھ گچھ کی۔ اُسے بدستور ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ اُسی لباس میں تھا جس میں گرفتار ہوا تھا۔ یہ ایک خاص قسم کی دھوتی ہوتی ہے جس کے ایک پلو کو ٹانگوں کے درمیان سے گزار کر پیچھے کمر میں اُڑس لیا جاتا ہے۔

اس دھوتی کے اوپر شاہی کھلی آستین والا ایک کڑھائی دار کرتہ پہنتا تھا۔ سخت سردی میں بھی وہ اکثر اسی لباس میں دکھائی دیا کرتا تھا۔ میں نے شاہی سے کہا۔ ''حوالدار پربت سنگھ بتا رہا تھا کہ تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو۔''

اُس نے کینہ پرور نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''انسپکٹر نواز! تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''بے شک برے کام کا نتیجہ برا ہی نکلتا ہے۔ اگر میں نے کوئی برا کام کیا ہے تو اُس کی سزا مجھے ضرور ملے گی..... جیسے تمہیں ملی ہے۔''

وہ غصے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں کہ مجھے تم پر ترس آرہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ترس تو مجھے بھی تم پر آرہا ہے لیکن اگر تم اسی طرح میرا وقت ضائع کرتے رہے تو مجھے پھر تمہیں حوالدار پربت کے حوالے کرنا پڑے گا۔''

اُس نے ایک بہت گہری سانس لی اور ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولا۔ ''اس وقت کو یاد رکھنا انسپکٹر! اس وقت کو بھولنا مت۔''

وہ مجھے ایک خوفناک دھمکی دے رہا تھا۔ میں ایسی بہت سی دھمکیاں سن چکا تھا اور ان

سے نبٹ چکا تھا لہٰذا میں نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ پولیس کے پیشے میں بندہ ایسی دھمکیوں سے بر کنے لگے تو پھر اُسے ٹریفک پولیس میں چلے جانا چاہیے یا چھٹی کر کے گھر بیٹھ جانا چاہیے۔ خاص طور پر ایماندار ملازموں کے لیے یہ پولیس لائن ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سخت ہے۔ میں نے بے مروت انداز میں کہا۔ ''شاہی! تم بیان دے رہے ہو یا تمہیں باہر بھیج دوں۔''

وہ بولا۔ ''بیان دینے کے لیے ہی تو آیا ہوں صاحب۔ لو..... لکھو بیان۔''

''ہاں بولو''۔ میں نے کہا۔

وہ کہنے لگا۔ ''گوبند کے گم ہونے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ میرا اُس سے جھگڑا ہوا تھا۔''

''کب ہوا تھا یہ جھگڑا اور کیوں؟''

''یہ جھگڑا مارچ کی کسی تاریخ کو ریس والے دن ہوا تھا، اور اس لیے ہوا تھا کہ گوبند نے زبان دے کر بے ایمانی کی تھی..... تم میرے منہ سے ایمان داری اور بے ایمانی کی بات سن کر حیران ہو رہے ہو انسپکٹر! لیکن اتنا تو تم بھی جانتے ہو گے کہ بے ایمانی کے کام بھی ایمانداری سے ہی کیے جائیں تو کام چلتا ہے۔ غنڈوں بدمعاشوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اور بے اصول غنڈہ.....''

''مجھے لیکچر مت دو۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''سیدھی بات بتاؤ۔ گوبند سے جھگڑا کیوں ہوا؟''

شاہی نے جبڑے زور سے بھینچ کر اپنی تلخی پر قابو پایا اور بولا۔ ''گوبند کے اور میرے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ گوبند یہ ریس ہارے گا اور زیادہ سے زیادہ تیسرے نمبر پر آئے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈلہوزی کے دو بڑے سیٹھوں..... میاں شاہنواز اور سیٹھ کرم چند میں ایک بڑی شرط لگی ہوئی تھی۔ شرط یہ تھی کہ اگر گوبند اُس ریس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر آتا تو سیٹھ کرم چند نے میاں شاہنواز کو دس ہزار روپے دینا تھا۔ دوسری صورت میں یہ رقم میاں شاہنواز نے ادا کرنا تھی۔ سیٹھ کرم چند کو دس ہزار روپیہ جانے کا فکر نہیں تھا وہ ہر صورت میاں شاہنواز کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ دراصل یہ شرط اچانک ہی بحثا بحثی میں لگ گئی تھی اور دونوں سیٹھوں نے اسے عزت بے عزتی کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ سیٹھ کرم چند نے یہ ہوشیاری دکھائی کہ اُس نے شرط کا دس ہزار روپیہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور میں نے اُسے ضمانت دے دی کہ گوبند اس ریس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر نہیں آئے گا۔ گوبند کو اس ریس میں ہرانے کے

میرے پاس بہت سے طریقے تھے لیکن میں نے کوئی غلط طریقہ استعمال نہیں کیا اور نہ ہی میں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بغیر کسی ہیر پھیر کے گوبند سے بات کی اور اُسے کہا کہ ریس میں اُس کا ہارنا یقینی ہے۔ شیکھر اور تیمور جیسے لڑکوں کے ہوتے ہوئے وہ پہلے نمبر پر کبھی نہیں آ سکتا...... ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ قسمت اُس کا ساتھ دے اور وہ دوسرے یا تیسرے نمبر پر آ جائے۔ میں نے اُس سے کہا کہ اگر وہ ریس میں تیسرے نمبر سے آگے نہ جائے تو میں پانچ ہزار روپیہ یکمشت اُسے ادا کردوں گا۔ بات گوبند کی سمجھ میں آ گئی۔ اس ریس میں ایسے گھپلے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اُسے پیسوں کی ضرورت بھی تھی اور یہ بھی وہ جانتا تھا کہ ریس جیتنا اُس کے لیے بہت مشکل ہے۔ اُس نے یہ سودا قبول کرلیا۔ میں نے اُس کے کہنے پر ڈھائی ہزار روپیہ اُسے پہلے دے دیا بقایا ڈھائی ہزار ریس کے بعد دینا قرار پایا۔ گوبند نے مجھ سے وعدہ کرلیا کہ وہ ریس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر نہیں آئے گا لیکن وہ تیسرے چوتھے نمبر پر آ کر اپنی ہتک کرانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ریس سے ویسے ہی آؤٹ ہو جائے گا۔ کوئی مناسب موقع دیکھ کر وہ راستے سے ہٹ جائے گا اور بعد میں کوئی ناٹک رچا دے گا جس سے پتہ چلے کہ چوٹ وغیرہ لگنے سے وہ ریس میں آخر تک حصہ نہیں لے سکا...... اس نے اپنے منصوبے کے مطابق کام کیا۔ سندر گاؤں تک وہ تیمور کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا لیکن سندر ٹاؤن اور ٹیکرا گلی کے درمیان پشمال موڑ پر وہ ریس سے نکل گیا اور ڈھائی تین فرلانگ نیچے سیدھا میرے ڈیرے پر آ گیا۔ میں اس وقت ڈیرے پر اکیلا تھا۔ گوبند کے پہنچتے ہی میں نے وعدے کے مطابق بقایا ڈھائی ہزار روپیہ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے یہ ڈھائی ہزار روپیہ دور پھینک دیا۔ کہنے لگا تم نے سیٹھ کرم چند سے پندرہ ہزار روپیہ وصول کیا ہے اور اس رقم میں سے کم از کم دس ہزار اُسے ملنا چاہیے۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ پندرہ ہزار نہیں صرف دس ہزار روپے میں بات طے ہوئی تھی۔ جس میں سے ہم دونوں آدھے کے حقدار ہیں۔ وہ میری بات سننے پر تیار نہیں تھا۔ اُسے کسی نے خوب بھڑکا رکھا تھا۔ کہنے لگا میں دس ہزار سے ایک کوڑی کم نہیں لوں گا۔ وہ مجھے جانتا نہیں تھا۔ اگر ٹھیک طرح جانتا ہوتا تو ایسی بات کبھی نہ کرتا۔ دُنیا جانتی ہے کہ شاہی بدمعاش ضرور ہے بے اصول نہیں ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ خواہ مخواہ اوکھلی میں سر نہ دے۔ اُسے پتہ نہیں کہ وہ کس سے ٹکر لے رہا ہے...... وہ تو کسی طور قابو ہی نہیں آ رہا تھا۔ معلوم نہیں کیسی ہوا اُس کے دماغ کو چڑھی ہوئی تھی...... انسپکٹر! میں تمہیں ہر بات صاف سیدھی بتا رہا ہوں اب یقین کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ میں بہت ڈر رہا تھا کہ کہیں میرا میٹر گھوم گیا تو یہ حرامی میرے ہاتھوں

ضائع ہو جائے گا لیکن لگتا تھا وہ آتما ہتھیا کا پروگرام بنا کر آیا ہوا ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ لال پیلا ہونے لگا پھر ایک دم اُس نے میرے ہاتھوں سے ساڑھے چھ ہزار کے نوٹ چھین لیے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ وہ دوڑ کا چیمپئن ہے۔ اُسے کون پکڑ سکتا ہے لیکن جنہوں نے پکڑنا ہوتا ہے وہ پکڑ لیتے ہیں۔ میں نے اُس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ وہ چکر دار رستے پر بھاگا تھا میں ناک کی سیدھ میں گیا اور تھوڑا نیچے جا کر اُسے چھاپ لیا۔ وہ دست بدست لڑائی پر اُتر آیا۔ اُس نے بنیان کے نیچے نیکر میں چاقو چھپا رکھا تھا۔ جب چاقو اُس نے ہاتھ میں لیا تو میرا بھی دماغ گھوم گیا۔ میں نے اس کا وار بچا کر ناک پر ٹکر جو ماری تو وہ کوئی تیس فٹ نیچے ایک گڑھے میں جا گرا۔ اُس کے سر پر چوٹ آئی اور ناک سے خون جاری ہو گیا۔ میں نیچے پہنچا تو اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہائے ہائے کر رہا تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے نوٹ نکالے اور ڈھلوان چڑھ کر واپس ڈیرے پر آ گیا۔ اُس وقت میرا خون بری طرح کھولا ہوا تھا...... لیکن آدھ پون گھنٹے بعد جب دماغ ذرا ٹھنڈا ہوا تو مجھے اس کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اتنی سردی میں اُسے وہاں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ میں نے ڈیرے سے ایک کارندے دولو رام کو بھیجا کہ وہ نیچے جا کر گوبند کو اٹھا لائے۔ دولو رام دو اور لڑکوں کو ساتھ لے گیا۔ پون گھنٹے بعد انہوں نے آ کر مجھے بتایا کہ گوبند وہاں نہیں ہے۔ میں سمجھا کہ وہ ہوش میں آ کر چلا گیا ہوگا۔ لیکن دوپہر کو پتہ چلا کہ گوبند مل نہیں رہا۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ میرے دماغ میں آیا کہ ہو نہ ہو وہ کسی ہسپتال میں ہے۔ شاید کسی نے اسے زخمی حالت میں دیکھا ہو اور میو ہسپتال پہنچا دیا ہو۔ میں نے اگلے روز ڈلہوزی کے سارے ہسپتالوں اور دوا خانوں میں پتہ کروایا لیکن گوبند کا کہیں سراغ نہیں ملا...... بعد میں بھی دو تین ہفتے تک میں نے اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔''

شاہی جو کہانی سنا رہا تھا دلچسپ تھی لیکن میرے لیے اس پر فوراً یقین کر لینا ممکن نہیں تھا۔ شاہی نے اتنا اعتراف تو کرلیا تھا کہ رقم کے معاملے پر گوبند سے اس کا جھگڑا ہوا تھا اور وہ اُسے مار کر کھائی میں پھینک آیا تھا۔ اس اعتراف کے بعد شاہی کے خلاف ایک مضبوط کیس بن سکتا تھا۔ گوبند کو گم ہوئے اب آٹھ مہینے ہونے کو آئے تھے۔ اگر وہ زندہ تھا تو اب تک ملا کیوں نہیں تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ کھائی میں گرنے سے اس کی موت واقع ہو گئی ہو اور شاہی کے آدمیوں نے اُسے ادھر ہی کہیں جنگل میں گاڑ دیا ہو۔

☆======☆======☆

درحقیقت شاہی کو معلوم ہو چکا تھا کہ نشے کی حالت میں اس کے منہ سے ایک ایسی

بات نکل چکی ہے جو اس کی گردن کا پھندا بن سکتی ہے اور اس بات کے نصف درجن گواہ بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے گو بند سے ہونے والے جھگڑے کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ شاہی کی گرفتاری کے وقت جو دھینگا مشتی ہوئی تھی وہ ہمارے ایک غلط اندازے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں نے قادری کو سادہ لباس میں شاہی کے ڈیرے پر بھیجا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاہی وغیرہ اس کو پہچان نہیں سکیں گے لیکن اُن کی سی آئی ڈی خاصی تیز تھی۔ وہ قادری کو ہیڈ کانسٹیبل کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اُسے پکڑ لیا اور مار پیٹ کرنے لگے خیر...... یہ تو وہ باتیں تھیں جو ہو چکی تھیں، اب ہمیں اُن باتوں کے بارے میں سوچنا تھا جو ہونی تھیں۔ شاہی نے اس معاملے کو ایک پُراسرار رنگ دے دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھنے درختوں کے اندر سے گو بند کا جسم آناً فاناً غائب ہو گیا۔ نہ وہ کسی ہسپتال میں پہنچا، نہ کسی کے گھر گیا اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ جنگلی جانور اُسے چیر پھاڑ گئے ہوں۔ اول تو کوئی ایسا بڑا جانور اس علاقے میں تھا ہی نہیں جو ایک جوان مرد کی لاش کھینچ کر موقع سے دور لے جاتا اور فرض محال ایسا ہو بھی جاتا تو قرب و جوار سے انسانی جسم کے بچے کھچے حصے ملنے چاہئیں تھے۔

وہ ڈلہوزی کی ایک دھواں دھواں شام تھی۔ سردی اپنے جوبن پر تھی۔ چیڑ، اخروٹ اور دیودار کے بلند و بالا درختوں میں نمناک بدلیاں چکرا رہی تھیں۔ دُور کہیں نشیب میں گاہے گاہے بندر چیختے تھے اور اُن کی آوازیں جنگل میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ میں اور بلال شاہ اُس مقام پر کھڑے تھے جہاں آٹھ مہینے پہلے گو بند زخمی ہو کر گرا تھا اور بقول شاہی آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر غائب ہو گیا تھا۔ یہ ڈھلوان پر واقع ایک تنگ سی گھاٹی تھی۔ گہرائی پچیس تیس فٹ کے قریب ہوگی۔ یہ ساری جگہ گھنے سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کھائی کی تہہ میں چھوٹی بڑی جھاڑیاں تھیں اور ایک چھوٹی سی آبِ جُو گزرتی تھی۔ گھاٹی کے کنارے سے تہہ میں گرنے والا یقینی طور پر شدید زخمی ہو سکتا تھا۔ دس پندرہ منٹ موقع کا جائزہ لینے کے بعد ہم واپس روانہ ہو گئے۔ اب اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور کسی بھی وقت نشیب و فراز گہری تاریکی میں گم ہو سکتے تھے۔ میں اور بلال شاہ ابھی گھاٹی سے چالیس پچاس گز دور ہی آئے تھے کہ ایک آواز سن کر چونک گئے۔ کوئی آ رہا تھا۔ ہم غیر ارادی طور پر اپنی جگہ رُک گئے۔ دیودار کے ایک تناور درخت نے ہمیں اپنی اوٹ میں لے رکھا تھا لہٰذا اوورکوٹ والا وہ چوڑا چکلا شخص ہمیں دیکھ نہیں سکا جو ایک دم بلندی سے نمودار ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے اُس کی صرف ایک جھلک دیکھی اور پہچان

گیا۔ وہ شاہی کا ملازم خاص اور قریبی ساتھی دولو رام تھا۔ دولو رام اس وقت کہاں جا رہا تھا۔ اُس کا انداز دیکھ کر مجھے خواہ مخواہ شک سا ہونے لگا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے بلال شاہ کی طرف دیکھا، وہ بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔ ''بلال! تم تھانے جاؤ...... میں ذرا اس کی ٹوہ لگاتا ہوں۔'' میرا اشارہ دولو رام کی طرف تھا۔

بلال شاہ نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا۔ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا دولو رام کے پیچھے چل دیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے ہوئے ناہموار راستے پر کسی کا تعاقب آسان کام نہیں ہوتا۔ شاخوں کے ہلنے اور پتوں کے ٹکرانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ آگے جانے والے کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ یہاں بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ اگر دولو رام سے میرا فاصلہ کم ہوتا تو وہ ہوشیار ہو سکتا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی صورت میں اُس کے کھو جانے کا اندیشہ تھا۔ بہر طور کسی نہ کسی طرح میں نے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ آگے جا کر قدرت نے میری مدد کی۔ اندھیرا گہرا ہو جانے کی وجہ سے دولو رام نے ٹارچ روشن کر لی۔ روشنی کا پیچھا خاصے فاصلے سے بھی کیا جا سکتا ہے لہٰذا میرے لیے آسانی پیدا ہو گئی۔ دولو رام کا تعاقب میری توقع سے کہیں طویل ثابت ہوا۔ ایک گھنٹے کے اندر اُس نے قریباً دو میل کا فاصلہ طے کیا اور ''گورا پہاڑ'' کی ڈھلوان پر پہنچ گیا۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ دولو رام اُن خوبصورت بنگلوں میں جا رہا ہے جو گورا پہاڑ کی ڈھلوان پر وادی کے ساتھ ساتھ واقع ہیں اور جہاں چمبا اور پٹھانکوٹ کی خوش حال فیملیاں تفریح کے لیے آتی ہیں۔ ان بنگلوں اور کوٹھیوں کی تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی سب کوٹھیاں مالکوں نے ذاتی استعمال کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ پُرسکون تفریح کے خواہش مندوں کے لیے یہ بڑی مناسب جگہ تھی۔ کوٹھیوں اور بنگلوں کی اس خوبصورت کالونی میں پہنچ کر دولو رام ایک بڑے سیاہ گیٹ کے سامنے رُک گیا۔ اس بنگلے کا نمبر چودہ تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بنگلہ تھیٹر کے ایک مشہور بنگالی اداکار چاکرانی کا تھا۔ چاکرانی بڑی گرج دار آواز والا ایکٹر تھا۔ مشہور تھا کہ تھیٹر کی آخری قطار میں بیٹھا ہوا بہرا تماشائی بھی چاکرانی کی بڑھک سن کر لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ چاکرانی کی مادری زبان بنگالی تھی لیکن وہ اردو، ہندی، گجراتی ہر طرح کے ڈراموں میں کام کرتا تھا۔ اُس زمانے میں بولتی فلمیں تو شروع ہو چکی تھیں لیکن سینما ہال ہر جگہ نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا تھیٹر میں کمائی بھی تھی اور نام بھی۔ چاکرانی نے بھی تھیٹر سے کافی پیسہ کما رکھا تھا۔ جس کا ایک ثبوت یہ خوبصورت بنگلہ بھی تھا۔

دولورام جب چاکرانی کے بنگلے میں داخل ہوگیا تو میں ''گورا پہاڑ'' سے واپس لوٹ آیا۔ اگلے روز میں نے بلال شاہ کو ہدایت کی کہ وہ گورا پہاڑ کے بنگلہ نمبر چودہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کر کے مجھے آگاہ کرے۔ بلال شاہ نے حسب معمول یہ کام بڑی تندہی سے کیا اور ایک مقامی مخبر کو ساتھ ملا کر دو روز میں اپنی رپورٹ مکمل کر لی۔ اس رپورٹ کے مطابق بنگلے کے مالک کا پورا نام رابندر ناتھ چاکرانی تھا۔ اس کی مستقل رہائش دہلی میں تھی۔ ان دنوں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ یہاں تفریح کے لیے آیا ہوا تھا۔ اہل خانہ سے مراد اُس کی بیوی تھی۔ بیوی کا نام روپ وتی تھا اور وہ بھی تھیٹر میں کام کرتی تھی۔ بلال شاہ نے مجھے روپ وتی کی ایک تصویر بھی دکھائی اور بتایا کہ یہ چاکرانی کی دوسری شادی ہے۔

میں نے روپ وتی کی تصویر دیکھی۔ یہ ایک اخباری تراشہ تھا اور زیادہ پرانا بھی نہیں تھا۔ روپ وتی کی عمر بیس بائیس برس کے لگ بھگ نظر آتی تھی۔ دبلی پتلی تیکھے نقوش والی یہ لڑکی تھیٹر اور فلم کی اکثر ایکٹریسوں کی طرح خوبصورت تھی۔ میں نے چاکرانی کو بھی دیکھا ہوا تھا۔ وہ بھی خوبصورت تھا لیکن روپ وتی کے جوڑ کا ہرگز نہیں تھا۔ روپ وتی کے مقابلے میں اُس کی عمر تھوڑی سی زیادہ تھی اور جسم بھی بھاری تھا۔ وہ کھلے ہاتھ پاؤں کا ایک دبنگ شخص نظر آتا تھا۔ جبکہ روپ وتی ایک پڑھی لکھی نازک مزاج اداکارہ دکھائی دیتی تھی۔ معلوم نہیں انہوں نے ایک دوسرے کو کیسے پسند کر لیا تھا۔ بہر حال مجھے اُن کی پسند ناپسند سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے تو یہ دیکھنا تھا کہ شاہی کا ملازم خاص دولورام چاکرانی کے بنگلے میں کیا کرنے گیا تھا اور اُن دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ بلال شاہ اس بارے میں کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کر سکا۔ اُس نے بتایا کہ اس سے پہلے دولورام کو کسی نے چاکرانی کے بنگلے میں یا گورا پہاڑ کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔ نہ ہی کبھی اُسے چاکرانی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ ویسے بھی وہ پچھلے تین چار ماہ سے ڈلہوزی میں نہیں تھا۔ بلال شاہ نے اپنی رپورٹ میں ایک بڑی خاص بات بھی بتائی۔ اُس نے کہا کہ پچھلے ایک مہینے میں تین چار موقع ایسے آئے ہیں کہ چاکرانی کے بنگلے سے کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں آئی ہیں۔

یہ ایک سنی خیز اطلاع تھی۔ میں چاکرانی کا بنگلہ خود دیکھ کر آیا تھا۔ یہ بنگلہ دوسری عمارتوں سے کچھ ہٹ کر تھا اور گھنے درختوں کی وجہ سے کچھ الگ تھلگ بھی نظر آتا تھا۔ ایسی چار دیواریاں کسی بھی طرح کے غیر قانونی کاموں کے لیے بہت مناسب ہوتی ہیں۔ میں نے بلال شاہ سے پوچھا کہ یہ چیخوں والی بات اُسے کس نے بتائی ہے۔

وہ حسب عادت مونچھوں کو مروڑا دے کر بولا۔ ''خان صاحب! شاید آپ نے دیکھا نہیں، چودہ نمبر بنگلے کے پیچھے لکڑی کا ایک گودام ہے۔ گودام بھی کیا ہے بس کھلے احاطے میں شہتیروں کے ڈھیر لگا کر آلے ڈوالے کانٹے دار تار لگا دی گئی ہے۔ یہاں دو چوکیدار بھی رہتے ہیں۔ دونوں آپس میں داماد سسر ہیں۔ انہوں نے ہی بتایا ہے کہ چودہ نمبر بنگلے میں ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔ صرف دو دن پہلے بھی رات کے وقت انہوں نے چیخیں سنی ہیں۔ چیخیں بہت مدھم ہوتی ہیں اور اکثر وقفے وقفے سے آدھ گھنٹے تک سنائی دیتی رہتی ہیں۔''

میں نے بلال شاہ سے اس بارے میں کچھ اور تفصیل پوچھی اور پھر چاکرانی سے ملنے کا پختہ فیصلہ کر لیا۔

☆======☆======☆

''گورا پہاڑ'' تک جانے کے لیے جیپ کو طویل چکر کاٹنا پڑتا تھا میں ایک گھنٹے میں چاکرانی کے بنگلے تک پہنچ سکا۔ میں وردی میں تھا۔ مجھے دیکھ کر چاکرانی کا ملازم پریشان نظر آنے لگا۔ وہ اطلاع دینے اندر گیا اور چار پانچ منٹ بعد میں چاکرانی کے سامنے اُس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ شکل وصورت اور قد کاٹھ کے لحاظ سے چاکرانی کسی طرح بھی بنگالی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اچھا بھلا گبھرو شخص تھا۔ کسی حد تک خاموش طبع بھی نظر آتا تھا۔ اُس نے بڑے اخلاق اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا اور آنے کی وجہ پوچھی۔

میں نے کہا۔ ''وجہ تو کوئی خاص نہیں ہے چاکرانی صاحب! بس آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔''

وہ مسکرا کر اردو میں بولا۔ ''ہم آپ کے خادم ہیں جی! ہمیں حکم کر دیا ہوتا۔ فرمائیں کیا خدمت کروں آپ کی؟''

میں نے کہا۔ ''بس تھوڑا سا وقت لینا تھا آپ کا۔ دراصل ہم نے ایک مقامی غنڈے شاہی کو گرفتار کیا ہے۔ اُس پر ایک ارائیں لڑکے کے قتل کا الزام ہے۔ ہم شاہی کے ملنے جلنے والوں سے بھی پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ شاہی کے دوست احباب میں ایک دولورام نامی شخص بھی ہے......''

''میں سمجھ گیا ہوں۔'' چاکرانی میری بات کاٹ کر بولا۔ ''آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دولورام نامی یہ شخص میرے بنگلے میں آمد و رفت رکھتا ہے...... اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ بالکل صحیح ہے۔ یہ دولورام تین چار دفعہ میرے بنگلے میں آ چکا ہے لیکن اس کے آنے کی وجہ شاید آپ کو معلوم نہ ہو۔'' چاکرانی نے دروازے کی طرف رخ پھیر کر اپنے کسی ملازم

''دینو'' کو آواز دی۔ چند لمحے بعد چالیس پچاس برس کا ایک باریش شخص ہاتھ سینے پر باندھے اندر داخل ہوا اور ادب سے سر جھکا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ چاکرانی نے اپنی بے حد پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''دینو! انسپکٹر صاحب کو بتاؤ کہ دولو رام یہاں کیوں آتا رہا ہے۔''

اس سے پہلے کہ دینو بولتا میں نے کہا۔ ''چاکرانی صاحب! آپ کے ملازم کی زبان سے آپ کی زبان میرے لیے زیادہ قابل اعتبار ہے۔ جو کچھ کہنا ہے آپ خود فرمایئے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

چاکرانی نے مسکرا کر ملازم کو باہر بھیج دیا۔ پھر چاندی کے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر بڑے اسٹائلش انداز میں ہونٹوں سے لگایا اور بولا۔ ''بالکل معمولی سی بات ہے...... کم از کم آپ کے لیے تو بالکل غیر اہم ہے۔ دولو رام کی دھرم پتنی مالتی میرے بنگلے میں ملازم تھی۔ میرے آنے سے پہلے میرے منیجر نے اُسے ملازم رکھا تھا۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ مالتی کا شوہر کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ دنگا فساد کرتا ہے اور اکثر اُسے پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ میں نے مالتی کی چھٹی کرا دی۔ دولو رام نے منیجر سے درخواست کی کہ اُس کی بیوی کو کام سے نہ نکالا جائے۔ منیجر نے بے وقوفی کی اور اُسے میری طرف بھیج دیا۔ دو دفعہ تو میں نے اُسے ملنے سے ہی انکار کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سمجھ جائے گا لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ آدمی نکلا۔ دو تین روز پہلے پھر آ دھمکا۔ میں نے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی اور کورا جواب دے کر واپس بھیج دیا۔ دراصل......''

اچانک چاکرانی کے منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ مجھے بھی چونک کر قالین پوش زینوں کی طرف دیکھنا پڑا۔ بالائی منزل پر کوئی چیز دھم سے گری تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک دبی ہوئی نسوانی چیخ اُبھری تھی۔ میں نے دیکھا چاکرانی کا سرخ و سپید چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے چاکرانی کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر کہنے لگا۔ ''میری نوکرانی! فرش دھوتے ہوئے گر گئی ہے شاید۔'' وہ سیڑھیوں تک گیا اور کچھ دیر بالائی منزل کے دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد واپس آ گیا۔ وہ صاف طور پر پریشان تھا اور میری توجہ اس واقعے کی طرف سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھے خبریں سنانے کے بہانے ریڈیو آن کر دیا اور سیاست کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ بھی تھا وہ ایک بااخلاق شخص نظر آتا تھا اور اس کی باتوں میں رکھ رکھاؤ تھا۔ بڑے غیر محسوس طریقے سے وہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ میں جلد از جلد وہاں سے رخصت ہو جاؤں لیکن تقدیر چاکرانی پر مہربان نظر نہیں آتی تھی۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک بار پھر بالائی منزل سے دھما چوکڑی کی

آوازیں آنے لگیں۔ ایک مرد دبے دبے لہجے میں غرایا اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے رونے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس دفعہ یہ سب کچھ نہایت واضح تھا۔ چاکرانی پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پریشانی کے علاوہ اُس کے چہرے پر غصہ اور شرمندگی بھی تھی۔ وہ کچھ دیر سیدھا کھڑا بالائی منزل کے دروازے کو دیکھتا رہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں انسپکٹر۔'' اُس نے کہا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

آٹھ دس منٹ بعد چاکرانی واپس آیا تو سردی میں بھی پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اُس کے بال بھی کچھ بکھرے بکھرے نظر آئے تھے۔ میرے سامنے بیٹھ کر اُس نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور چند گہرے کش لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔

''یہ میری بیوی ہے انسپکٹر...... جو پہلی آواز آئی وہ بھی اسی کی تھی۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔''

''کیا وہ بیمار ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بیمار ہوتی تو اُس کا علاج کرا لیتا۔ بھگوان کی کرپا سے دھن دولت کی کمی نہیں ہے مجھے۔ بڑے سے بڑے ہسپتال میں لے جا سکتا ہوں اُسے۔ مگر وہ تو اپنی دشمن خود بنی ہوئی ہے...... اب کیا بتاؤں آپ کو۔ کرتا اٹھانے سے اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے...... وہ نشہ کرنے لگی ہے۔ دن رات دُھت رہتی ہے۔ شراب بند کر دوں تو مارنے کو دوڑتی ہے۔ گھر کی چیزیں توڑتی ہے اور سر دیواروں سے ٹکراتی ہے۔ پھر مجبوری یہ ہے کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ نہ اُسے مار پیٹ سکتا ہوں اور...... اور نہ طلاق دے سکتا ہوں...... میں اُسے دہلی سے یہاں اسی لیے لایا تھا کہ شاید کھلی آب و ہوا میں شور ہنگامے سے دور رہ کر وہ کچھ بہتر محسوس کرے لیکن الٹا اثر ہو رہا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ واپس ہی چلا جاؤں۔''

میں نے دیکھا چاکرانی کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی اور آواز اندرونی کرب کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''چاکرانی صاحب! عام طور پر عورتیں شراب نہیں پیتیں۔ اگر آپ کی پتنی اس لت میں گرفتار ہو گئی ہیں تو ضرور اس کی کوئی خاص وجہ ہو گی۔''

وہ پیشانی مسل کر بولا۔ ''میری سمجھ میں تو کوئی وجہ نہیں آتی۔ اُس کی دوستوں میں سے ایک دو بہت ایڈوانس قسم کی تھیں۔ شراب کے علاوہ حشیش وغیرہ کے نشے بھی کرتی تھیں۔ بس انہی حرامزادیوں سے یہ چھوت کا مرض اُسے لگا ہو گا۔''

ہماری گفتگو کے دوران ہی ایک بار پھر اوپری منزل سے دھما دھم کی آوازیں آئیں پھر ایک طویل کھڑکی کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹا اور مجھے کھڑکی کے خالی فریم میں ایک وجیہہ صورت نظر آئی۔ میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ وہ روپ وتی کے علاوہ کوئی نہیں تھی۔ میں چند روز پہلے اس کی تصویر اخباری تراشے میں دیکھ چکا تھا۔ تصویر میں روپ وتی جتنا سجی سنوری نظر آتی تھی، کھڑکی میں اتنا ہی اُجڑی بجڑی کھڑی تھی۔ لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر خراشیں اتنی دور سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اُسے عقب سے ایک عورت اور ایک توانا مرد نے دبوچ رکھا تھا۔ دونوں روپ وتی کو اندر کی طرف کھینچ رہے تھے اور روپ وتی چیخ رہی تھی۔ اس نے چیختے ہوئے دو یا تین جملے کہے مگر ان جملوں میں سے مجھے صرف ''تھانیدار صاحب'' کے الفاظ سمجھ میں آئے ...... بعض اوقات الفاظ سنے بغیر بھی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ میرے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ عورت مجھے مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ چاکرانی کی بات درست ہی تھی۔ وہ نشے میں نظر آتی تھی اور کچھ جنونی سی ہو رہی تھی۔ مرد اور عورت جو غالباً اس بنگلے میں نوکر تھے۔ روپ وتی کو بمشکل کھڑکی سے ہٹا کر اندر لے گئے۔

چاکرانی اب سخت بیزار نظر آتا تھا۔ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آیئے تھانیدار صاحب! باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... بس اب میں چلتا ہوں۔ بہت وقت ضائع کر لیا ہے آپ کا۔''

کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اُس نے کھانے کی دعوت دی لیکن میں شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

☆======☆======☆

چاکرانی کے بنگلے سے میں کئی الجھنیں لے کر واپس لوٹا۔ سب سے بڑی اُلجھن روپ وتی ہی تھی۔ چاکرانی یوں تو بھلا مانس شخص نظر آتا تھا لیکن یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے بیوی کا علاج کرانے کی بجائے وہ اُسے یہاں کیوں لے آیا تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا روپ وتی نے بنگلے کی کسی کھڑکی سے میری جیپ دیکھ لی تھی اور یہ جیپ دیکھنے کے بعد ہی اُس نے بالائی منزل پر اودھم مچانا شروع کیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح مجھ پر اپنا آپ ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی پہلی دو کوششیں ناکام رہیں لیکن تیسری کوشش میں وہ کھڑکی کا شیشہ توڑنے اور میرے سامنے آنے میں کامیاب رہی......

گوبند کے سوالیہ نشان کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ ایک اور سوالیہ نشان سامنے آ گیا۔ روپ وتی کون تھی؟ اگر واقعی اُسے شراب نے پاگل کر رکھا تھا تو وہ کیوں شراب پیتی تھی اور اپنی پھول جیسی جوانی کو کیوں زہر سے سینچ رہی تھی؟ میں نے بلال شاہ کے علاوہ اپنے دو تین مزید مخبروں کو اکٹھا کیا اور اُن کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ چاکرانی اور روپ وتی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کریں اور بڑی احتیاط کے ساتھ چاکرانی کی نقل و حرکت پر بھی نگاہ رکھیں۔ مخبروں نے تین چار روز کی بھاگ دوڑ میں مختلف ذریعوں سے جو کچھ معلوم کیا اُس کا خلاصہ یوں ہے۔ چاکرانی کی یہ دوسری اور روپ وتی کی پہلی شادی تھی۔ چاکرانی کی طرح روپ وتی کا تعلق بھی دہلی کے ایک آزاد خیال گھرانے سے تھا۔ وہ تھیٹر میں اداکاری کے علاوہ رقص بھی پیش کرتی تھی اور بعض اوقات گانا بھی گاتی تھی۔ تھیٹر دیکھنے والے شائقین کی بہت بڑی تعداد روپ وتی کی دیوانی تھی اور نوجوان اُس کے لیے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ چاکرانی کے ساتھ شادی سے پہلے روپ وتی کا ایک اجیت نامی نوجوان سے معاشقہ بھی چلا تھا۔ یہ نوجوان بھی تھیٹر کا اداکار تھا اور بہت خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں روپ وتی نے اس نوجوان سے تعلق توڑ لیا اور چاکرانی کو اپنی مرضی سے جیون ساتھی چن لیا تھا۔ مخبروں نے گورا پہاڑ کے بنگلہ نمبر 14 کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی تھیں۔ چاکرانی نے یہ بنا بنایا بنگلہ کوئی تین سال پہلے خریدا تھا۔ سارا سال یہ بنگلہ بند پڑا رہتا تھا صرف جون جولائی کے مہینوں میں چاکرانی دس پندرہ روز کے لیے یہاں آتا تھا۔ چاکرانی کے ساتھ اُس کا منیجر ہوتا تھا یا ایک عدد باورچی، یہ باورچی عموماً چاکرانی کے ساتھ ڈلہوزی پہنچتا تھا۔ اس دفعہ بھی منیجر اور باورچی اُس کے ساتھ ہی یہاں آئے تھے لیکن اس دفعہ دو باتیں معمول سے ہٹ کر ہوئی تھیں۔ ایک تو چاکرانی گرمیوں کی بجائے سردیوں میں آیا تھا۔ دوسرے اُس کے ساتھ روپ وتی بھی تھی جسے وہ اپنی بیوی بتا رہا تھا۔ اُسے یہاں آئے ہوئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے تھے۔ وہ بہت کم بنگلے سے نکلتا تھا اور اُس کی پتنی کی تو کسی نے جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ اردگرد کے لوگ اب اس بنگلے کو پُراسرار خیال کرنے لگے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بنگلے کی چار دیواری کے اندر ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ یہاں کوئی غیر قانونی کام ہوتا ہے یا پھر کسی روح وغیرہ نے ڈیرہ ڈال لیا ہے۔

دیہی علاقوں میں ایسی باتوں کے پھیلنے کے لیے بس اشارے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں بھی یہ اشارہ موجود تھا۔ یعنی بنگلے کے پچھواڑے ''لکڑی گودام'' کے چوکیداروں نے چیخوں کی آوازیں سنی تھیں جو اکثر رات کے وقت آتی تھیں۔ میں اب ان چیخوں کا سبب سمجھ

گیا تھا لیکن ان کی اصل بنیاد کا مجھے بھی پتہ نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ ان چیخوں کی اصل بنیاد اُس کہانی کے ملبے میں چھپی ہوئی ہے جس میں چاکرانی کے علاوہ کسی اجیت نامی اداکار کا ذکر بھی آتا ہے اور جس کا آغاز دہلی کے کسی رومان پرور گوشے سے ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ گتھی سلجھانے کے لیے مجھے یا میرے سب انسپکٹر کو دہلی جانا پڑے گا...... دو تین روز سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے خود دہلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں چند کیسوں کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی دہلی جا چکا تھا۔ آپ اُن میں سے ایک دو کیسوں کی روداد بھی پڑھ چکے ہیں۔ دہلی میرے لیے کوئی نیا مقام تھا نہ ہی وہاں کے رہنے والے میرے لیے اجنبی تھے۔ ڈلہوزی سے دہلی تک جانے کا مطلب ہے بذریعہ ٹرین یا بس ایک طویل سفر۔ گوبند کی آٹھ نو ماہ پرانی گمشدگی کا معمہ حل کرنے کے لیے میرے لیے ضروری تھا کہ یہ طویل سفر کروں۔ میں نے بس پر ٹرین کو ترجیح دی۔ میں اور بلال شاہ پہلے سرکاری گاڑی پر پٹھانکوٹ پہنچے۔ پٹھانکوٹ اسٹیشن سے ہم ٹرین میں بیٹھے اور پھر چل سو چل۔ سفر طویل ضرور تھا لیکن جب بلال شاہ جیسا دلچسپ ہمسفر ہو تو سفر کٹنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں بلال شاہ ایک بوتل خون عطیے میں دے بیٹھا تھا۔ اب وہ ہر وقت خون کی کمی کا رونا روتا رہتا تھا۔ کہتا تھا اُٹھتے بیٹھتے چکر آتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سن ہو جاتی ہیں۔ ہر وقت ناخنوں کو دیکھتا رہتا تھا کہ اُن میں گلابی پن نہیں رہا۔ ایک بوتل خون کی کمی پوری کرنے کے لیے اُس نے میری جیب سے جتنا پھل فروٹ کھایا تھا اُس سے پانچ چھ بوتل خون اس کے جسم میں مزید پیدا ہو چکا تھا مگر ''کمی'' تھی کہ پوری ہونے میں نہیں آتی تھی...... ہم پٹھانکوٹ سے لدھیانہ پہنچے اور لدھیانہ سے براستہ پٹیالہ دہلی پہنچ گئے۔ یہ ساڑھے چار سو میل سے زائد سفر تھا۔

دہلی میں ہمارا قیام عیدگاہ کے علاقہ میں انسپکٹر نذیر احمد کے مکان میں تھا۔ میں ایک دو دفعہ پہلے بھی نذیر احمد کے پاس ٹھہر چکا تھا۔ وہ بڑا ہمدرد اور تعاون کرنے والا شخص تھا۔ نذیر احمد کے ذریعے اجیت کمار کا ٹھکانہ معلوم کرنے میں قطعاً دشواری نہیں ہوئی۔ وہ کوئی گمنام شخص نہیں تھا، تھیٹر کا معروف اداکار تھا۔ نئی آبادی میں اس کی دو کنال کی شاندار کوٹھی تھی لیکن وہ خود دہلی میں موجود نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی شو میں حصہ لینے کے لیے میرٹھ گیا ہوا ہے۔ اُس کی واپسی دو روز بعد متوقع تھی۔ ہم نے یہ وقت دہلی دیکھنے میں گزارا۔ شہر دیکھنے کا شوق بلال شاہ کو تھا مجھے نہیں۔ مگر اُس کے ساتھ تو جانا تھا (آخر اُس نے میرے کہنے پر خون دے رکھا تھا۔ گاہے گاہے چکر وغیرہ آتے تھے۔ نصیب دشمناں کچھ ہو جاتا تو مصیبت پڑ جاتی)

یہ تیسرے روز دوپہر کا واقعہ ہے۔ ہم جنرل پوسٹ آفس سے عیدگاہ کی طرف آ رہے تھے۔ یونہی میرے جی میں آئی کہ نئی آبادی کی طرف سے نکل چلتے ہیں۔ گزرتے گزرتے ایک نگاہ اجیت کی رہائش گاہ پر بھی ڈال جائیں گے۔ اگر وہ واپس آ چکا ہے تو اُس کی گاڑی پورچ وغیرہ میں کھڑی نظر آ جائے گی۔ ہم چھوٹی جیپ پر سوار تھے یہ پرائیویٹ جیپ تھی اور نذیر احمد کے چھوٹے بھائی شجاع نے ہمیں ذاتی استعمال کے لیے دے رکھی تھی۔ نئی آبادی کی طرف جاتے ہوئے جونہی ہم مجسمے والے چوک سے گزرے۔ بلال شاہ کی نگاہ بس سٹاپ پر کھڑے ایک نوجوان پر پڑی اور وہ بری طرح چونک گیا۔ ''رکیے خان صاحب'' وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ اُس کی انگلی بس سٹاپ کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے بریک پیڈل دبا دیا اور مختصر سی جیپ لہراتی ہوئی سڑک کے کنارے رک گئی۔ ''یہ گوبند ہے......'' بلال شاہ نے دھماکہ خیز انکشاف کیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ انیس بیس سالہ وہ لڑکا ابھی ایک بس سے اُترا ہی تھا اور سٹاپ کے سامنے کھڑا ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ جیپ ایک دم رُکی تھی اس لیے کچھ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی ہماری طرف دیکھنے لگا۔ یکا یک میں نے اُس کے چہرے پر زلزلے کے آثار محسوس کیے۔ یہ آثار مجھے اور بلال شاہ کو پہچاننے کے بعد نمودار ہوئے تھے۔ اُس کا منہ کھلا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک دم وہ بھاگ اٹھا ''پکڑیں اسے'' بلال شاہ نے چلا کر کہا۔ میں نے تیزی سے جیپ کو یوٹرن دیا اور وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح لڑکے کی طرف لپکی۔ لڑکے نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے سڑک کراس کی اور ایک بغلی راستے میں داخل ہو گیا۔ یہ ون وے کی خلاف ورزی تھی مگر اس خلاف ورزی کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے لڑکے کا تعاقب جاری رکھا۔ کئی گاڑیوں کے پہیے چرچرائے اور اُن کے ڈرائیور خشمگیں نظروں سے ہمیں گھورنے لگے۔ جونہی میں نے لڑکے کو ایک تنگ گلی میں داخل ہوتے دیکھا جیپ روک کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ یہ اینٹوں کے فرش والی پختہ گلی تھی۔ دونوں طرف رہائشی مکانات تھے۔ لڑکا جس کا نام بلال شاہ نے گوبند بتایا تھا تیزی سے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ وہ گوبند ہی تھا کیونکہ اُسی طرح بھاگ رہا تھا جس طرح ایک دوڑنے والے کھلاڑی کو بھاگنا چاہیے۔ اپنی تمام تر تیز رفتاری کے باوجود شاید میں اُسے پکڑ نہ سکتا لیکن ایک ریڑھی بان فرشتہ رحمت ثابت ہوا۔ وہ اچھے ڈیل ڈول کا ایک سبزی فروش تھا۔ میں وردی میں تھا لہٰذا میرے آگے لگ کر بھاگنے والے کو مشکوک جان کر وہ اُس کے راستے میں آ گیا۔ اُس نے اپنی ریڑھی اس طرح گوبند کی ٹانگوں میں ماری کہ وہ ریڑھی کے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل فرش پر گرا۔ اس سے پہلے

کہ وہ اٹھنے کے بعد دوبارہ رفتار پکڑتا میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اُسے دھکا دیا اور وہ اٹھتا اٹھتا ایک بار پھر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اُس کے جبڑے پر دو زوردار مکے رسید کر کے اس کی ساری تن فن ختم کر دی۔ ایک دم وہاں مجمع لگ گیا۔ ان میں عورتیں، بچے، مرد سب شامل تھے۔ بلال شاہ بھی ہانپتا کانپتا موقع پر پہنچ چکا تھا اور حیرت سے گوبند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بات تھی بھی حیرت کی۔ یہ لڑکا پچھلے آٹھ نو ماہ سے گم تھا۔ ہم سب کا خیال تھا کہ وہ قتل ہو چکا ہے یا کسی کی حبس بیجا میں ہے۔ ہم اُس کا کھوج لگانے نکلے ہوئے تھے لیکن وہ ہمیں دیکھ کر یوں بھاگا تھا جیسے موت کے فرشتوں کو دیکھ لیا ہو۔ موقع پر موجود لوگ ہم سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کون ہے اور اس نے کیا کیا ہے۔ ہم کیا کہہ سکتے تھے ہمیں خود معلوم نہیں تھا۔ اس نے کیا کیا ہے؟ جان چھڑانے کے لیے ہم نے لوگوں سے گول مول بات کی اور گوبند کو لے کر جیپ میں آبیٹھے۔

☆=====☆=====☆

منظر انسپکٹر نذیر احمد کے گھر کا تھا۔ نذیر احمد بھی گھر ہی موجود تھا۔ گوبند مجرموں کی سی صورت بنائے ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ میرے مکے سے اس کا زیریں ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون اُس کی ٹھوڑی کو رنگین کر رہا تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''میں بے گناہ ہوں انسپکٹر صاحب! مجھے اپنے دفاع میں گولی چلانا پڑی تھی۔ ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتا۔''

گوبند کے لب و لہجے سے اُس کا اناڑی پن ظاہر ہو رہا تھا۔ کوئی پختہ کار مجرم ہوتا تو بغیر ہمارے پوچھے ایسی بات زبان پر نہ لاتا بلکہ گدھے کی طرح مار کھا کر بھی چپ رہتا۔ جو بات گوبند نے کہی تھی اُس سے صاف نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ کسی شخص کو زخمی یا ہلاک کر چکا ہے اور ہم سے ڈر کر بھاگنے کی وجہ یہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔

''ریوالور اب کہاں ہے۔''

وہ بولا۔ ''وہ میں نے وہیں بنگلے کے پچھواڑے پھینک دیا تھا۔''

ایک اور بات کا پتہ چل گیا۔ گوبند کے ہاتھوں کسی کے ہلاک یا زخمی ہونے کا واقعہ گورا پہاڑ پر ہوا تھا اور عین ممکن تھا کہ اسی بنگلے میں ہوا ہو جہاں چاکرانی رہائش پذیر تھا۔ یعنی 14 نمبر کا وہ الگ تھلگ بنگلہ جہاں مخبوط الحواس روپ وتی سے میرا سامنا ہوا تھا۔ میرا یہ قیافہ درست ثابت ہو رہا تھا کہ شاہی، رابندر ناتھ چاکرانی، بنگلہ نمبر 14 اور گوبند میں کوئی گہرا تعلق ہے...... میں نے اپنی گفتگو سے گوبند کو یہ باور کرایا کہ اُس کے جرم کی بیشتر تفصیلات

مجھے معلوم ہیں اور میں اُس کی گرفتاری کے لیے ہی یہاں دہلی آیا ہوا ہوں۔ گوبند پوری طرح اس گفتگو کے جال میں پھنس گیا اور اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر وہ سب کچھ مجھے بتا دیا جو شاید ہم کئی دنوں میں بھی نہ پوچھ سکتے۔ گوبند نے میرے اور انسپکٹر نذیر کے سامنے ایک طویل بیان دیا۔ اس بیان میں اُس نے اپنی گمشدگی اور گزشتہ نو ماہ کے حالات کے بارے میں جو کچھ بتایا اُس کا خلاصہ یوں ہے۔

گوبند کے بیان کے پہلے حصے سے کافی حد تک شاہی کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی یعنی اُن دونوں کے درمیان ایک سودا ہوا تھا جس کے مطابق دوڑ میں پہلے دو نمبر چھوڑ دینے پر شاہی نے گوبند کو کچھ رقم دینا تھی۔ اب اس رقم کے بارے میں اختلاف تھا۔ شاہی نے بیان دیا تھا کہ اس سودے میں گوبند سے پانچ ہزار طے ہوا تھا جب کہ گوبند کا کہنا تھا کہ شاہی نے سیٹھ سے کم از کم پندرہ ہزار روپیہ لیا تھا اور اس میں سے دس ہزار اُسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ اُن دنوں ایک بہت بڑی رقم تھی اور اس کے سلسلے میں بڑے سے بڑا تنازعہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ گوبند نے اعتراف کیا کہ وہ شاہی سے نوٹ چھین کر بھاگا تھا اور بعد ازاں اُن دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ شاہی نے اُس کے سر پر پتھر مارا تھا اور جب وہ بے ہوش ہو کر کھائی میں گر گیا تو وہ اُس کی مٹھی سے رقم نکال کر چلتا بنا۔ گوبند نے بتایا کہ وہ قریباً آدھے گھنٹے بعد ہوش میں آیا تھا۔ اُس کے سر سے بہنے والا خون لوتھڑوں کی صورت میں اُس کے چہرے اور سینے پر جما ہوا تھا۔ وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھ سکا تھا۔ چاروں طرف سنسان درخت تھے جن میں سے ٹھٹھری ہوئی ہوا سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھی۔ اُس کی ٹانگیں جیسے بے جان ہو چکی تھیں۔ وہ بڑی دشواری سے گھسٹتا ہوا برفاب کھائی سے باہر نکلا اور اپنی بنیان پھاڑ کر سر پر پٹی باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دفعتاً اُسے بری طرح چونکنا پڑا۔ ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی تھی اس کے ساتھ ہی کسی کے بھاگتے قدموں کی آہٹ اُبھری تھی۔ وہ ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے قریباً سو گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ وہ سرخ ریشمی لباس میں تھی اور کسی سے بچنے کے لیے تیزی سے بھاگی جا رہی تھی پھر گوبند کو وہ لوگ بھی نظر آ گئے جن سے بچنے کے لیے وہ بھاگ رہی تھی۔ وہ چار افراد تھے اُن میں سے دو کے ہاتھ میں خودکار رائفلیں بھی تھیں۔ بھاگنے والوں میں سب سے آگے ایک خوش پوش توانا شخص تھا۔ وہ بھاگنے کے ساتھ ساتھ دھمکی آمیز لہجے میں لڑکی کو رُکنے کا حکم بھی دے رہا تھا۔ گوبند اُسے دیکھ کر اور اُس کی آواز سن کر حیران رہ گیا۔ وہ اسٹیج کا بنگالی اداکار چاکرانی تھا۔ چاکرانی ایک معروف شخص تھا اور اُسے بہت سے لوگ

جانتے تھے۔ گوبند کو بھی معلوم تھا کہ نیچے گورا پہاڑ کی طرف چاکرانی کا ذاتی بنگلہ ہے اور وہ کبھی کبھار وہاں رہنے کے لیے آتا ہے۔ فوری طور پر اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ چاکرانی اس لڑکی کے پیچھے کیوں ہے اور کیوں غصے میں اس قدر بھڑکا ہوا ہے۔ کھائی سے قریباً چالیس گز کی دوری پر چاکرانی نے خوبصورت لڑکی کو جالیا اور بالوں سے پکڑ کر اس زور کا جھٹکا دیا کہ وہ چلا کر ڈھیر ہوگئی۔ چاکرانی بھوکے جانور کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑا۔ اُس نے روتی چلاتی لڑکی کو بری طرح پیٹا اور سخت سردی میں اُس کے کپڑے تار تار کر دیے۔ بعدازاں وہ اُسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا ڈھلوان سے نیچے لے جانے لگا۔ گوبند اب لڑکی کو بھی پہچان چکا تھا، وہ سٹیج کی ساحرہ اور بے شمار دلوں کی دھڑکن نوجوان اداکارہ روپ وتی تھی...... دفعتہً چاکرانی کے کارندوں نے گوبند کو دیکھ لیا۔ اس ویرانے میں گوبند کی موجودگی اُن کے لیے جہاں تعجب خیز تھی وہاں تشویش ناک بھی تھی۔ گوبند یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور یقینی طور پر تھیٹر کے ایک مشہور اداکار کو پہچان بھی چکا تھا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد چاکرانی کے کارندے تیزی سے آگے بڑھے اور انہوں نے گوبند کو دبوچ لیا۔ گوبند نے اُن کی منت سماجت کی اور قسمیں کھائیں کہ اُس نے کچھ نہیں دیکھا اور نہ وہ کسی کو کچھ بتائے گا لیکن اُسے پکڑنے والے کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انہوں نے اُسے بے بس کیا اور گھسیٹتے ہوئے نیچے نیم پختہ راستے پر لے گئے جہاں اُن کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔

یوں گوبند ایک چشم دید گواہ ہونے کے سبب اغوا ہوا اور چاکرانی کی حبس بے جا میں چلا گیا۔ چاکرانی کے بنگلے میں اُسے ملازمین کی ایک کوٹھڑی میں ڈال کر باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ ایک مسلح چوکیدار ہر وقت اُس کے اردگرد رہتا تھا اور خاص ضرورت کے تحت ہی گوبند کو کوٹھڑی سے باہر نکالا جاتا تھا۔ غالباً چاکرانی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کا کیا کرے۔ گوبند کو قتل کرنے کی ہمت اُس میں نہیں تھی اور وہ اُسے آزاد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اُس کی قید کو طول دیتا چلا گیا۔ اس قید میں رہتے ہوئے گوبند کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روپ وتی بنگالی اداکار چاکرانی کی پتنی ہے۔ میاں بیوی میں کوئی سخت تنازعہ چل رہا ہے اور وہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ گوبند مارچ میں قید ہوا تھا۔ مئی کے آخر میں چاکرانی اپنی بیوی کے ساتھ دہلی واپس چلا گیا اور اُس ویران بنگلے میں گوبند دو چوکیداروں کی نگرانی میں اپنی قید کے دن کاٹنے لگا۔ وہ ہر وقت روتا تھا اور اپنی بوڑھی ماں کو یاد کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا کہ اُسے اپنے کرتوتوں کی سزا ملی ہے۔ اُس نے فریب کاری سے پیسہ کمانا چاہا تھا نتیجے میں وہ شاہی کے ہاتھوں جان لیوا طور پر زخمی ہوا اور پھر بندی خانے میں پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے

طور پر فرار ہونے کی ایک دو کوششیں بھی کیں لیکن بری طرح ناکام ہوا۔ نہ صرف یہ کہ اُسے مارا پیٹا گیا بلکہ نگرانی بھی سخت کر دی گئی۔ اسی طرح روتے پیٹتے تین ساڑھے تین مہینے اور گزر گئے۔ اب سردیاں آ چکی تھیں۔ اردگرد کے تمام بنگلے سنسان ہو چکے تھے۔ ڈلہوزی کی یہ یخ بستہ ڈھلوان برف کا لبادہ پہننے کے لیے بے قرار نظر آ رہی تھی...... ایک روز چاکرانی اپنی بیوی کے ساتھ پھر بنگلے میں آ دھمکا۔ ان تین چار مہینوں کے دوران میاں بیوی کی ناچاقی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ روپ وتی کثرت سے شراب نوشی کرنے لگی تھی اور ہفتے میں کئی بار چاکرانی سے پٹتی تھی۔ بنگلے کے اندرونی کمروں سے بلند ہونے والی یہ آوازیں گوبند کی کوٹھڑی تک بھی پہنچتی تھیں۔ نشے میں دُھت ہونے کے بعد روپ وتی چاکرانی پر چیخنے چلانے لگتی تھی یہاں تک کہ چاکرانی تشدد پر اُتر آتا تھا۔ میاں بیوی میں خوب جمتی تھی اور کبھی کبھی اس ہنگامے کی آوازیں بنگلے سے باہر تک جاتی تھیں۔ سردیوں کی وجہ سے یہ مختصر کالونی سنسان ہو چکی تھی ورنہ ہر رات کا یہ ہنگامہ اڑوس پڑوس والوں کا جینا حرام کر دیتا...... قریباً دو ہفتے پہلے کی بات تھی۔ ایک رات گوبند اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا تقدیر کے لکھے پر آنسو بہا رہا تھا کہ دروازے کی بالائی درز سے ایک لفافہ دھپ سے فرش پر آن گرا۔ گوبند نے جلدی سے لالٹین روشن کر کے لفافہ کھولا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس میں سو سو کے دس نوٹ ہیں۔ نوٹوں کے علاوہ ایک مختصر خط بھی تھا۔ یہ خط چاکرانی کی بیوی روپ وتی کی طرف سے تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ میری طرح تم بھی چاکرانی کے ایک بدنصیب قیدی ہو۔ اگر تھوڑی سی ہمت کرو تو آزادی تمہارا نصیب ہو سکتی ہے۔ کل رات تمہیں اپنی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ملے گا۔ تمہارا چوکیدار بھی نشے میں دُھت پڑا ہوگا۔ تم دیوار پھاند کر باہر نکل جانا۔ مجھے پوری آشا ہے کہ بھگوان تمہیں کامیاب کرے گا۔ اگر کامیاب ہو جاؤ تو میرا ایک کام کر دینا۔ اس خط کے آخر میں مَیں اجیت نام کے ایک شخص کا ایڈریس لکھ رہی ہوں۔ یہ شخص دہلی کا رہنے والا ہے۔ تم یہ دوسرا خط اُس تک پہنچا دینا۔ اس لفافے میں جو رقم ہے وہ تمہارے اخراجات کے لیے ہے۔ میں اس کام کے لیے ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی...... فقط ایک مجبور۔''

خط کے عین مطابق اگلی شب گوبند کو اپنی منحوس کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ برآمدے میں دس بارہ قدم کے فاصلے پر مسلح چوکیدار چت لیٹا تھا۔ گوبند جب اُس کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ روپ وتی کا دوسرا دعویٰ غلط ثابت ہوا تھا۔

چوکیدار نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ جاگ رہا تھا۔ گوبند کے پاس اب بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ بیرونی گیٹ کی طرف لپکا تاکہ کسی مناسب مقام سے دیوار پھاند سکے۔ چوکیدار نے چلا کر دوسرے چوکیدار کو خبردار کیا لیکن وہ اپنی کرسی پر نیم دراز رہا اور ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھڑی کے چوکیدار کی بجائے یہ گیٹ والا چوکیدار انٹاغفیل ہو گیا ہے یا پھر یہ ایک اتفاق تھا کہ چوکیداروں نے اپنی ڈیوٹی تبدیل کر لی تھی۔ بے ہوش چوکیدار کے قریب ہی پختہ کیبن کی دیوار سے ریوالور لٹک رہا تھا۔ گوبند نے لپک کر یہ ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔ عقب میں آنے والا چوکیدار اب اُس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں دونالی رائفل تھی جس کا رُخ گوبند کی طرف تھا۔ گوبند نے جب دیکھا کہ اور کوئی چارہ نہیں رہا تو لبلبی دبادی۔ گولی سیدھی چوکیدار کی چھاتی میں لگی اور رائفل سمیت پہلو کے بل گر گیا۔ کرسی پر نیم دراز چوکیدار پھر بھی بیدار نہیں ہوا۔ گوبند نے چھوٹے دروازے کی کنڈی گرائی اور بنگلے سے باہر نکل آیا۔

بنگلے سے فرار ہونے کے بعد وہ کئی روز مختلف جگہوں پر چھپتا رہا۔ اُسے امید نہیں تھی کہ چوکیدار زندہ بچا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں اب وہ ایک خونی تھا۔ وہ آزاد ہو کر بھی اپنے اہل خانہ اور عزیز واقارب میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پولیس اور چاکرانی کے ہرکارے ہر جگہ اُسے ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے۔ اخراجات کے لیے رقم اُس کے پاس موجود تھی۔ اُس نے سیدھا دہلی کا رُخ کیا...... بنگلے سے فرار ہونے کے بعد گوبند سے ایک گڑبڑ ہو چکی تھی۔ ایک رات کئی گھنٹے تک اُسے بارش میں بھیگنا پڑا تھا۔ اُس کا لباس شرابور ہو گیا تھا اور جیب میں پڑے ہوئے وہ دونوں خط بھی بھیگ کر اور گل کر بیکار ہو گئے تھے......

اس موقع پر گوبند اپنی روداد سناتے سناتے رُکا اور اُس نے مجھے اُن دونوں خطوں کے چند ٹکڑے دکھائے۔ ان ٹکڑوں سے صرف دو باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک تو اجیت کمار کا نامکمل ایڈریس اور دوسرے یہ حقیقت کہ روپ وتی نے اپنے پرانے شناسا اجیت کمار کو مدد کے لیے بلایا تھا کہ وہ اُس تک پہنچے اور اُسے اس کے ظالم شوہر سے رہائی دلائے...... اب گوبند اجیت کمار تک پہنچنے کے لیے اُس کی کوٹھی کے چکر لگا رہا تھا۔ پہلے دو تین روز تو اُسے اجیت کا چوکیدار ہی ٹرخاتا رہا تھا پھر اُسے معلوم ہوا تھا کہ اجیت کسی شو میں حصہ لینے میرٹھ گیا ہوا ہے...... آج بھی گوبند، اجیت کا پتہ کرنے ہی نئی آبادی آیا تھا۔ وہ چاندنی چوک سے سوار ہو کر یہاں پہنچا تھا۔ ابھی بس سے اُتر ہی رہا تھا کہ ہم نے دیکھ لیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بدک اٹھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

گوبند کے بارے میں اب سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ وہ کیسے گم ہوا۔ اب تک کہاں رہا اور ڈلہوزی سے یہاں دہلی میں کیونکر پہنچا؟ سب کچھ سامنے آ چکا تھا۔ میری اصل جستجو گوبند کے لیے تھی اور گوبند کا کھوج لگ چکا تھا لیکن گوبند کی وجہ سے جو ایک نیا کیس کھل گیا تھا اُس کو انجام تک پہنچانا بھی میری ذمے داری تھی۔ اس کے علاوہ چاکرانی کو سزا بھی اُسی صورت میں ہو سکتی تھی جب یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ اپنی بیوی سے ناروا سلوک کرتا تھا اور اس سلوک کو چھپانے کے لیے اُس نے گوبند کو نو ماہ تک حبس بیجا میں رکھا اور ذہنی و جسمانی اذیتیں دیں۔

اگلے روز اجیت کمار میرٹھ سے واپس آ گیا اور ہم نے اُس سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات اجیت کے گھر میں ہوئی۔ میرے ساتھ مقامی تھانے کا انسپکٹر اصغر علی اور انسپکٹر نذیر محمد بھی تھے۔ شروع کی گفتگو میں وہ میرے ساتھ تھے تاہم بس میں اُٹھ کر چلے گئے۔ اجیت کمار مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ روپ وتی جیسی حسین وجمیل لڑکی کا ایسے مرد پر مرمٹنا سمجھ میں آتا تھا۔ محاورے کے مطابق یہ چاند سورج کی جوڑی بن سکتی تھی۔ روپ وتی میں اگر نسوانی خوبیاں یکجا نظر آتی تھیں تو اجیت بھی مردانہ صفات میں کسی سے کم نہیں تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے اجیت کمار کو اپنے ڈھب پر لانا شروع کیا۔ میں روپ وتی کے ساتھ اس کے معاشقے اور پھر دوری کی کہانی اُسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے میں مجھے دیر تو لگی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ میں نے جب اجیت کو روپ وتی کے خط کے ٹکڑے دکھائے تو وہ ایک دم ہکابکا نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے کوئی دبیز پردہ ہٹ رہا تھا۔ وہ پوچھنے لگا کہ یہ خط مجھے کہاں سے اور کیسے ملا؟ میں نے اُسے گوبند کے بارے میں بتایا اور اس سلسلے میں دیگر ضروری باتوں سے آگاہ کیا۔ اُس نے کہا۔ ''روپ کی شراب نوشی کا تو مجھے پتہ تھا نواز صاحب...... مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ پتی پتنی میں ناچاقی اتنی بڑھ چکی ہے، بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ یہ سب کیسے ہوا ہے۔ عام لوگوں کے سامنے تو اُن دونوں کے تعلقات ایسے خراب نہیں تھے۔''

میں نے کہا۔ ''اجیت صاحب! جیسے بھی ہوا ہے بہرحال یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ میں خود اس بات کا گواہ ہوں۔ روپ وتی خود کو چاکرانی کے گھر میں ''قیدی'' محسوس کر رہی ہے اور کسی بھی قیمت پر اُس کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی ہے...... اور ہم انشاء اللہ اُسے آزاد کرائیں گے بھی، لیکن اُس کے لیے آپ کو بھی ہم سے تعاون کرنا ہوگا، اور وہ حالات بتانے ہوں گے جن کے نتیجے میں روپ وتی، چاکرانی جیسے شخص کے جال میں پھنسی ہے۔''

اجیت کمار نے ایک گہرا سانس لیا اور سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! اس سلسلے میں بہت کچھ اخباروں رسالوں میں چھپتا رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھے بے وفا ٹھہرایا ہے اور کچھ نے روپ کو دغابازی کا تمغہ دیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ میری نظر روپ کی دولت پر تھی اور کچھ کہتے ہیں کہ میں اُس کی جوانی سے کھیل کر اُسے چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں پریس میں آتی ہیں لیکن حقیقت سے اُن کا دُور کا بھی تعلق نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن یہ تو حقیقت ہے ناں کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ کر دور ہو گئے ہیں...... بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک موقع پر روپ وتی سے آپ کا جھگڑا ہوا تھا اور آپ نے اُسے تھپڑ مارا تھا۔''

اجیت نے کش کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... یہ جھگڑے والی بات کسی حد تک درست ہے۔ درحقیقت جھگڑا اُس کش مکش کا انجام ثابت ہوا جو پچھلے دو برسوں سے میرے اور روپ میں جاری تھی۔''

''کیسی کش مکش؟'' میں نے پوچھا۔

''بس یہی بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔'' اجیت نے دردناک انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''ہماری کش مکش کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ایک بیکار کی اکڑ تھی جو ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھے ہوئے تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جنہیں ہم نے خواہ مخواہ اپنے لیے مسئلہ بنا لیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو بے انتہا چاہنے کے باوجود کھچے کھچے رہتے تھے۔ معمولی باتوں پر رُوٹھ جاتے تھے اور مہینوں ایک دوجے سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ کبھی میں کسی بات کو اپنی ہتک سمجھ لیتا تھا کبھی وہ رائی کے دانے کو پہاڑ بنا لیتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ ہم دونوں میں بچپنا تھا۔ یہ بچپنا ہم سے چھوٹی چھوٹی غلطیاں کراتا رہا یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ یہ جدائی اس لیے زیادہ افسوس ناک تھی کہ ہم منزل کے قریب پہنچ کر راستہ بھٹکے تھے۔ ہماری شادی کی بات چل نکلی تھی۔ میری والدہ راضی تھیں والد بھی رضامندی ظاہر کر چکے تھے۔ دوسری طرف روپ وتی کی والدہ اور بہنیں ہی خوش تھیں مگر اچانک سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ایک معمولی بات پر ہمارا جھگڑا ہوا۔ میرے ایک گہرے دوست نے اسٹیج شو کا انتظام کیا تھا۔ اس شو میں روپ وتی بھی حصہ لے رہی تھی۔ شو کی ساری ٹکٹیں بک چکی تھیں۔ رات آٹھ بجے شو ہونا تھا اور ایک گھنٹہ پہلے روپ وتی نے شو میں شرکت سے انکار کر دیا۔ شو کے منتظمین کے چھکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور چاہا کہ میں روپ وتی سے سفارش کروں۔ میں

روپ وتی کو منانے کے لیے پہنچا تو معلوم ہوا کہ اُس کی بڑی بہن کو انگلینڈ جانا ہے اور وہ اُسے ''سی آف'' کرنے کے لیے ہوائی اڈے جانا چاہتی ہے۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ شو میں شرکت اُس کے لیے زیادہ ضروری ہے، مالک کو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا اور بدنامی الگ ہو گی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ کسی طور نہیں مانی۔ اپنی بات پر اڑ جانے کی اُس کی یہی عادت ہمیشہ جھگڑے کا سبب بنتی تھی۔ اُس دن معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا اور میں نے بھنا کر اُسے تھپڑ دے مارا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس واقعے کو دو ڈھائی برس گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد کبھی ہماری بات نہیں ہوئی۔ دونوں گھرانوں نے بھی قطع تعلق کر لیا۔ جھگڑے سے چار ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک روز میں نے بے پناہ صدمے سے یہ خبر سنی کہ روپ وتی نے ایک رنڈوے سے شادی کر لی ہے۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میری مراد رابندر ناتھ چاکرانی سے ہے۔ میں اُسے برا آدمی تو نہیں کہہ سکتا لیکن وہ بالکل اور ٹائپ کا آدمی ہے۔ تعلیم غالباً اس کی میٹرک تک ہے۔ باپ پہلوانی کرتا تھا اور اپنے حریفوں کی ہڈی پسلی توڑنے میں مشہور تھا۔ چاکرانی خود بھی جنگجو قسم کا آدمی ہے۔ میری اُس سے بہت کم ملاقات ہوتی ہے اور اس کے گھریلو حالات کے بارے میں تو میری معلومات صفر ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اُس کے قریبی دوست بھی اُس کے گھریلو حالات کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو اپنی ذاتی زندگی کو کاروباری زندگی سے بالکل الگ رکھتے ہیں۔ شادی کے فوراً بعد اُس نے روپ وتی کو ڈراموں میں حصہ لینے سے منع کر دیا تھا۔ وہ عام تقریبات میں بھی کم ہی نظر آتی تھی...... میں تو خط کے یہ ٹکڑے دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔ ان فقروں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ...... کسی قیدی کی زندگی گزار رہی ہے۔ روپ وتی جیسی پڑھی لکھی نازک مزاج لڑکی کی چاکرانی جیسے شوہر سے نبھ ہی نہیں سکتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''چاکرانی آپ کی اور ہماری توقع سے بہت آگے کی چیز ہے اجیت کمار صاحب! اگر روپ وتی کچھ روز مزید اُس کے پاس رہ گئی تو وہ ضرور اُسے پاگل کر دے گا۔ میں آپ کی بات سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ روپ وتی نے چاکرانی جیسے شخص سے شادی کر کے غلطی کی تھی لیکن عورت کو تو ہمیشہ سے کم عقل سمجھا جاتا ہے کیا آپ کی ذمے داری نہیں تھی کہ اُسے اس گڑھے میں گرنے سے بچاتے۔ آخر آپ مرد تھے۔ مرد کی ہمت اور برداشت عورت سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ اگر وہ ضد میں آ گئی تھی تو آپ ہی ضد چھوڑ کر معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرتے۔''

وہ بولا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں نواز صاحب! لیکن وہ کوئی بے آسرا لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی نابالغ تھی۔ اپنا اچھا برا خوب ٹھیک طرح سمجھتی تھی اور سمجھانے بجھانے کے لیے اس کے بزرگ بھی موجود تھے۔ اور پھر مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ آناً فاناً خبر ملی کہ روپ کی شادی چاکرانی سے ہو رہی ہے۔ دو روز بعد اس شادی کی تصویر بھی اخبار میں چھپ گئی۔''

میں نے پوچھا۔ ''اب اُس کے بزرگان کہاں ہیں۔ کیا انہیں دکھائی نہیں دیتا کہ اُن کی بیٹی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

اجیت نے کہا۔ ''اس کی بڑی بہن شادی کر کے انگلینڈ چلی گئی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کو بلایا پھر بھائی بھی چلے گئے۔ اب ایک خالہ کے سوا اُس کا کوئی قریبی عزیز دہلی میں نہیں ہے۔ وہ خالہ بھی اکثر شہر سے باہر رہتی ہے۔ اُس کا خاوند سرکاری ملازم ہے اور یہ ملازمت گھومنے پھرنے کی ہے۔''

اجیت کے بیان سے بات پوری طرح واضح ہو گئی تھی۔ روپ وتی اگر رابندر ناتھ چاکرانی کے چنگل میں پھنسی تھی تو اس میں زیادہ قصور روپ وتی کا اپنا تھا۔ درحقیقت اُس نے اجیت سے انتقام لینے کے لیے چاکرانی سے شادی کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ چاکرانی تھیٹر کی دُنیا میں اجیت کا حریف ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اُس نے اپنا آپ چاکرانی کی جھولی میں ڈال کر اجیت کے دل پر آرے چلائے تھے۔ شب و روز اُسے تڑپایا تھا اور رقابت کی آگ میں جلایا تھا لیکن پھر اس آگ میں وہ خود بھی جلنے لگی تھی۔ جسے اُس نے شوہر بنایا تھا وہ بھی کاٹھ کا اُلو نہیں تھا۔ یقیناً اُسے بھی اندازہ ہو گا کہ روپ وتی نے اپنا نوخیز جوبن اُس کی بانہوں میں پھینکا ہے تو کیوں پھینکا ہے۔ وہ روپ وتی اور اجیت کے قصے سے پوری طرح آگاہ تھا لہٰذا شادی کے پہلے روز سے اُن دونوں میں وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکا تھا جسے محبت کا رشتہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ روپ وتی نے چاکرانی کو بیوی کی محبت دینے کی کوشش کی ہو لیکن چاکرانی اُسے شوہر کا اعتماد نہیں دے سکا تھا۔ اب وہ خوبصورت چڑیا ایک بے مقصد رشتے کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اور پھڑ پھڑا رہی تھی...... اب اُسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوا تھا اور وہ مدد کے لیے اپنے ناراض محبوب کو پکار رہی تھی...... بڑی عجیب و غریب صورتِ حال تھی یہ۔ میں تو اسے بھی اجیت کی مہربانی ہی کہوں گا کہ وہ روپ وتی کی مصیبت کا سن کر یوں بے قرار نظر آنے لگا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو سوچتا ایک بے وفا عورت کے لیے اُسے کیا ضرورت پڑی ہے چاکرانی جیسے بااثر شخص سے ٹکرانے کی...... خط کے ٹکڑے دیکھنے اور مجھ سے دیگر حالات جاننے کے بعد اُس کی

خوبصورت آنکھوں میں کسی بے نام جذبے کی آگ سی جلنے لگی تھی اور یوں لگتا تھا وہ اُڑ کر ڈلہوزی پہنچ جانا چاہتا ہے۔ سارے پرانے شکوے بھول کر، ہر نفع نقصان فراموش کر کے اور دل کے سارے داغ چھپا کر وہ ایک بار پھر روپ وتی کو گلے لگا لینا چاہتا ہے...... عشق ایسا ہی اوٹ پٹانگ ہوا کرتا ہے۔ اونٹ کی طرح اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ آنے والے لمحے کی طرح کوئی اُس کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ جب اجیت اور روپ وتی کے ملاپ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی انہوں نے خود اپنے درمیان فاصلے پیدا کر لیے تھے اور اب جبکہ اُن کے درمیان رشتے کی ایک بہت بڑی دیوار حائل تھی وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے...... لیکن وقت گزر چکا تھا اور گزرا ہوا وقت شاذ و نادر ہی کسی کے لیے واپس لوٹا کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وقت روپ وتی اور اجیت کے لیے واپس لوٹے گا یا نہیں۔

☆======☆======☆

تین چار روز بعد یہ کیس فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گیا۔ میرے اور بلال شاہ کے علاوہ گوبند اور اجیت کمار بھی ڈلہوزی پہنچ چکے تھے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں دو ہیڈ کانسٹیبلوں کے ساتھ گورا پہاڑ کی طرف روانہ ہوا۔ جیپ کے ذریعے ایک طویل چکر کاٹ کر جانا پڑتا تھا۔ لہٰذا ایک گھنٹے بعد جب ہم گورا پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو چاروں طرف تاریکی پھیل چکی تھی بلندی پر واقع بنگلوں میں صرف چودہ نمبر کے بنگلے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ جیپ سے اُتر کر ہم بنگلے کے مین گیٹ پر پہنچے اور چوکیدار کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع اندر بھجوائی۔ تھوڑی ہی دیر بعد چوکیدار واپس آ گیا وہ ہماری آمد سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ اُس نے ہمیں سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ڈرائی فروٹ کی طشتری سامنے رکھ کر چلا گیا۔ رابندر ناتھ چاکرانی قریباً پندرہ منٹ بعد آیا۔ اُس نے معذرت کی اور کہا کہ وہ پوجا کے کمرے میں تھا۔ بڑی زبردست اداکاری کر رہا تھا کم بخت...... آنکھوں میں ویرانی تھی اور چہرے پر مظلومیت کے سائے۔ ایک بدنصیب شوہر کی جیتی جاگتی تصویر بنا ہوا تھا وہ۔ میں اس کی اداکاری سے لطف اندوز ہونے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''اب آپ کی مسز کی طبیعت کیسی ہے؟''

''بس جی بھگوان کی مرضی ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''وہ جس حال میں رکھے خوش رہنا چاہیے۔''

''یعنی کچھ افاقہ نہیں ہوا۔''

''انسپکٹر صاحب! افاقہ اُس وقت ہوتا ہے جب مریض خود بھی صحت یاب ہونا

چاہے، لیکن جو مریض خود کو تباہ کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہو اُسے کون روک سکتا ہے۔ پہلے وہ دن بھر میں ایک بوتل پیتی تھی اب اس سے بھی بڑھ گئی ہے۔ نشہ نہ ملے تو ہنگامہ کرتی ہے۔ خودکشی کی دھمکیاں دیتی ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ آدمی بے شک بہت برا تھا لیکن اداکار اچھا تھا۔ کوئی اُسے دیکھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس نے ایک عورت کو ڈیڑھ برس سے جھوٹی انا کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اغوا، حبس بے جا اور ایذا رسانی جیسے جرائم میں ملوث ہے۔ میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''چچ چچ بہت ترس آ رہا ہے آپ پر، اور آپ کی ہمت پر داد دینے کو بھی جی چاہ رہا ہے۔ میاں بیوی کے رشتے کا صحیح حق ادا کر رہے ہیں آپ۔ بیمار بیوی کی تیمارداری کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کو...... آپ کو تو وکٹوریہ کراس ملنا چاہیے بلکہ کوئی اس سے بھی بڑا ایوارڈ ہونا چاہیے۔''

''جی؟'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''جی'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کتنا خیال ہے آپ کو اپنی پتنی کا۔ اُس کی بیماری کو راز رکھنے کے لیے بندے تک اغوا کر لیتے ہیں آپ اور کئی ماہ تک ان کے لیے طعام و قیام کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ کون پتی ایسا مائی کا لال ہوگا جو اس حد تک جائے گا۔ ونڈر فل...... رئیلی ایکسٹرا آرڈنری''

چاکرانی کا ماتھا پوری طرح ٹھنک چکا تھا۔ وہ منمنا کر بولا۔ ''میں...... کچھ سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''سمجھ تو تمہیں ساری آ رہی ہے لیکن تم تسلیم نہیں کر رہے ہو۔''

میں ایک دم ''آپ'' سے ''تم'' پر اُتر آیا تھا۔ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ ''انسپکٹر! کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ کچھ پی کر تو نہیں آ گئے ہو۔''

میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اُس نے چرمی بیگ میں رکھی ہوئی ہتھکڑی نکال لی۔ ڈرائنگ روم کی خاموشی میں ہتھکڑی کی کھڑکھڑاہٹ بڑی دھماکہ خیز محسوس ہوئی۔ چاکرانی ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ میں نے اس موقعے پر مناسب سمجھا کہ ریوالور نکال لیا جائے۔ ابھی میرا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ پہلو میں ایک دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے لحیم شحیم شاہی کو تیر کی طرح اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی مانند مجھ سے ٹکرایا اور مجھے لیتا ہوا

فرش پر دور تک پھسل گیا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے چند لمحے کے لیے دھند سی پھیل گئی۔ یہ دھند صاف ہوئی تو میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو کھڑکی سے کود کر بھاگتے دیکھا۔ یہ ہندو کانسٹیبل تھا اور اس ''قوم کے لوگ'' ایسے موقعوں پر اکثر بھاگا ہی کرتے ہیں۔ دوسرا کانسٹیبل جو سکھ تھا شاہی کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رائفل کو ایسی پوزیشن میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاہی پر گولی چلا سکے لیکن اس سے پہلے کہ رائفل ایسی پوزیشن میں آتی یا میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر کانسٹیبل کی مدد کر سکتا، ایک برق سی میری نگاہوں میں کوند گئی۔ میں نے شاہی کی تلوار کو کانسٹیبل کے پیٹ میں گھستے اور باہر نکلتے دیکھا۔ کانسٹیبل کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ تڑپ کر فرش پر جا گرا۔ یہ سارا واقعہ ایک سیکنڈ کے مختصر وقت میں رونما ہو گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہوا تو شاہی دونوں ہاتھوں میں خون آلود تلوار سونت کر میرے سامنے آ چکا تھا۔ وہ مناظر میری زندگی کی چند ناقابل فراموش یادوں کا حصہ ہیں۔ آج بھی تصور کرتا ہوں تو سب کچھ آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ جاتی ہے۔ شاہی کا صفاچٹ چہرہ انگارے کی طرف دہک رہا تھا اور آنکھوں میں جنون کا رقص تھا۔ وہ بڑی خوفناک آواز میں غرایا۔ ''تھانیدار! تجھے کہا تھا ناں۔ اس وقت کو بھولنا مت...... اس وقت کو یاد رکھنا بول...... کہا تھا ناں تجھے؟'' وہ ہوش و حواس سے بیگانہ تھا اور میرے خون کا پیاسا نظر آ رہا تھا۔ میں اُسے جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا رہا ہونا بعید از قیاس تھا۔ یقیناً وہ جیل توڑ کر آیا تھا۔ بہرحال یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ یہ وقت تھا شاہی کی قاتل تلوار پر نگاہ رکھنے کا اور خود کو اس تلوار کی ظالم کاٹ سے بچانے کا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس وقت میرے قدموں میں زخمی کانسٹیبل کا جسم پھڑک رہا تھا اور میں دیوار سے پشت لگائے شاہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید چاکرانی نے شاہی کو روکنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن شاہی کہنے سننے کی حد سے گزر چکا تھا۔ ''میرے قتل'' سے کم وہ کسی بات پر راضی نہیں تھا۔ غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ہی وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا...... اُس کے پہلے دو وار میں نے صاف بچائے لیکن تیسرا وار میرے کندھے پر پڑا اور تلوار کی دھار جرسی قمیض اور بنیان کاٹ کر کندھے میں پیوست ہو گئی...... ایک بار مجھے نشانہ بنانے کے بعد شاہی کی درندگی کچھ اور بڑھ گئی وہ اندھا دُھند مجھ پر وار کرنے لگا۔ میں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اُس کے وار بچا رہا تھا۔ معلوم نہیں کتنی بار شاہی کی تلوار میرے جسم کو چھو کر گزری۔ کتنے چرکے لگے اور کتنے زخم آئے۔ مجھے وہ مناظر ''دھندلے دھندلے'' سے یاد ہیں۔ بنگلے کے نوکر ڈرے سہمے دیواروں سے لگے تھے۔

چاکرانی کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا اور وہ چلا چلا کر شاہی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میرا لباس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور تلوار چھیننے کی کوشش میں ایک ہاتھ بری طرح سے زخمی تھا۔ جونہی میں ڈرائنگ روم کی کھڑکی پر پہنچا میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ بنگلہ چونکہ ڈھلوان پر تھا لہٰذا کھڑکی سے چھلانگ لگا کر میں قریباً بیس فٹ نیچے پتھریلی زمین پر گرا۔ دونوں پاؤں پر چوٹ آئی تاہم ایسی چوٹ نہیں تھی کہ میں کھڑا نہ ہو سکتا۔ جیپ قریباً چالیس گز کی دوری پر موجود تھی اور اُس میں ایک بھری ہوئی شاٹ گن رکھی تھی۔ میں دوڑ کر جیپ تک پہنچ سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے امید تھی کہ جیپ تک جانے کی نوبت نہیں آئے گی اور پھر وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا۔ غضب میں پھنکارتے ہوئے شاہی نے اپنے ڈیل ڈول کی پرواہ کیے بغیر کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ ترچھا ہو کر زمین پر گرا۔ جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر پھر گر گیا۔ میں نے اُسے دوسری کوشش کرنے کا موقع نہیں دیا اور لپک کر دبوچ لیا۔ جونہی اُس کی تلوار والی کلائی میری گرفت میں آئی میں نے بے پناہ نفرت سے کلائی کو مروڑا اور تلوار اُس کے ہاتھ سے گرا دی۔ اس نے اپنے استرا پھرے ہوئے سر سے ٹکر مار کر مجھے گوبند کی طرح کسی کھائی میں پھینکنا چاہا لیکن اس دفعہ اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اُس کی ٹکر میرے چہرے کی بجائے سر پر لگی۔ یہ آخری وار تھا جو اُس نے کیا۔ اس کے بعد وہ صرف دفاع کرتا رہا اور آخر دفاع کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اردگرد کے بہت سے مقامی لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے۔ یہ میرے حق میں بہت بہتر ہوا کیونکہ مجمع لگنے کے بعد چاکرانی یا اُس کے نوکروں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ کسی بھی طرح شاہی کی مدد کر سکتے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر یہ سارا کھیل ختم ہو گیا۔ شاہی لہولہان فرشِ خاک پر پڑا تھا۔

☆======☆======☆

شاہی اور چاکرانی گرفتار ہوئے (شاہی کے کارندے دولورام کو بعد میں پٹھانکوٹ سے پکڑا گیا) تھوڑی دیر بعد ڈلہوزی سے پولیس کی مزید نفری گورا پہاڑ پہنچ گئی۔ اس نفری کے ساتھ دو ڈاکٹر اور ابتدائی طبی امداد کا سامان بھی تھا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل کے پیٹ میں تلوار کا گہرا زخم آیا تھا اور آنتوں کو نقصان پہنچا تھا۔ ڈاکٹروں نے اُسے چاکرانی کے بنگلے میں ہی طبی امداد پہنچائی اور پھر مزید علاج معالجے کے لیے جیپ میں ڈال کر ڈلہوزی لے گئے۔ پولیس کی مزید نفری آنے کے بعد ہم نے چاکرانی کے وسیع بنگلے کی تلاشی لی۔ چاکرانی کے بیڈ روم سے عیاشی کے دیگر سامان کے علاوہ ایک نوعمر طوائف بھی برآمد ہوئی۔ جس وقت میں بنگلے پر پہنچا چاکرانی اسی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ نتیجے میں میں پندرہ بیس منٹ

اُس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ آ کر چاکرانی نے بتایا تھا کہ وہ ''پوجا پاٹ کے کمرے'' میں تھا...... (اچھی پوجا پاٹ تھی) روپ وتی کو بالائی منزل کے ایک تنگ و تاریک کمرے سے برآمد کیا گیا۔ شراب نوشی نے اُس کی حالت بہت پتلی کر دی تھی پھر بھی وہ خوبصورت نظر آتی تھی۔ یقیناً وہ بہت خوبصورت رہی ہو گی۔ ڈلہوزی سے پولیس پارٹی کے ساتھ اجیت کمار بھی آیا تھا۔ اجیت کو دیکھ کر وہ زور زور سے رونے لگی۔ اجیت نے اُسے کندھے سے لگا لیا اور دلاسہ دینے لگا۔

ڈلہوزی کے تھانے میں پہنچ کر روپ وتی نے جو طویل بیان دیا اُس میں اہم بات یہی تھی کہ چاکرانی نے اُسے حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا۔ ''یہ میرا شریکِ حیات نہیں جلاد ہے۔ اس نے ڈیڑھ برس سے مجھے قید تنہائی میں رکھا ہوا ہے۔ میں دن رات اس کی گالیاں سنتی اور ٹھوکریں کھاتی رہی ہوں۔ بھگوان جانتا ہے مجھے شراب کی عادت ڈالنے والا شخص بھی یہی ہے۔ یہ پرلے درجے کا شکی مزاج اور مکار شخص ہے۔ یہ میری پاک دامنی پر شبہ کر کے مجھے بے وفائی کے طعنے دیتا تھا اور خود بازاری عورتوں کے ساتھ سوتا تھا۔ اس نے مجھے صرف قتل نہیں کیا باقی ہر وہ ظلم کیا ہے جو یہ کر سکتا تھا......''

روپ وتی کے سخت ترین بیان کے بعد چاکرانی کے خلاف کیس مزید مضبوط ہو گیا۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ شاہی کی وجہ سے پوری ہو گئی۔ شاہی کے ساتھ چاکرانی کا تعلق اب ثابت ہو چکا تھا۔ اس تعلق کی مختصر کہانی یہ ہے کہ کھائی سے گوبند کے غائب ہو جانے کے بعد شاہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ مسلسل اُس کی تلاش میں رہا تھا۔ آخر اُسے شک ہو گیا تھا کہ گوبند ''گورا پہاڑ'' پر ادا کار چاکرانی کے بنگلے میں ہے۔ وہ چاکرانی کے بنگلے تک جا پہنچا تھا۔ چند دن کے تعلق کے بعد اُن دونوں میں ''انڈرسٹینڈنگ'' ہو گئی تھی شاہی نہ صرف چاکرانی کا رازدار بن گیا تھا بلکہ چاکرانی کی راتوں کو ''چمکانے'' کے لیے اُس کے واسطے شہر سے بازارِ حسن کے ''تحفے'' بھی لاتا تھا۔ جب شاہی میرے ہاتھوں پکڑا گیا تو یہ کام اس کے کارندے دولورام نے سنبھال لیا۔ ان لوگوں کی بدقسمتی اور روپ وتی کی خوش قسمتی کہ دولورام میری نگاہ میں آ گیا اور میں اس کا پیچھا کر کے چاکرانی کے بنگلے تک جا پہنچا۔

شاہی کو گرفتار کرنے کی کوشش میں مجھے کافی زخم آئے تھے لیکن خوش قسمتی سے کندھے کے علاوہ کوئی زخم سنگین نہیں تھا۔ تین چار روز کی مرہم پٹی سے یہ زخم ٹھیک ہو گئے۔ اس کہانی کا اہم ترین کردار گوبند ہے...... نو مہینے کی پراسرار گمشدگی کے بعد جب وہ ڈلہوزی پہنچا اور اپنے اہلِ خانہ سے ملا تو ایک دیدنی منظر دیکھنے میں آیا۔ اس موقع پر اُس کے کئی پرستار بھی

جمع ہو چکے تھے۔ پرستار...... پرستار ہی ہوتا ہے۔ ان پرستاروں کو بھی یہ معلوم تھا کہ اُن کے ''ہیرو'' نے سالانہ ریس میں اپنی فتح کا سودا کیا تھا پھر بھی وہ اُس کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ اس موقع پر گوبندا اپنے کیے پر بہت نادم نظر آ رہا تھا...... بہر حال اس ندامت میں ایک نئی زندگی مل جانے کی خوشی بھی شامل تھی۔ زندگی...... جو انسان کو میسر ہو تو غلطیوں کی تلافی کے ہزارہا مواقع مل جاتے ہیں۔ گوبند کے لیے ایک اور خوش کن بات یہ تھی کہ وہ قتل کے الزام سے بچ گیا تھا۔ چاکرانی کے بنگلے سے فرار ہوتے وقت اُس کے ہاتھوں جس چوکیدار کو گولی لگی تھی وہ مرا نہیں تھا صرف زخمی ہوا تھا۔ یہ جسمانی ضرر کا کیس تھا اور حفاظت خود اختیاری کے ضمن میں آ کر زیادہ سنگین نہیں رہتا تھا۔

اس کیس کے بڑے مجرموں شاہی اور چاکرانی کو بالترتیب بارہ اور آٹھ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی جبکہ دولو رام کو مختلف دفعات کے تحت پانچ سال قید بھگتنا پڑی...... ان واقعات کے قریباً ایک سال بعد اجیت کمار اور روپ وتی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ واقعی بہت خوب جوڑی تھی وہ۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ میاں بیوی تھیٹر کے لوگ ہیں۔ زیادہ دیر یہ ساتھ نبھا نہیں سکیں گے لیکن اس جوڑے نے ان تمام دعووں کو غلط ثابت کر دیا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد بھی مجھے ان دونوں کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں۔ گو اُن کی نرینہ اولاد نہیں تھی مگر وہ دہلی میں بڑی خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔

☆======☆======☆

یہ ڈلہوزی کے بلند و بالا پُر فضا پہاڑوں کا واقعہ ہے۔ ڈلہوزی کی فیشن ایبل آبادی جسے ''صدر'' کہا جاتا ہے وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں چند کالج بھی ہیں۔ اُن دنوں وہاں ''کنگ کالج'' کافی مشہور تھا۔ یہاں کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں تعلیم پاتے تھے۔ بےفکرے فیشن ایبل اور آزاد نوجوان اس کالج کی پہچان تھے۔ دو تین اور کالج بھی کنگ کالج کے ٹائپ کے تھے مگر کنگ کالج ہر طرح نمبرون تھا۔ کنگ کالج کے سرپرست اعلیٰ کا نام سردار اشوک رائے تھا۔ سردار صاحب بڑی بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ کانونٹ میں پڑھے ہوئے تھے۔ ساری عمر اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے رہے تھے۔ رنگ وروپ بھی ماشاءاللہ بہت خوب تھا۔ بالکل گورے چٹے، براؤن آنکھوں والے، انہیں دیکھ کر کسی انگریز افسر کا گمان ہوتا تھا۔ سردار اشوک کی عمر پچاس سال سے اوپر تھی۔ تاہم وہ اب بھی صبح سویرے دوڑ لگاتے تھے اور کبھی کبھار اپنی وسیع کوٹھی کے لان میں ٹینس کھیلتے بھی پائے گئے تھے۔ جوانی میں سردار صاحب دوڑ کے چیمپئن رہے تھے اور اب ان کا بیٹا سردار شیکھر چیمپئن سمجھا جاتا تھا۔

یہ چیمپئن شپ جس کی میں بات کر رہا ہوں طویل عرصہ پہلے شروع ہوئی تھی شاید 1905ء کے لگ بھگ۔ اس کی شروعات کرنے والا ایک انگریز صاحب بہادر اسمتھ تھا۔ وہ کھیلوں کا بہت شوقین تھا اور خاص طور پر دوڑ کا۔ اُس نے اپنے شوق کے لیے ایک ''ریس'' کی داغ بیل ڈالی۔ میراتھن ریس کی طرح یہ ریس بھی اسٹیڈیم سے باہر ہوتی تھی۔ ریس میں حصہ لینے والے قریباً 18 میل کا انتہائی دشوار گزار راستہ طے کرتے تھے۔ جیتنے والے کو ٹرافی اور نقد انعام دیا جاتا تھا۔ شروع میں یہ انعام 200 روپے تھا لیکن جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں انعام کی رقم بڑھتے بڑھتے 1500 روپے تک پہنچ چکی تھی۔ اُن دنوں 1500 روپیہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ اس ریس میں ہر کوئی حصہ لے سکتا تھا۔ بہت سے مقامی اور غیر مقامی نوجوان کئی ماہ پہلے سے دوڑنے کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ جیتنا تو

کسی ایک نے ہوتا تھا لیکن جیت کی خواہش ہر دل میں ہوتی تھی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہر کھلاڑی ایڑی چوٹی کا زور لگاتا تھا۔

مجھے ڈلہوزی کے شمالی تھانے میں ڈیوٹی سنبھالے سات آٹھ مہینے ہوئے تھے جب مجھے پتہ چلا کہ یہاں ایک سالانہ ریس ہونے والی ہے۔ بلال شاہ ایسے معاملات کی بہت خبر رکھتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے مجھے اس بارے میں بہت سی باتیں ایک ہی سانس میں بتادیں۔

اُس نے کہا۔ ''جناب! یہ ریس مارچ کی آٹھ تاریخ کو ہوگی، یعنی ایک ماہ بعد۔ ریس کنگ کالج کی گراؤنڈ سے شروع ہوگی اور کھلاڑی کوئی اٹھارہ میل کا چکر کاٹ کر پھر کالج کی گراؤنڈ میں آجائیں گے۔ اس دوڑ میں ڈلہوزی اور ڈلہوزی سے باہر کے قریباً دو سو دوڑنے والے حصہ لیں گے لیکن اُن میں سے کسی کے جیتنے کی امید بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوڑ میں سردار اشوک کا لڑکا سردار شیکھر بھی حصہ لے رہا ہے اور پچھلے چار سال سے وہی یہ دوڑ جیت رہا ہے۔ سردار شیکھر سے پہلے اُس کا بڑا بھائی سردار دلیپ یہ ریس جیتتا تھا اور سردار دلیپ سے پہلے اس کا ماموں زاد پرتھی پال۔ دراصل پچھلے تیس پینتیس سالوں میں اکثر سردار خاندان کے لڑکے ہی یہ دوڑ جیتتے رہے ہیں۔ صرف تین چار دفعہ ہی ایسا ہوا ہوگا کہ کسی دوسرے لڑکے نے یہ میدان مارا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''پھر تو عام لوگوں کی دلچسپی اس ریس میں بہت کم ہوتی ہوگی۔''

وہ بولا ''نہیں اب ایسی بات بھی نہیں۔ اُمید پر دنیا قائم ہے۔ پچھلے تین چار سال سے پبلک کالج کا ایک لڑکا تیمور شیکھر کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا ہے۔ ایک دفعہ تو وہ ریس جیتتے جیتتے رہ گیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس بار وہ کوئی کارنامہ دکھا جائے۔ اس کے علاوہ ایک اور ارائیں لڑکا گوبند سنگھ بھی بڑا اچھا بھاگتا ہے۔ سنا ہے وہ بڑے زور پر ہے...... دیکھیں جی! اصل نتیجہ تو ریس والے دن ہی نکلے گا۔''

مجھے ریس سے یا اُس کے نتیجے سے بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ میں نے اس کے بعد بلال شاہ سے اس معاملے پر کوئی بات نہیں کی۔ ویسے اُڑتی اُڑتی باتیں میرے کانوں میں پڑتی رہیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ عام لوگ اس ریس میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں اور بعض شوقین شرطیں وغیرہ لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔

ریس والے دن بھی میں اپنے تھانے میں ہی موجود تھا۔ بلال شاہ بارہ بجے کے قریب تھانے آیا۔ اُس کی صورتِ حال دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ اُس کا پسندیدہ کھلاڑی دوڑ نہیں

جیت سکا۔ پسندیدہ کھلاڑی وہی تیمور نام کا لڑکا تھا۔ بلال شاہ ان چار ہفتوں میں اُس کا زبردست پرستار ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مسلمان تھا۔ دوسرے غریب بھی تھا اور اپنے غریبی دعوے کے ساتھ سرداروں کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''ہاں بھئی بلال شاہ! کیا خبر ہے؟''

وہ بولا۔ ''وہی جو پچھلے تین چار سالوں سے ہے۔ سرداروں کا لڑکا جیت گیا ہے۔''

''اور وہ تمہارا ہیرو تیمور؟''

اُس کا تو جی کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہے اُسے۔ انیسویں بیسویں نمبر پر آیا ہے۔ ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے اُس نے تو۔''

بلال شاہ اور اُس کے ساتھ ریس دیکھ کر آنے والا ایک سپاہی کافی دیر مایوسی کا اظہار کرتے رہے۔ انہیں اپنے اتھلیٹ کی ہار کا دُکھ بھی تھا اور اُس کی کارکردگی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ اچانک بلال شاہ کو کچھ یاد آیا۔ کہنے لگا۔

''ایک کام خراب ہوا ہے خان صاحب! ایک لڑکا گم ہو گیا ہے دوڑ میں۔ پتہ ہی نہیں چلا کدھر گیا ہے؟''

''کون لڑکا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی گوبند سنگھ جی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں اُس کے بارے میں۔ کافی اچھا دوڑنے والا تھا وہ بھی۔ اُس نے سب کے ساتھ ہی دوڑ شروع کی تھی۔ آدھی دوڑ میں وہ ساتھ رہا ہے۔ پھر کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ کئی لڑکے اب اُسے ڈھونڈنے نکلے ہوئے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک وہ نہ ملا تو میرا خیال ہے اُس کے والی وارث تھانے پہنچ جائیں گے۔''

ابھی بلال شاہ کی بات منہ ہی میں تھی کہ تھانے کے سامنے کار رُکنے کی آواز آئی اور پھر تین چار افراد گیٹ سے گزر کر اندر آ گئے۔ اُن میں کنگ کالج کے ایک پروفیسر کو میں جانتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا اور دو جوشیلے سے لڑکے تھے۔ یہ ہیرو ٹائپ لڑکے بھی کنگ کالج کے ہی تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر بلال شاہ فوراً بولا۔ ''لو جی آ گئے گوبند سنگھ کے والی وارث۔''

سلام دُعا کے بعد وہ لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کنگ کالج کے پروفیسر راجیو رائے نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! ہمارے کالج کا لڑکا گم ہو گیا ہے اور کوشش کے باوجود نہیں ملا۔ آپ کو پتہ ہو گا آج صبح دوڑ تھی......''

''ہاں مجھے پتہ ہے۔'' میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ اصل بات

بتائیں۔''

وہ بولا۔ ''اصل بات یہی ہے جی کہ آدھی دوڑ کے بعد سندر گاؤں کے آس پاس گوبند کہیں گم ہو گیا ہے اور ہمیں پورا وشواس ہے کہ اُسے گم کیا گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پروفیسر صاحب! میری اطلاع کے مطابق آپ کی دوڑ ختم ہوئے ابھی صرف دو گھنٹے ہوئے ہیں۔ اتنے تھوڑے وقت میں آپ اس نتیجے پر کیسے پہنچ گئے کہ لڑکے کو گم کیا گیا ہے اور اُسے ڈھونڈنے کے لیے پولیس کی مدد لینا ضروری ہے...... میرا مطلب ہے کسی پر شک ہے آپ کو؟''

''شک نہیں جی پورا وشواس ہے۔'' لڑکے کے والد رنجیت سنگھ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''گوبند کو ماسٹر کے لڑکے تیمور نے مارا ہے، یا کسی سے مروا کر اور زخمی کر کے کہیں پھینک دیا ہے۔ وہ کتے کا بچہ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ میرے بیٹے کے گلے پڑ چکا ہے...... بڑا زہریلا ہے وہ۔ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ سب لوگوں نے بتایا ہے کہ آدھی دوڑ میں وہ اور گوبند سنگھ سب سے آگے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ سندر گاؤں کے پاس بھی درجنوں لوگوں نے انہیں ساتھ ساتھ دوڑتے دیکھا ہے۔ اُس وقت سردار صاحب کا بیٹا سردار شیکھر کوئی ایک فرلانگ پیچھے تھا۔ لیکن ٹیکرا گلی کے قریب کھڑے لوگوں نے سردار شیکھر کو سب سے آگے دیکھا ہے۔ اُس وقت نہ گوبند شیکھر کے آس پاس تھا اور نہ وہ کتے کا بچہ تیمور۔ بعد میں تیمور انیسویں نمبر پر کالج گراؤنڈ میں پہنچا ہے۔ ہمیں ایک سو ایک فیصد یقین ہے جی کہ گوبند کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اُس میں تیمور کا ہاتھ ہے، بلکہ اُس نے خود کیا ہے سب کچھ۔''

ایک ساتھ مقابلے میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں میں اکثر چپقلش ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے پر بھی اتر آتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی واقعہ ہو۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ قریباً 18 میل لمبی ریس تھی۔ اور سارے راستے میں خطرناک پہاڑی موڑ، تنگ گھاٹیاں اور چھوٹے چھوٹے پُل تھے۔ اس راستے پر دوڑتے دوڑتے اپنے کسی ساتھی کو دھکا دے کر موت کے گڑھے میں پھینک دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بہرحال میرا ذاتی خیال تھا کہ گوبند کے گھر والوں کو اتنی جلدی کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔

میں نے کنگ کالج کے پروفیسر سے پوچھا۔ ''آپ کہتے ہیں کہ لڑکے کی گمشدگی میں تیمور کا ہاتھ ہے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''وجہ یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ دوڑ تو ہمیشہ
ہی جیتتا تھا لیکن وہ دونوں دوسرے تیسرے نمبر پر رہتے تھے۔ اس وجہ سے اُن میں کھینچا
بھی تھی۔ یہ کھینچا تانی اُس وقت اور بڑھ گئی جب گوبند نے تیمور کو کنگ کالج کی ایک لڑکی
ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھا۔ پبلک کالج کے لوفر عموماً کنگ کالج کی لڑکیوں کو تنگ کر
رہتے ہیں لیکن یہ ہمت کبھی کسی کو نہیں ہوئی تھی کہ یوں لڑکی کو چھاپ کر لے جائے۔ ا
معاملے پر کافی لے دے ہوئی تھی اور تیمور کو اُس کے کالج سے نکال بھی دیا گیا تھا۔ بعد
ماسٹر حیات نے منت سماجت کر کے بیٹے کو معافی دلائی تھی۔''

میں نے گوبند کے والد اور پروفیسر کے تمام الزامات دھیان سے سنے اور انھ
چائے وغیرہ پلائی۔ اس دوران چند اور لڑکے ہانپتے کانپتے ہوئے تھانے پہنچ گئے اور انھو
نے بتایا کہ گوبند کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ دوسری طرف تیمور بھی اپنے گھر سے غائب
گیا ہے۔ یہ معاملہ اب قدرے سنگین ہو گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر اپنے اے ایس آئ
دو سپاہی دے کر بھیجا اور اُسے کہا کہ وہ تیمور کو تھانے لائے۔ کنگ کالج کے نئے آنے وا
لڑکوں نے بتایا کہ ٹیکرا گلی سے قریباً دو فرلانگ پیچھے سڑک کے ساتھ ڈھلوان پر خون
دھبے ملے ہیں اور فلیٹ بوٹوں کے نشان بھی ہیں۔ یہ بے حد اہم اطلاع تھی۔ گوبند کے با
کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ ہذیانی انداز میں بولنے لگا۔ ''اُس خونی نے میرے بیٹے کی ہتھیا
دی ہے۔ اُس نے مار دیا ہے اُسے۔ واہگرو یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا۔ میں کیا منہ دکھاؤں
گوبند کی ماں کو......'' وہ مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ بدفال منہ سے
نکالے۔ کچھ نہیں ہوگا اُس کے بیٹے کو۔ ہم ابھی اُسے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

جیپ پر سوار ہو کر ہم ٹیکرا گلی روانہ ہوئے۔ دو کاروں پر سوار کنگ کالج کے لڑکے
ہمارے ساتھ تھے۔ وہ سب کے سب غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ اُن کے تیور دیکھ کر
نے فیصلہ کر لیا کہ گوبند نہ ملا تو تیمور کو فوراً گرفتار کر لوں گا۔ ایسے موقعے پر اگر ملزم کو گرفتار نہ
جائے تو خود اُس کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ٹیکرا گلی تین میل کے فاصلے پر تھی۔
کنگ کالج کی گراؤنڈ کے سامنے سے ہو کر گزرے۔ وہاں لڑکوں کا ہجوم تھا اور وہ ٹولیو
میں کھڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کنگ کالج سے ٹیکرا گلی کا فاصلہ قریباً ڈھائی میل تھ
اس کا مطلب تھا گوبند دوڑ کے آخری مرحلے میں غائب ہوا ہے۔

ٹیکرا گلی کے بازار سے دو ڈھائی فرلانگ آگے نکل کر ہم نے گاڑیاں سڑک
کنارے روک دیں۔ ایک طرف بلند و بالا پہاڑ تھا۔ دوسری طرف سینکڑوں فٹ گہری کھ

تھی۔ بڑا خطرناک موڑ تھا۔ رات بارش ہوئی تھی اور اب بھی ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔
سڑک گیلی تھی اور بالکل سیاہ نظر آ رہی تھی۔ سبزہ بھی دُھل دھلا کر اپنے اصل رنگ رُوپ میں
چمک رہا تھا۔ دُور نیچے دریا کا سفید پانی دکھائی دے رہا تھا۔ ہم سنبھل سنبھل کر کھڈ میں
اترے اور کوئی سو فٹ نیچے چیڑ اور دیودار کے گھنے درختوں میں پہنچ گئے۔ یہاں جگہ ذرا
ہموار تھی لیکن اس سے آگے کھڈ ایک دم عمودی ہو گئی تھی اور وہاں کھڑے ہو کر کوئی پتھر گرایا
جاتا تو وہ کہیں ٹکرائے بغیر سیدھا دریا میں جا گرتا۔ دیودار کے درختوں کے درمیان ایک جگہ
چھوٹے چھوٹے پتھر رکھ کر کیاری سی بنا دی گئی تھی۔ یہ کیاری کنگ کالج کے لڑکوں نے بنائی
تھی۔ کیاری کے درمیان خون کے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ کیاری کے آس پاس تھوڑی
سی کچی زمین تھی۔ وہاں مجھے فلیٹ بوٹ کے نشان صاف نظر آئے۔ صورتِ حال واقعی سنگین
تھی۔ دوڑنے والوں میں سے ایک یا دو لڑکے یقیناً اُس ڈھلوان پر پہنچے تھے اور اُن میں
سے کوئی شدید زخمی بھی ہوا تھا۔ زخمی ہونے کے بعد وہ کہاں گیا؟ اس سوال کے یوں تو کئی
جواب تھے لیکن ایک جواب شور مچاتا، اُچھلتا کودتا دریا بھی دے رہا تھا۔ کسی کو مار کر ٹھکانے
لگانے کے لیے یہ جگہ موزوں ترین تھی۔ دریا کی گزرگاہ یہاں سے بہت تنگ تھی اس لیے
پانی گہرا ہو گیا تھا۔ ایک دو تو کیا درجنوں لاشیں پھینک دی جاتیں تو پانی اُن کا نام و نشان مٹا
دیتا۔ اچھا ہوا تھا کہ گوبند کا باپ ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ وہ اس خطرناک مقام پر خون
کے یہ دھبے دیکھ لیتا تو یقیناً بے ہوش ہو جاتا۔

میں نے فوری طور پر جگہ کا نقشہ تیار کروایا اور اپنے ساتھ آنے والے عملے کو گمشدہ
لڑکے کی تلاش پر لگا دیا۔ دریا میں ڈھونڈنا بالکل فضول تھا۔ یہاں پانی کا بہاؤ تیز تھا اور اگر
وہ دریا میں گرا تھا تو اس کی لاش اب تک کئی میل آگے جا چکی تھی۔ میرے عملے کے ساتھ
کنگ کالج کے لڑکے بھی تلاش میں شریک ہو گئے۔ ایک ایک جھاڑی ایک ایک کونہ دیکھا
جانے لگا۔ مجھے جائے واردات پر عجیب طرح کا شبہ ہو رہا تھا۔ ایک جگہ مجھے شیشے کی کرچیاں
بکھری نظر آئیں۔ ایک جگہ پلاسٹک کا ایک ناقابل شناخت ٹکڑا پڑا تھا، یوں لگتا تھا کسی گاڑی
کا ٹوٹا ہوا بمپر ہو۔ پھر مجھے ایک گول شیشہ دکھائی دیا۔ یہ کسی دستی گھڑی کا تھا۔ سائز سے
اندازہ ہوتا تھا کہ یہ زنانہ گھڑی کا شیشہ ہے۔ میں نے شیشہ صاف کر کے جیب میں رکھ لیا۔
تھوڑی دیر بعد میرا اے ایس آئی پلاسٹک کا ایک اور لمبوترا ٹکڑا لے آیا۔ یہ بھی کیچڑ میں لتھڑا
ہوا تھا۔ ان اشیاء کو دیکھ کر یہ شبہ ہو رہا تھا کہ شاید سڑک سے پھسلنے کے بعد کوئی گاڑی یہاں
گری ہے اور گرنے کے بعد سیدھی دریا میں چلی گئی ہے۔ یہ ایک خوفناک تصور تھا لیکن اس

تصور پر یقین کرنا آسان نہیں تھا۔ موقع دیکھ کر صاف اندازہ ہو جاتا تھا کہ سڑک سے لڑھکنے کے بعد کوئی چھوٹی موٹی گاڑی دریا میں نہیں گر سکتی۔ وجہ وہ تناور درخت تھے جو سڑک اور دریا کے درمیان حائل تھے۔ خدانخواستہ کوئی گاڑی سڑک سے لڑھکتی تو ستر اسی فٹ نیچے آ کر ان درختوں میں رُک جاتی۔ اگر واقعی کوئی گاڑی آج سڑک سے پھسل کر گری تھی تو پھر وہ لازماً ان درختوں میں ہونی چاہیے تھی۔ مگر یہاں کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ان حالات میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ موقعے سے ملنے والی مختلف چیزوں کی حیثیت کوڑے کرکٹ کی ہے اور یہ چیزیں پہلے سے یہاں پڑی ہوئی تھیں۔

دو ڈھائی گھنٹے کی تلاش کے باوجود گوبند کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ نہ کوئی کھیت تھا نہ مکان۔ بس گھنے درخت تھے اور اُن پر شاخ شاخ جھولتے ہوئے بندر۔ ایسی جگہ کسی سے کیا بیان حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ہم موقعے کی "تفصیل" لے کر واپس تھانے آ گئے۔

☆======☆======☆

میرا اے ایس آئی تیمور کو پکڑ لایا تھا۔ میں تھانے پہنچا تو تیمور پریشان چہرے کے ساتھ میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ حراست میں لیتے ہوئے اے ایس آئی نے اُس کی تھوڑی بہت پٹائی بھی کی تھی اُس کا ایک گال سرخ ہو رہا تھا اور گریبان بھی پھٹا ہوا تھا۔ وہ انیس بیس سالہ نوجوان تھا۔ جسم مضبوط، پیشانی چوڑی اور شانے کشادہ تھے۔ معمولی لباس میں بھی وہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا۔ اگر کنگ کالج کی ایک لڑکی اُس پر مرمٹی تھی تو یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

اُس کا پورا نام تیمور احسن تھا۔ وہ ڈلہوزی کی مضافاتی آبادی ست دھارا کا رہنے والا تھا۔ اُس کا والد ٹیلر ماسٹر تھا اور علاقے کے معزز لوگ اُس سے کپڑے سلوانے کے لیے ہفتوں انتظار کرتے تھے۔ تیمور سے تعارف کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ایک بیمار ماں اور تین جوان بہنوں کا بھائی ہے اور اُس پر بہت سی ذمے داریاں ہیں۔ میں نے اس سے کہا "تمہیں گوبند کی گمشدگی کا پتہ ہے؟"

وہ اقرار میں سر ہلا کر بولا۔ "جی ہاں...... ریس کے بعد پتہ چلا تھا کہ وہ مل نہیں رہا۔"

میں نے کہا۔ "اس کی گمشدگی کا الزام تم پر لگایا جا رہا ہے۔"

وہ کہنے لگا۔ "مجھے پتہ چل گیا ہے جی! میں اس لیے گھر سے چلا گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کنگ کالج کے لڑکے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ مجھ پر سراسر جھوٹا الزام لگایا

جا رہا ہے جی۔ مجھے گوبند کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ وہ آدھی ریس تک میرے ساتھ تھا۔ اس کے بعد تین چار اور لڑکے ہمارے ساتھ بھاگنے لگے۔ بعد میں اُس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔"

میں نے کہا۔ "سندر گاؤں تک تم اور گوبند ریس میں سب سے آگے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس دفعہ تمہارے اور شیکھر کے درمیان سخت مقابلہ ہو گا لیکن پھر تم دونوں مقابلے سے باہر ہو گئے۔ تم شاید انیسویں نمبر پر آئے ہو اور گوبند ابھی تک پہنچا ہی نہیں۔"

"میں گوبند کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں جی! مجھے تو اپنا پتہ ہے۔ سندر گاؤں سے آگے دو میل کی چڑھائی ہے۔ اس چڑھائی پر کافی سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جو لڑکے پہلے آہستہ دوڑے ہوتے ہیں وہ اس چڑھائی پر پہنچ کر زیادہ زور لگاتے ہیں اور اُن میں سے کئی "لیڈ" بھی لے جاتے ہیں۔ سردار شیکھر نے بھی اس چڑھائی پر "لیڈ" لی تھی۔ اس مرتبہ میں اس چڑھائی پر اپنا سانس قابو میں نہیں رکھ سکا اور پیچھے رہ گیا۔"

میں نے کہا۔ "تم آنکھوں میں مرچیں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ کوئی عقل کا اندھا ہی تمہاری بات پر یقین کر سکتا ہے۔ تین چار منٹ کی بات ہوتی تو مانی جا سکتی تھی۔ تم پورے تیس منٹ لیٹ پہنچے ہو...... اور اٹھارہ کھلاڑی تم سے آگے نکلے ہیں۔"

وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا۔ اُس کا اصرار تھا کہ وہ ایک دم ہی نڈھال سا ہو گیا تھا اور ٹیکرا گلی تک سر توڑ کوشش کے باوجود اپنی رفتار تیز نہیں کر سکا۔ میں نے گوبند کے گھر سے اُس کے بوٹ منگوائے۔ بوٹوں کے تلووں پر وہی ڈیزائن تھا جس کا کھرا وقوعہ کی کچی زمین سے ملا تھا لیکن اس ثبوت کی بناء پر تیمور کو مجرم قرار دینا مناسب نہیں تھا۔ دوڑ میں شامل درجنوں لڑکوں کے بوٹ اسی ڈیزائن کے ہوں گے۔ میں نے تیمور کو شاملِ تفتیش کر کے حراست میں لے لیا اور...... پھر اگلے روز کورٹ میں پیش کر کے اُس کا سات روزہ ریمانڈ حاصل کر لیا۔ اس کے علاوہ میں نے کنگ کالج اور پبلک کالج کے پرنسپل حضرات سے ملاقات کی اور انہیں وارننگ دی کہ وہ اپنے اپنے لڑکوں کو سنبھال کر رکھیں۔ گمشدہ لڑکے کی وجہ سے کسی طرح کا ہنگامہ کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ مناسب سمجھتے ہیں تو مجھے زیادہ جوشیلے لڑکوں کے ناموں کی لسٹ دے دیں تا کہ امن و امان کی خاطر انہیں ایک دو دن کے لیے پکڑ لیا جائے...... جوشیلے لڑکوں کے نام تو فراہم نہیں کیے گئے لیکن دونوں پرنسپل حضرات نے یقین دلایا کہ گڑبڑ نہیں ہو گی۔

اگلے روز شام کو تیمور کا والد بہت گھبرایا ہوا تھانے پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ محلے کے دو تین معتبر افراد بھی تھے۔ وہ دراصل شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اب آیا تھا تو بیٹے کی گرفتاری کی

اطلاع ملی تھی اور یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ اُسے تھانے میں مارا پیٹا جا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ جوانی میں وہ خود بھی دوڑ میں حصہ لیتا رہا ہے۔ اس زمانے میں سردار شیکھر کا والد یعنی سردار اشوک بھی جوان تھا اور اس اٹھارہ میل کی دوڑ کا چیمپئن سمجھا جاتا تھا۔ ماسٹر حیات محمد سردار اشوک کے اچھے حریفوں میں سے ایک تھا لیکن وہ کبھی سردار کو ہرا نہیں سکا۔ ایک طرح سے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ سردار اشوک کی جگہ شیکھر نے اور ماسٹر حیات کی جگہ تیمور نے لے لی تھی۔ ماسٹر حیات کا والد تو معلوم نہیں اس ''دوڑ دھوپ'' کے حق میں تھا یا نہیں لیکن ماسٹر حیات اپنے بیٹے کو اس شوق سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ سرداروں کے ہوتے ہوئے اس دوڑ میں جیتنا اور انعام حاصل کرنا ممکن ہی نہیں، اور اگر ایسا ممکن ہوا بھی تو معلوم نہیں کب ہو...... اُسے فوری طور پر سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جوان بیٹا اس کا بازو بنے اور اُس کے ساتھ مل کر بہنوں کا بوجھ اٹھائے۔ وہ میری منتیں سماجتیں کرنے لگا۔ ''انسپکٹر صاحب! مجھ پر اتنا ظلم نہ کریں۔ یہ لڑکا جسے آپ نے حوالات میں بند کیا ہے میری ساری زندگی کی پونجی ہے۔ مجھ سے یہ پونجی نہ چھینیں۔ ہم جیتے جی مر جائیں گے۔''

ماسٹر حیات مجھے بھلا آدمی نظر آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ ایک قاتل کا باپ ہے۔ بہرحال اتنی جلدی کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ خاص طور پر یہ بات ذہن میں بہت کھٹکتی تھی کہ تیمور ریس کے دوران کم از کم پندرہ بیس منٹ کے لیے کہیں اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ بہانہ بنا رہا تھا کہ وہ اچانک نڈھال ہو گیا تھا اور اس کی رفتار سُست ہو گئی تھی۔ وہ سراسر جھوٹ بول رہا تھا اور اس جھوٹ کو خود بھی محسوس کر رہا تھا۔

مجھے خون کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ وقوعہ سے خون کا نمونہ حاصل کر کے تجزیے کے لیے لیبارٹری میں بھجوا دیا گیا تھا۔ اتفاق سے ہمیں گوبند کا خون گروپ معلوم ہو گیا تھا۔ لیبارٹری کی رپورٹ تصدیق کر سکتی تھی کہ یہ خون گوبند کا ہے یا نہیں۔ واردات کے چوتھے روز یہ رپورٹ موصول ہو گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق ٹیکرا گلی کے قریب ڈھلوان پر پائے جانے والے خون کے دھبے گوبند کے نہیں تھے۔ یہ بالکل مختلف گروپ کا خون تھا۔

یہ رپورٹ ملنے کے بعد جہاں گوبند کے وارثوں کو کچھ تسلی ہوئی وہاں تیمور کو ضمانت پر رہا کرنے کا جواز بھی پیدا ہو گیا۔ اگلے ہی روز میں نے اُسے ضمانت پر رہا کر دیا...... گوبند کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔ نہ ہی کہیں سے اُس کے بارے میں کوئی اطلاع آئی تھی۔ میں نے خود معلومات اکٹھی کیں۔ اُن سے پتہ چلا کہ گوبند اتنا اچھا اتھلیٹ بھی نہیں تھا جتنا اُس کے حمایتی بتا رہے تھے۔ وہ اس ''کراس کنٹری ریس'' میں اکثر آٹھویں دسویں نمبر پر آیا کرتا

تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ گوبند اور تیمور میں ''ریس'' کی وجہ سے کوئی چپقلش تھی تو یہ بالکل غلط ہو گا۔ گوبند اور تیمور کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ تیمور کا اصل مقابلہ سردار شیکھر سے تھا۔

دو تین ہفتے بعد ایک بار پھر ریس کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ اس مرتبہ یہ ریس پٹھانکوٹ میں ہو رہی تھی۔ وہاں موسم بہار کے انٹر کالجیٹ مقابلے تھے۔ اردگرد کے کئی شہروں کی ٹیمیں حصہ لے رہی تھیں۔ اس ریس میں ایک بار پھر سردار شیکھر، تیمور کے مقابل تھا۔ پچھلے سال اس ریس میں شیکھر دوسرے نمبر پر اور تیمور تیسرے نمبر پر رہا تھا۔ اس سال پہلے نمبر پر آنے والا لڑکا اَن فٹ ہو گیا تھا اس لیے کنگ کالج کو پوری امید تھی کہ شیکھر یہ گولڈ میڈل جیت جائے گا۔ دوسری طرف تیمور بھی پُرامید نظر آ رہا تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے تیاری کر رہا تھا اور اُس کا جوش و خروش دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ پچھلی ریس میں وہ جان بوجھ کر ہار گیا ہے۔ بلال شاہ کی زبانی پتہ چلا کہ کئی اور لوگ بھی یہی بات کہہ رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ تیمور کے ہارنے میں کوئی راز ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تیمور کے لیے علاقے کے لوگوں میں کافی جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ کنگ کالج اور پبلک کالج کا مقابلہ بن چکا تھا۔ کنگ کالج کے حمایتی ظاہر ہے ''ہائی جینٹری'' کے لوگ تھے۔ دوسری طرف پبلک کالج اور تیمور کے چاہنے والے درمیانہ اور غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑی گرماگرمی کا ماحول تھا۔ ایک روز مجھے پتہ چلا کہ تیمور کے والد نے ناراض ہو کر اُسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تیمور بار بار سرداروں سے مقابلہ کرے اور ہار کر ذلیل ہو۔ گھر سے نکل کر تیمور اپنے پرستاروں میں اور مقبول ہو گیا تھا۔ وہ اُسے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ ہر طرح اُس کے ناز اٹھا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کر رہے تھے کہ باپ بیٹے میں صلح ہو جائے...... باپ نے سوچا ہو گا کہ گھر سے نکل کر اور بھوکے پیٹ سڑکوں پر سو کر بیٹے کی عقل ٹھکانے آ جائے گی لیکن نتیجہ بالکل الٹ نکلا۔ آخر باپ بیٹے میں صلح ہو گئی۔

یہ پٹھانکوٹ میں ہونے والی ریس سے چھ یا سات روز پہلے کی بات ہے۔ میں تھانے میں بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا کہ ایک برقعہ پوش عورت بہت گھبرائی ہوئی سی تھانے میں داخل ہوئی۔ اُس نے ٹوپی والا دیسی برقعہ پہن رکھا تھا۔ ایسے برقعوں میں آنکھوں کی جگہ ایک جالی سی ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں چہرہ سب کچھ چھپا رہتا ہے۔ میں یہی سمجھا کہ کوئی ادھیڑ عمر عورت اپنی پریشانی لے کر آئی ہے۔ مگر جب ''عورت'' بولی تو مجھے شدید جھٹکا لگا۔ وہ کھنک دار آواز والی ایک نوعمر لڑکی تھی اور خاصی پڑھی لکھی محسوس ہوتی تھی۔ لرزاں آواز میں

کہنے لگی۔

''انسپکٹر صاحب! پلیز آپ تیمور کو بچالیں۔ میرے بھائی...... میرے بھائی غصے میں بھرے ہوئے اس کی طرف گئے ہیں۔ وہ اُسے قتل کر دیں گے۔''

لڑکی کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں چونک کر رہ گیا۔ مجھے فوراً بلال شاہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ تیمور کا کنگ کالج کی ایک لڑکی سے چکر ہے اور وہ اکثر آپس میں ملتے ہیں۔ بلال شاہ نے لڑکی کا نام انجم بتایا تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

''تم انجم تو نہیں ہو۔'' وہ ذرا ٹھٹکی پھر اقرار میں سر ہلانے لگی۔

''جی ہاں! میرا نام انجم ہے۔ میں کنگ کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں۔ تیمور...... اور میں...... میرا مطلب ہے ہم...... ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اُسے کوئی نقصان پہنچے یا اس کی وجہ سے میرے بھائی مجرم بنیں...... پلیز آپ انہیں لڑنے سے روک لیجیے۔'' وہ بڑے بے باک لہجے میں بات کر رہی تھی۔

معاملہ یقیناً سنگین تھا۔ اگر سنگین نہ ہوتا تو انجم اس طرح تھانے میں بھاگی نہ آتی۔ تھانے اور ہسپتال کا رُخ لوگ اُسی وقت کرتے ہیں جب پانی سر سے گزر چکا ہو۔ میں نے انجم سے تفصیل پوچھی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے دو جڑواں بھائی ہیں۔ وہ دو تین سال سے انگلینڈ میں کاروبار کر رہے ہیں۔ دو ہفتے پہلے وہ واپس آئے ہیں۔ کسی نے تیمور کے خلاف اُن کے کان بھر دیے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے مجھے بری طرح مارا ہے اور اب غصے میں بھرے ہوئے ''ست دھارا'' کی طرف چلے گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے وہ تیمور کو بھی بری طرح ماریں گے......'' باتوں کے دوران لڑکی نے چہرے سے برقعہ ہٹالیا تھا۔ وہ خاصی بلکہ خطرناک حد تک خوبصورت تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس معاملے کو خود دیکھا جائے۔

تھانے میں جیپ موجود تھی۔ بلال شاہ کو تیمور کے گھر کا پتہ تھا۔ میں نے بلال شاہ کے علاوہ دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور ست دھارا کی طرف روانہ ہو گیا۔ انجم نے بتایا تھا کہ اُس کے بھائیوں کے پاس سرخ مورس کار ہے ایک مقامی غنڈہ ''شاہی'' بھی اُن کے ساتھ ہے۔ ''شاہی'' کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ دنگے فساد اور مار دھاڑ میں اس کا بڑا نام تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ شاہی ''سرداروں'' کا پالتو کتا ہے۔

ست دھارا کی طرف ابھی ہم نے دو تہائی فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک منظر دیکھ کر ہمیں رُکنا پڑا۔ ہمارے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف وادی تھی۔ وادی میں دور نیچے ایک جگہ لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ اردگرد کے مکانوں سے لوگ نکل کر تیزی سے اس ہجوم کی طرف بڑھ

رہے تھے۔ یقیناً کوئی خاص واقعہ ہو گیا تھا۔ ہماری گاڑی دیکھ کر کئی لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں نیچے بلانے لگے۔ ہم نے ایک کانسٹیبل اور ڈرائیور کو گاڑی میں چھوڑا اور خود نیچے اترنے لگے۔ چند افراد نے بتایا کہ ''شاہی'' نے دو لڑکوں کو مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔ وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ ہم تیزی سے ڈھلوان طے کر کے موقعے پر پہنچے۔ میرے سامنے تیمور خون میں لت پت بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے ساتھی لڑکے کو لوگ اٹھا کر چارپائی پر ڈال رہے تھے۔ وہ بھی شدید زخمی تھا۔ اُس کا سر پھٹا ہوا تھا اور پہلو سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے جھک کر تیمور کا معائنہ کیا وہ بظاہر مردہ نظر آتا تھا لیکن سانس چل رہی تھی اور نبض بھی ابھی ڈوبی نہیں تھی۔ اپنے زخمی ساتھی کی طرح تیمور بھی نیکر اور بنیان میں تھا۔ پاؤں میں شوز تھے۔ وہ ساتھی کے ہمراہ مشق کے لیے نکلا ہوا تھا کہ دھر لیا گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقامی لوگ ایک اور چارپائی لے آئے۔ افراتفری میں تیمور کو بھی چارپائی پر ڈالا گیا، جب اُسے چارپائی پر ڈالا جا رہا تھا میری نگاہ اُس کی خون آلود ٹانگ پر پڑی اور میں بری طرح لرز گیا۔ تیمور کی بائیں ٹانگ پنڈلی پر سے ٹوٹی ہوئی تھی اور ایسی بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی کہ ٹوٹ کر نوے درجے کے زاویے پر لٹک گئی تھی...... ہم نے دونوں زخمیوں کو حتی الامکان تیزی سے سڑک تک پہنچایا اور جیپ میں ڈال کر سول ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆======☆======☆

بروقت طبی امداد ملنے سے دونوں لڑکوں کی جان بچ گئی۔ تاہم تیمور کی ٹانگ تقریباً ناکارہ ہوگئی۔ پنڈلی کی دونوں ہڈیاں چکنا چور ہوگئی تھیں۔ شاہی اور انجم کے بھائیوں نے اُسے زمین پر لٹا کر اور باقاعدہ جکڑ کر ٹانگ پر بندوق کے آہنی کندے سے ضربیں لگائی تھیں۔ ڈاکٹروں نے ایک بڑے آپریشن کے بعد ہڈیاں جوڑ کر پلاستر چڑھا دیا اور زخموں پر ٹانکے لگا دیے۔ تیمور کے ساتھی پر تلوار سے وار کیا گیا تھا۔ اس کے پہلو پر گہرا زخم آیا تھا اور بہت سا خون راستے میں ضائع ہوگیا تھا۔ قسمت اچھی تھی جو وہ بچ گیا۔ اُسے بلال شاہ نے خون دیا تھا۔ شاید اس کے بچ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُسے ''بلال شاہ'' کا خون لگا تھا..... ادھ رڑکوں اور دودھ جلیبیوں سے بنا ہوا خون تھا۔ کچھ نہ کچھ تو کرامات دکھانی تھیں اس نے۔ ہاں اس خون سے محروم ہوکر بلال شاہ کی حالت بہت پتلی ہوگئی تھی۔ صرف ایک بوتل خون دیا تھا اس نے مگر یوں لگتا تھا کہ ایک بوتل خون کے علاوہ باقی سارا اس میں سے نکال لیا گیا ہے۔

اس واردات کے سلسلے میں کوئی بھی گواہی دینے کو تیار نہیں تھا۔ ''شاہی'' سے ٹکر لینے کی ہمت بھلا کون کر سکتا تھا۔ شاہی ایک کشمیری ڈوگرا تھا۔ سنا تھا فوج سے بھاگا ہوا ہے۔ اُس کے پاس رائفل کے علاوہ ہر وقت ایک تلوار بھی رہتی تھی۔ مشہور تھا کہ بڑا زبردست تلوار زن ہے اور چار چار تلوار بازوں سے بیک وقت مقابلہ کرتا ہے۔ وہ سردار اشوک کا ملازم تھا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ چشم دید گواہ ہونے کا دعویٰ کرتا حالانکہ درجنوں لوگوں نے یہ خونی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے جو تفصیلات معلوم ہوئیں (یعنی جو کچھ تیمور اور اس کے ساتھی نے بتایا) اُن سے پتہ چلا کہ انجم کے بھائی شاہی کے ساتھ پہلے تیمور کے گھر گئے تھے۔ وہاں سے انہیں پتہ چلا کہ تیمور ''دوڑ کے لباس'' میں ''صدر'' کی طرف گیا ہے۔ وہ واپس چل دیے۔ انہیں معلوم تھا کہ تیمور کسی بھی راستے سے جائے ست دھارا نالے کے پُل پر سے ضرور گزرے گا۔ انہوں نے اپنی سرخ گاڑی اوپر سڑک پر کھڑی کی

اور پُل کے قریب کنو کے درختوں میں منڈلانے لگے۔ جونہی تیمور اور اُس کا ساتھی انعام خاں پُل پر نمودار ہوئے انہوں نے تیمور کو دبوچ لیا۔ انہوں نے اُسے غلیظ گالیاں دیں اور بری طرح مارنے لگے۔ انعام خاں نے دوست کو بچانے کی کوشش کی تو اُسے بھی تھپڑ مارے گئے اور بھاگ جانے کا مشورہ دیا گیا لیکن جب وہ ڈٹ گیا تو شاہی نے طیش میں آکر اُسے تلوار گھونپ دی اور لات مار کر نشیب میں پھینک دیا۔ تیمور کو انجم کے بھائیوں نے نیچے گرا کر دبوچ لیا اور شاہی نے بندوق کے وزنی کندے سے پے در پے ضربیں لگا کر اُس کی ٹانگ توڑ دی۔ وہ بیچارا بری طرح چیختا چلاتا رہا لیکن کوئی اُس کی مدد کو نہیں آیا۔ یہاں تک کہ زخموں کی تاب نہ لا کر وہ بے ہوش ہوگیا۔ بے ہوشی کے بعد بھی وہ اُسے مارتے رہے۔ غالباً اُن کا ارادہ اُسے جان سے مار دینے کا تھا۔

انجم اور مضروبین کے بیان کے بعد ضروری تھا کہ میں انجم کے بھائیوں اور شاہی کو گرفتار کرلوں۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ وہ تینوں اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کرا چکے تھے۔

کھلاڑی جسمانی طور پر معذور ہو جائے تو اس کی دُنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ تیمور کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اُس کے تمام خواب اُس کی پنڈلی کے ساتھ ہی چکنا چور ہوگئے۔ کچھ روز پہلے وہ لوگوں کے کندھوں پر سوار تھا اور اُس کی آنکھوں میں کامرانی کے سپنے سجے ہوئے تھے اب وہ ایک پر کٹے پرندے کی طرح نامرادی کی تپتی ریت پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ ''انٹر کالجیٹ ریس'' تیمور کے بغیر ہی منعقد ہوئی اور ظاہر ہے اس کا فاتح شیکھر ہی تھا۔

میں ''شاہی'' اور انجم کے بھائیوں کو پکڑنا چاہتا تھا لیکن یہ بات بھی مجھے معلوم تھی کہ جب تک سرداروں کی مرضی نہ ہوگی میں اُن پر ہاتھ نہ ڈال سکوں گا۔ سردار اشوک رائے کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی غیر قانونی فعل میں ملوث نہیں ہونے دیتا..... حالانکہ سردار اشوک کے ملازم شاہی نے تیمور کو مارا تھا اس کے باوجود اکثر لوگ سردار اشوک کو اس معاملے میں ملوث نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ شاہی کا ذاتی فعل ہے۔ اس نے انجم کے بھائیوں سے رقم وغیرہ لے کر یہ کام کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس بارے میں سردار اشوک سے ملاقات کرنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حد تک قانون پسند شخص ہے۔ ایک روز میں سادہ لباس میں سرداروں کی شاندار رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ بہت بڑے آہنی گیٹ کے سامنے مسلح چوکیدار نے میرا استقبال کیا۔ اپنے مالک کی طرح وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس نے اندر اطلاع پہنچائی اور تھوڑی ہی دیر بعد میں سردار اشوک رائے کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں اشوک رائے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اشوک رائے ہمیشہ سفید لباس

پہنتا تھا جیسا کہ میں نے بتایا ہے انگریز افسروں جیسی رعب دار شخصیت تھی۔ سردار کے عقب میں کارنس پر کئی چھوٹی بڑی ٹرافیاں اور تصویریں آویزاں تھیں۔ اس قسم کی ٹرافیاں اور فریم شدہ فوٹو گراف پورے ڈرائنگ روم میں نظر آ رہے تھے۔ یہ پچھلے تیس چالیس برسوں کی تاریخ تھی اور اس تاریخ سے پتہ چلتا تھا کہ سرداروں کی فیملی ہمیشہ ہونہار اتھلیٹ پیدا کرتی رہی ہے۔

رسمی گفتگو کے بعد میں نے شاہی کا ذکر چھیڑا اور بتایا کہ اُس نے گرفتاری سے بچنے کے لیے ضمانت قبل از گرفتاری کرا رکھی ہے جسے میں عدالت سے منسوخ کرانا چاہتا ہوں۔

سردار اشوک نے کہا۔ ''مجھے معلوم تھا تم مجھ سے اس سلسلے میں ملو گے۔ ضمانت قبل از گرفتاری کرانا آج کل آسان نہیں ہے اور یقیناً تمہارا خیال ہوگا کہ یہ ضمانت میں نے کروائی ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس معاملے میں پڑا ہوں اور نہ پڑوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''سردار صاحب! مجھے معلوم ہے آپ کسی مجرم کی پشت پناہی نہیں کر سکتے یہی وجہ ہے کہ میں نے آپ سے یوں کھل کر بات کی ہے۔''

وہ بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ شک کر رہے ہوں۔ تیمور میرے بیٹے کا حریف ہے اور ہر دوڑ میں اُن دونوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے ذہن میں آ سکتا ہے کہ میں نے تیمور کو مقابلوں سے خارج کرنے کے لیے اُس کی ٹانگ تڑوا دی ہے۔ تم اس معاملے کی کھل کر تحقیق کرو اور شاہی سمیت کسی بھی شخص سے رعایت نہ کرو۔ جو بھی سچ ہے وہ سامنے آ جائے گا۔''

سردار اشوک رائے سے مل کر میرا ذہن صاف ہو گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ شاہی کو ضرور گرفتار کروں گا۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک دو بار من مانی کر چکا تھا اور لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ وہ کسی تھانے کچہری کو نہیں مانتا۔ اُس کے لیے سب کچھ سردار اشوک رائے ہے۔

لڑکوں کو زخمی کرنے کے بعد انجم کے جڑواں بھائی تو کہیں غائب ہو چکے تھے تاہم شاہی ڈلہوزی میں دندناتا پھرتا تھا۔ میں نے اُسے گرفتار کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ گرفتاری کے لیے اس کی ضمانت منسوخ کرانا ضروری تھی۔ میں عدالت سے رجوع کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ صورت حال اچانک تبدیل ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ فریقین میں صلح ہو گئی ہے۔ تیمور اور انعام کے وارثوں نے ملزموں کو معاف کر دیا ہے۔ بدلے میں لڑکوں کے علاج معالجے کے لیے اُن کے والدین کو بھاری رقم دے دی گئی ہے۔ دونوں لڑکے غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ایسے گھرانے اپنی ضرورتوں کے غلام ہوتے ہیں۔ اُن کی مجبوری کو

سامنے رکھتے ہوئے انجم کے گھر والوں نے دولت کا سہارا لیا تھا اور یہ معاملہ رفع دفع کرا دیا تھا۔ انجم کے بھائی تو پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔ اب انجم کو بھی ڈلہوزی سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ جسمانی ضرر کا کیس تھا اور قابل راضی نامہ نہیں تھا۔ میں چاہتا تو اب بھی قانونی کارروائی کر سکتا تھا مگر جب مدعی ہی سُست پڑ گئے تھے تو کیس سے جان نہ نکلتی تو کیا ہوتا۔

پندرہ بیس روز ہسپتال میں رہنے کے بعد تیمور واپس ڈلہوزی کی پرانی آبادی میں اپنے گھر آ گیا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا ''تیمور'' تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بیساکھیاں تھیں اور چہرے پر ہمیشہ کی شکست لکھی ہوئی تھی...... پھر ایک روز مجھے بلال شاہ کی زبانی پتہ چلا کہ تیمور نشہ کرنے لگا ہے اور باپ سے اس کا جھگڑا ہوا ہے...... اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً تیمور کی بے راہروی اور گھر والوں سے اس کے لڑائی جھگڑے کی خبریں ملتی رہیں۔ آخر ایک دن یہ خبر ملی کہ باپ نے اُسے گھر سے نکال دیا ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی اُسے گھر سے نکالا گیا تھا مگر اُس وقت حالات مختلف تھے۔ اُس کے پرستاروں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اُسے مقابلے کے لیے تیار کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ اب وہ ایک بدنصیب نوجوان تھا جس کے سامنے تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور تاریکی میں تو اپنا سایہ بھی چھوڑ جاتا ہے۔ تیمور کے چاہنے والے بھی ایک ایک کر کے پیچھے ہٹ چکے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ اس کی بڑھتی ہوئی بے راہروی دیکھ کر دور ہو گئے تھے۔ تیمور اب ایک بالکل بدلا ہوا لڑکا تھا۔ ایک روز تھانے سے کسی کام کے لیے ''ست دھارا'' جاتے ہوئے، میں نے اُسے ایک بازار میں دیکھا۔ وہ ایک دکان کے تھڑے کے نیچے اوندھا پڑا تھا۔ لباس کی جگہ جسم پر چیتھڑے تھے اور منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ شاید میں تو اُسے پہچان بھی نہ پاتا۔ میرے ایک کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ یہ ماسٹر حیات کا لڑکا تیمور ہے۔ میری نگاہوں میں پانچ چھ ماہ پہلے کا وہ صحت مند اتھلیٹ گھوم گیا جو معمولی سے لباس میں بھی ہیرے کی طرح چمک رہا تھا اور بڑی شان سے میرے دفتر میں کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جیسے حوالاتی نہ ہو کوئی فلمی ہیرو ہو۔ آج وہ گندی نالی کے کنارے ایک حقیر کیڑے کی طرح پڑا تھا۔ اُس کی حالت پر مجھے ترس آیا۔ میں اُس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن ایک بات کا مجھے پورا یقین تھا۔ وہ ارادے کا بہت مضبوط لڑکا تھا۔ یہ اُس کے ارادے کی مضبوطی ہی تھی کہ شیکھر سے مسلسل ہارنے کے باوجود اُس نے ہمت نہیں ہاری تھی اور ٹانگ سے معذور ہونے تک اُس کے مقابلے میں ڈٹا رہا تھا۔ اُس کے ارادے کی مضبوطی کا دوسرا ثبوت مجھے گوبند کی گمشدگی والے معاملے میں ملا تھا۔ میں نے تیمور کو کئی روز حوالات میں رکھا تھا اور اُس سے

معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ ریس کے دوران وہ پندرہ بیس منٹ کے لیے اوجھل کیوں ہو گیا تھا۔ میری انتہائی کوشش کے باوجود تیمور نے زبان کا تالا نہیں کھولا تھا حالانکہ مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بہتری کے لیے نہیں، کسی دوسرے کی بہتری کے لیے خاموش ہے۔ حوالات میں پوچھ گچھ کے دوران بہت کم ملزم اتنی مضبوطی سے اپنے ارادے پر قائم رہ سکتے ہیں...... اب وہی مضبوط ارادے والا نوجوان حالات کی تیز ہوا میں راکھ کے ڈھیر کی طرح دکھائی دے رہا تھا...... میں اور میرا کانسٹیبل ایک جانب کھڑے تیمور کا جائزہ لے رہے تھے کہ ایک تیز شور کے ساتھ دو گاڑیاں بازار میں داخل ہوئیں۔ یہ بغیر چھت کے کاریں تھیں۔ کوئی پندرہ بیس لڑکے لڑکیاں ان پر لدے ہوئے تھے۔ یہ سب کنگ کالج کے طلبا تھے۔ وہ اکثر اسی طرح ڈلہوزی کی سڑکوں پر ہلا گلا کرتے رہتے تھے۔ دونوں کاریں تیمور کے قریب آکر اچانک رُک گئیں۔ اگلی کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر انیس بیس سالہ سردار شیکھر بیٹھا تھا۔ اُس کے گلے میں سونے کا لاکٹ تھا۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا اور گھونگھریالے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ انجم تھی۔ ایک دفعہ تھانے میں میری اس سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ ٹوپی والا برقعہ پہن کر آئی تھی اور میں صرف اُس کا چہرہ ہی دیکھ سکا تھا۔ اب وہ سرتاپا نظر آ رہی تھی۔ لمبے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ دوپٹہ رسی کی طرح گلے سے لپٹا ہوا تھا اور جرسی کی آستینیں کہنیوں سے اوپر تک اڑسی ہوئی تھیں۔ میں اور کانسٹیبل تیمور سے کافی دور کھڑے تھے اور ویسے بھی ایک سائیڈ پر تھے۔ کار سواروں میں سے کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑ سکی۔ وہ کچھ دیر تیمور کے قریب رُک کر ہارن بجاتے اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔ پھر سڑک پر ٹائروں کے نشان چھوڑتے اور گاڑیاں لہراتے ہوئے آگے نکل گئے۔

یہ منظر مجھے سوچنے کی دعوت دے رہا تھا۔ کنگ کالج کے لڑکوں لڑکیوں کا تیمور سے ٹھٹھا کرنا تو سمجھ میں آتا تھا مگر تیمور کی محبوبہ کا سردار شیکھر کے پہلو میں پایا جانا حیران کُن تھا۔ یہ انجم ہی تھی جس کی وجہ سے تیمور اس حال کو پہنچا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ اُس کے زخموں پر مرہم رکھتی اور اس پر ہونے والی زیادتی کی تلافی کا سوچتی وہ سردار شیکھر کے پہلو میں بیٹھ کر اُس کا تماشا بنتے دیکھ رہی تھی۔ وہ کالج کی عام جذباتی لڑکیوں کی طرح بے وفائی پر اُتر آئی تھی یا پھر یہ کوئی اور معاملہ تھا؟ میں نے سوچا کہ تیمور کے دوست انعام خاں سے اس بارے میں پوچھنا چاہیے۔ یہ وہی انعام خاں تھا جو تیمور کے ساتھ زخمی ہوا تھا۔ اب وہ صحت یاب ہو کر گھر آ چکا تھا۔ وہ تیمور کے بہت قریب رہا تھا لہٰذا اُس سے مل کر ''انجم'' والی اُلجھن دور ہو

سکتی تھی۔

میں نے اُسی روز شام کے بعد اُسے تھانے بلا لیا۔ میں ایک دو گھنٹے کے لیے فارغ تھا اس لیے انعام خاں سے اطمینان کے ساتھ گفتگو ہو سکتی تھی۔ میں نے اُسے سات بجے تھانے بلایا تھا۔ وہ پورے سات بجے ہی پہنچ گیا۔

میں نے کہا۔ ''بھئی! وقت کے بہت پابند ہو تم۔''

بلال شاہ قریب ہی بیٹھا تھا۔ فوراً ''چہکا'' ''آخر خون کس کا ہے جناب۔''

میں نے کہا۔ ''اگر خون کی بات ہوتی تو یہ آٹھ بجے سے پہلے نہ پہنچتا اور آتے ساتھ ہی ایک سو ایک بہانے بنا دیتا کہ اتنی دیر کیوں ہوئی ہے۔''

انعام خاں مسکرا کر بولا۔ ''آپ کچھ بھی کہیں جناب! میں تو دل و جان سے شاہ صاحب کا احسان مند ہوں۔ انہوں نے خود بیمار ہونے کے باوجود مجھے خون دیا۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم سے کس نے کہا ہے کہ یہ بیمار تھا۔''

وہ بولا۔ ''میں اُس وقت نیم بے ہوش تھا۔ شاہ صاحب کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ یہ کہہ رہے تھے کہ مجھے تین چار روز سے بخار ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس نے تو اور بھی کئی بہانے بنائے تھے۔ بہرحال اس بات کو چھوڑو۔ اب کیا حال ہے؟''

میں نے جملے کا پہلا حصہ بڑی آہستگی سے ادا کیا تھا لہٰذا بلال شاہ کو کچھ سنائی نہیں دیا (اُس کے ایک کان کی سماعت بہت کمزوری تھی) اگر وہ سن لیتا تو وہیں پانی پت کا میدان لگ جانا تھا۔ پھر بھی بھنک تو اُس کی پڑ ہی گئی تھی۔ وہ تنک کر بولا۔

''خان صاحب! کیا کہا ہے جی پہلے آپ نے؟''

''تمہاری بات نہیں کی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم جاؤ سنتری سے چائے کا کہہ دو۔''

''چائے...... چائے میرے لیے تو نہ منگوائیں جناب!'' انعام خاں نے عاجزی سے کہا۔ ''ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔''

بلال شاہ اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھ لو شاہ جی! اگر تمہارے خون کا اثر ہوتا تو یہ چائے سے انکار کرتا؟ جان پر بھی کھیلنا پڑتا تو کھیلتا لیکن چائے ضرور پیتا۔''

بلال شاہ نے منہ بنایا اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ تنہائی میں انعام

خاں سے کھل کر بات ہو سکے۔ میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

''تیمور کو تم کب سے جانتے ہو؟''

''بچپن سے جناب! ہم پرائمری سکول، ہائی سکول اور کالج میں ایک ساتھ رہے ہیں۔''

''تمہارے خیال میں وہ کیسا لڑکا ہے؟''

''وہ میرا دوست ہے جناب! مجھے اُس کی تعریف ہی کرنی چاہیے لیکن میں جو تعریف کر رہا ہوں وہ بالکل غیر جانبداری سے کر رہا ہوں۔ وہ دل کا نیک لڑکا تھا۔ کسی سے دشمنی نہیں رکھتا تھا۔ اگر کسی کی کوئی بات ناپسند ہو تو منہ پر کہہ دیتا تھا۔ اپنی غلطی ہوتی تھی تو معافی مانگ لیتا تھا۔ اُس کے والد صاحب اُسے ہمیشہ سے غیر ذمے دار کہتے رہے ہیں لیکن میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ غیر ذمے دار نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا، گھر میں جوان بہنیں بیٹھی ہیں۔ والدہ بیمار ہے اور گھر کا بوجھ باپ کے بوڑھے کندھوں پر ہے۔ وہ اپنے گھر کے سارے دُکھ جانتا تھا اور انہیں دُور کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی فرق تھا تو وہ سوچ کا تھا۔ باپ کی سوچ یہ تھی کہ بیٹا ملازمت کرے یا دکانداری سنبھالے۔ جبکہ تیمور کے لیے کھیل کا میدان ہی سب کچھ تھا۔ وہ اس میدان میں نام پیدا نہ کرتا اور پیسہ نہ کماتا۔ وہ صرف سالانہ ریس ہی جیت جاتا تو اُن کی بہت سی گھریلو پریشانیاں دُور ہو سکتی تھیں......''

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ''کسی اور کو معلوم نہ ہو تو دوسری بات ہے لیکن تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ریس کیوں نہیں جیتتا۔''

میرے چبھتے لہجے کو محسوس کر کے انعام خاں نے اپنا زخمی پہلو سہلایا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔ میں اس لائق نہیں کہ آپ کے قانونی معاملات میں دخل دوں لیکن ایک بات میں پورے یقین ایمان سے کہہ سکتا ہوں۔ گوبند کے قتل یا اُس کی گمشدگی میں تیمور کا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ ایسا لڑکا نہیں کہ کسی کو نقصان پہنچا سکے...... ہاں آپ کی اس بات سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ سالانہ ریس میں اُس کے ہارنے کی کوئی خاص وجہ ہے۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی جاننے کی بہت کوشش کی ہے مگر وہ اس بارے میں بالکل خاموش رہا ہے، اور اب تو اُسے ویسے ہی چپ لگ چکی ہے۔ نشے نے اُسے اس قابل چھوڑا ہی نہیں کہ وہ کسی سے کوئی ڈھنگ کی بات کر سکے۔''

میں نے کہا۔ ''یعنی تم بھی یہ بات مانتے ہو کہ اُس ریس کے دوران کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔''

''بالکل جناب! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تیمور کو جان بوجھ کر ہرایا گیا ہے، اور ہرایا ہی نہیں گیا ڈرا دھمکا کر اُس کی زبان بھی بند کر دی گئی ہے کہ وہ کسی کے سامنے اپنا رونا نہ رو سکے۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ایک بات بتاؤ اور پوری سچائی سے بتانا۔ انجم سے تیمور کا میل جول کب شروع ہوا تھا؟''

وہ بولا۔ ''یہ دوڈھائی سال پہلے کی بات ہے۔ پہل انجم کی طرف سے ہی ہوئی تھی وہ کنگ کالج میں پڑھتی تھی صاف ظاہر تھا کہ امیر گھرانے کی لڑکی ہے۔ تیمور میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُس سے میل جول بڑھاتا۔ وہ خود ہی اس کوشش میں لگی رہی اور آخر کامیاب ہوئی۔ وہ تیمور سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی اور......'' کچھ کہتے کہتے وہ چپ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''پوری بات کرنی چاہیے یا خاموش رہنا چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''میں یہی کہہ رہا تھا کہ وہ تیمور سے بے پناہ محبت کرتی تھی، اب بھی کرتی ہے اور......شاید ہمیشہ کرتی رہے۔''

''لیکن میں نے تو اسے کل اور ہی ڈھنگ میں دیکھا ہے۔''

''کیا مطلب ہے جناب۔''

''مطلب یہ ہے کہ وہ سردار شیکھر کی گاڑی میں اُس کے ساتھ بیٹھی تھی اور کنگ کالج کے لڑکیاں لڑکے ہلا گلا کرتے اُن کے ساتھ جا رہے تھے۔''

انعام خاں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بولا۔ ''جناب! جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ سچ نہیں اور جو سچ ہے وہ نظر نہیں آ رہا۔''

میں نے کہا۔ ''وہی سچ جاننے کے لیے تو میں نے تمہیں بلایا ہے۔''

تھوڑی سی کشمکش اور تھوڑے سے تذبذب کے بعد انعام خاں اس ''سچ'' سے پردہ اٹھانے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس نے انجم اور تیمور کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ مختصر الفاظ میں یوں ہے۔

''چھ ماہ پہلے ہونے والی سالانہ ریس میں ہارنے کے بعد تیمور کافی دل برداشتہ تھا۔ اُس وقت اُسے سہارا دینے والی انجم تھی اور اُس کے وہ تمام پرستار تھے جو کئی برسوں سے اُس کے جیتنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ان میں ''ست دھارا'' کے مکین بھی تھے اور اردگرد کی غریب آبادیوں کے لوگ بھی۔ وہ سب یک جان ہو کر تیمور کی حوصلہ افزائی کرنے لگے اور جب تیمور کے والد نے اُسے گھر سے نکالا تو وہ سراپا احتجاج بن گئے۔ مجبوراً ماسٹر حیات کو

اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ انہی دنوں کی بات ہے ایک روز انجم تیمور سے ملنے کے لیے
دھارا'' آئی۔ وہ دونوں ایک چشمے کے پاس راز و نیاز میں مصروف تھے کہ شیکھر نے
دیکھ لیا۔ درحقیقت وہ انجم کا تعاقب کرتے ہوئے ہی وہاں تک پہنچا تھا۔ انجم اور تیمو
ساتھ دیکھ کر اُس نے تیمور کا مذاق اڑایا اور کہا کہ ایک ہارا ہوا لڑکا کس منہ سے کنگ
سب سے خوبصورت لڑکی کو فتح کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ طعنہ تیر کی مانند تیمور
میں پیوست ہو گیا۔ تیمور اور شیکھر میں تلخ کلامی ہوئی اور شیکھر تیمور کو طنزیہ فقروں
بناتے ہوئے واپس چلا گیا۔ اُس روز تیمور نے انجم کے ساتھ قسم کھالی کہ وہ جب تک
ہرا نہیں لیتا انجم کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ تیمور کی رگوں میں افغان خون تھا۔
قبیلے سے تعلق رکھتا تھا وہاں لوگ وعدہ نبھانے کی خاطر خون کے دریا بہا دیتے ہیں۔
تیمور اپنی قسم پوری کرنے کی قابلیت رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا اس دفعہ وہ شیکھر کو
دے گا۔ مشق کے دوران اٹھارہ میل کی دوڑ میں وہ جو ٹائم لے رہا تھا اُس سے بھی
ہوتا تھا کہ اس دفعہ شیکھر اور تیمور میں بہت کانٹے کا مقابلہ ہوگا لیکن پھر وہ واقعہ ہو گیا
کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ انجم کے بھائی انگلینڈ سے واپس آئے اور آتے ساتھ ہی
نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''شاہی'' سے اُس کی ٹانگ تڑوا دی گئی اور وہ معذ
ہسپتال کے وارڈ میں جالیٹا۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد تیمور کی زندگی ایک نئ
چل نکلی۔ وہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا اور اُس کے سامنے ایک تاریک پستی کے سوا
نہیں تھا۔ باپ نے ایک بار پھر اُسے گھر سے نکال دیا اور وہ اپنے دوست انعام خا
اُس کی بیٹھک میں رہنے لگا۔ دو ماہ پہلے کی بات ہے ایک رات انجم برقعہ پہن کر اُ
ملنے آئی۔ انعام خاں کے ذریعے اُن دونوں کی ملاقات ہوئی۔ انجم تیمور کے پاؤ
پڑی اور رو رو کر اُس سے معافی مانگنے لگی۔ اُس نے کہا، تمہاری بربادی کی ذمے دار
صرف میں ہوں۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ مجھ سے اپنی بربادی کا بدلہ لے لو لیکن
بے رخی اختیار نہ کرو۔ تیمور نے کہا کہ وہ وہاں سے چلی جائے اب اُن کی راہیں جد
ہیں۔ وہ بولی، میں راہیں ملانے کے لیے آئی ہوں۔ تم جیسے اور جس حال میں بھی ہو
و جان سے قبول ہو۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ہم دونوں بالغ ہیں۔ ہم کور
جا کر شادی کریں گے۔ میرے گھر والے مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ایک با
شادی ہو گئی تو پھر انہیں داماد کے طور پر تمہیں قبول کرنا ہی ہوگا۔'' جواب میں تیمور
اب وہ اُس کے قابل نہیں رہا۔ وہ بولی ''تم میرے پیار کی توہین کر رہے ہو۔ یہ

پوچھو کہ تم کس قابل ہو۔ تم ایک ٹرافی نہیں جیت سکے تو کیا ہوا۔ زندگی کی ٹرافی تو تمہارے
پاس ہے۔ ہار جیت کے سینکڑوں میدان ہیں جہاں تم اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکتے ہو۔ اور
تم منواؤ گے بھی۔ آؤ میرا ہاتھ تھام لو۔ ہم کہیں دور نکل جائیں اور نئے عزم کے ساتھ نئی
زندگی شروع کریں۔'' تیمور نے انجم کی کوئی بات نہیں مانی۔ وہ مان بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ ایک
بہت بڑی قسم کھا چکا تھا اور قسموں وعدوں کو توڑنا اُس کی سرشت میں نہیں تھا۔ اُس نے زندگی
میں بہت کم ارادے باندھے تھے لیکن جو بھی باندھے تھے انہیں پورا کیا تھا۔ اب اُسے یہ قسم
بھی نبھانی تھی...... انجم صرف اُسی رات ہی نہیں آئی۔ اُس کے بعد بھی وہ کئی مرتبہ اُس سے
ملتی رہی۔ اُس کی منتیں سماجتیں کرتی رہی لیکن تیمور ٹس سے مس نہیں ہوا۔ دوسری طرف سردار
شیکھر نے عرصے سے انجم پر نگاہ رکھی ہوئی تھی لیکن دو وجوہات تھیں جن کی بناء پر وہ اُس
سے دور تھا۔ ایک تو انجم مسلمان تھی، دوسرے وہ تیمور سے نتھی ہو چکی تھی۔ اب تیمور کے پیچھے
ہٹنے سے شیکھر کے لیے میدان صاف ہو گیا تھا اور وہ آزادانہ انجم پر ڈورے ڈالنے لگا تھا۔
انجم نے بھی ڈورے ڈلوانے کے لیے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے تھے لیکن یہ بات نہیں تھی کہ وہ
شیکھر کی طرف جھک گئی تھی۔ وہ صرف تیمور کو ہوش دلانا چاہتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ شاید
رقابت کا جذبہ اُس کے بجھے ہوئے دل میں محبت کا شعلہ جگا دے۔ وہ شیکھر گروپ کے
لڑکے لڑکیوں کے ساتھ گھومتی تھی اور سینے میں گہرا دکھ چھپا کر ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجائے
ہوئے تھی۔

☆======☆======☆

جس روز انعام خاں سے میری ملاقات ہوئی اور اُس نے مجھے تیمور اور انجم کی پریم
کہانی کے بارے میں بتایا اُس سے دو روز بعد ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ جس دریا نما پہاڑی
نالے کا میں نے ذکر کیا ہے اُس کا پانی ستمبر اکتوبر میں اُتر جاتا تھا۔ اس دفعہ پانی اُترا تو ایک
تباہ شدہ کار کا ڈھانچہ برآمد ہوا۔ یہ ڈھانچہ ست دھارا سے ایک فرلانگ کی دوری پر تھا۔ خبر
ملتے ہی میں موقعے پر پہنچا۔ یہ ایک چھوٹی سی ٹوسیٹر گاڑی تھی۔ اس کی چھت بوقت ضرورت
تہہ بھی کی جا سکتی تھی۔ تاہم جس وقت گاڑی دریا میں گری چھت کھلی ہوئی تھی۔ بلندی سے گر
کر گاڑی کا کچومر نکل چکا تھا۔ منچلے نوجوان ڈھانچے کو رسے ڈال کر دریا سے باہر کھینچ لائے
تھے اور اب چاروں طرف سے اُس کا جائزہ لے رہے تھے۔ موقع پر یہ خبر گرم تھی کہ یہ گاڑی
چند ماہ پہلے چمبا شہر کے نواب رئیسانی کے پاس تھی۔ گاڑی دیکھتے ہی میں بری طرح چونک
گیا۔ میرے ذہن میں وہ منظر تازہ ہو گیا جب گوبند کی گمشدگی پر ہم ''ٹیکرا گلی'' پہنچے تھے اور

ڈھلوان پر خون کے دھبوں کا معائنہ کیا تھا۔ وہاں پر پائی جانے والی کچھ شہادتوں سے ظ
ہوتا تھا کہ یہاں کسی گاڑی کو حادثہ پیش آیا ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے پلاسٹک کے
ٹکڑے گھوم گئے جو کسی بمپر کا حصہ تھے۔ میں نے تباہ شدہ گاڑی کے بمپر دیکھے اور سیکنڈ
ہزاروں حصے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی گاڑی ہے (بعد میں اس بات کی تصدیق بھی
گئی کیونکہ بمپر کے وہ ٹکڑے ابھی تک میرے پاس موجود تھے) نہ جانے کیوں مجھے احسا
ہونے لگا کہ اس تباہ شدہ گاڑی اور تیمور کی زندگی میں آنے والے نشیب و فراز میں گہرا تعل
ہے۔ گاڑی کے تباہ ہونے کی وجہ معلوم ہو جاتی تو تیمور کی زندگی کے سب سے تاریک گو
سے نقاب اُٹھ سکتا تھا۔ چمبا کا فاصلہ ڈلہوزی سے قریباً 20 میل ہے۔ میں نے اپنی جیپ
اور عملے کے تین ارکان کے ساتھ سہ پہر کے وقت چمبا پہنچ گیا۔ چمبا کے نواح میں نوا
رئیسانی کی رہائش گاہ کسی محل سے کم نہیں تھی۔ نواب عرصہ تین سال سے بیمار تھے۔ کارو
اور زمینوں کے سارے معاملات نواب کے پندرہ سولہ سالہ بیٹے اور بیگم مہربانو کے سپ
تھے۔ بیگم مہربانو کو میں نے ایک مرتبہ کسی فنکشن میں دیکھا تھا۔ اُس کی عمر تیس سال سے زیا
تھی غالباً بتیس تینتیس کے قریب، لیکن اس عمر میں بھی اُس کا حسن آنکھوں کو خیرہ کرتا تھ
بڑی بھرپور اور شاداب عورت تھی وہ۔ نواب رئیسانی کو کوئی عجیب قسم کا عارضہ تھا۔ نامعل
وجہ سے انہیں بخار ہو جاتا تھا۔ اندرون اور بیرون ملک اُن کا بے تحاشا علاج ہوا تھا لیکن
کسی بیماری کا پتہ چلا تھا اور نہ بخار میں افاقہ ہوا تھا۔ ویسے سنا تھا کہ اب کچھ عرصے سے اُ
کی حالت بہتر ہے۔ میں نواب رئیسانی کی شاندار رہائش گاہ ''بانو ولاز'' پہنچا تو بیگم مہر
نے میرا استقبال کیا۔ اُن کی زبانی پتہ چلا کہ نواب صاحب کچھ ٹیسٹ وغیرہ کروانے
لیے دہلی گئے ہوئے ہیں۔ نوابزادہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو بتایا
ڈلہوزی کے نزدیک دریا سے ایک ایسی کار کا ڈھانچہ ملا ہے جس کے بارے میں کہا جا رہا
کہ وہ نواب صاحب کی ملکیت رہی ہے۔ اس اطلاع پر بیگم صاحبہ بری طرح چونک گئیں
اُن کی خوبصورت آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوف کی جھلک بھی نظر آئی۔

وہ بولیں۔ ''ہاں...... اس سال موسم بہار میں ہماری بلیو ٹوسیٹر چوری ہو گئی تھی۔
نے یہاں پولیس سٹیشن میں پرچہ بھی درج کرایا تھا۔ میرا خیال ہے یہ وہی ٹوسیٹر ہو گی۔۔
بلیو رنگ کی۔''

''جی ہاں...... یہ وہی گاڑی ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ...... وہ کیسے دریا میں گری اور ملی کیسے؟''

میں نے کہا۔ ''گرنے کا تو مجھے معلوم نہیں بیگم صاحبہ! ہاں ملنے کی وجہ پانی کا اُترنا
ہے۔ آج صبح چند لڑکوں نے اُس کا ڈھانچہ دریا میں دیکھا ہے۔''

''اوہ گاڈ، وہ تو بالکل برباد ہو چکی ہو گی...... ہاؤ سیڈ...... ہمیں بہت دُکھ ہوا اس نیوز
پر۔ وہ بہت پرانی گاڑی تھی۔ میرے خیال میں 1916ء کی رجسٹرڈ تھی۔ مجھے پرانی چیزیں
بہت اچھی لگتی ہیں۔ آئی تھنک اولڈ از گولڈ۔''

بیگم صاحبہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ انہیں واقعی پرانی چیزوں سے محبت تھی۔ کوٹھی کی
نشست گاہ عجائب خانہ نظر آ رہی تھی۔ قدیم فرنیچر، قدیم تصویریں قدیم طرز کی آرائش یہاں
تک کہ بیگم صاحبہ نے جو جیولری پہن رکھی تھی وہ بھی وکٹوریہ عہد کی لگتی تھی لیکن چونکہ وہ خود نئی
نویلی تھی اس لیے ان ساری کرم خوردہ چیزوں کے درمیان بھی سج رہی تھیں۔

کار چوری کی بات کر کے ایک طرح سے بیگم صاحبہ نے معاملہ ہی ختم کر دیا تھا لیکن
میں اتنی جلدی اس خوبصورت عورت کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں کرید کرید کر سوال
پوچھتا رہا کہ کار کب چوری ہوئی، کیسے ہوئی اور اُس کی تلاش کے لیے کیا کچھ کیا گیا......
میری جرح بیگم صاحبہ کو پسند نہیں آ رہی تھی اور وہ میرے طویل سوالوں کے بڑے مختصر جواب
دے رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں نے تھوڑی دیر اور سوال جواب کا سلسلہ جاری
رکھا تو وہ پنجے نکال کر مجھ پر جھپٹ پڑیں گی۔ بیگم صاحبہ ہونے کی وجہ سے وہ خاصی مغرور نظر
آتی تھیں اور لگتا تھا کہ تیز مزاج بھی ہیں۔ گفتگو کے دوران میری نگاہ محترمہ کی کلائی پر پڑی
اور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ انہوں نے ایک بہت پرانے ماڈل کی گھڑی باندھ رکھی تھی۔ ڈائل کا
فریم اور سنہری چین سیاہی مائل ہو چکا تھا لیکن گھڑی کا شیشہ بالکل نیا تھا اور چم چم کر رہا تھا۔
میری آنکھوں کے سامنے فوراً وہ شیشہ آ گیا جو چھ ماہ پہلے مجھے جائے حادثہ سے ملا تھا اور جو
اب دفتر میں میری میز کی دراز میں پڑا تھا۔ مجھے اپنی گھڑی کی طرف گھورتے پا کر بیگم صاحبہ
ایک دم الرٹ ہو گئیں اور گھڑی والا ہاتھ اوٹ میں کر لیا...... صبح دریا سے برآمد ہونے والے
کار کے ڈھانچے کی میں اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا۔ اس تلاشی میں جو سب سے اہم چیز
برآمد ہوئی تھی وہ سنہری بالوں کا ایک گچھا سا تھا۔ ان بالوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ
یہ کسی مرد کے ہیں اور غالباً کسی انگریز صاحب کے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ٹوٹی ہوئی مالا
کے چند سبز موتی بھی ملے تھے۔ یہ موتی صاف طور پر کسی عورت کی موجودگی کی طرف اشارہ
کرتے تھے۔ اب اس سنہری گھڑی کا نیا نویلا شیشہ دیکھنے کے بعد مجھے سو فیصد یقین ہو گیا
کہ جس وقت بلیو ٹوسیٹر کو حادثہ پیش آیا اُس وقت میں بیگم صاحبہ خود بھی کار میں موجود تھیں۔

میرے تفتیشی رویے نے اب بیگم صاحبہ کو تقریباً مشتعل کر دیا تھا۔ وہ بولیں۔ ''سوری انسپکٹر! تمہیں اس سلسلے میں کچھ اور پوچھنا ہو تو میرے وکیل سے مل لو۔ میں اُسے تمہارے بارے فون کر دوں گی۔'' اُس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

میں بدستور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ برآمدے کی طرف چند قدم اٹھانے کے بعد یک لخت میری طرف گھومیں اور مجھے گھورنے لگیں۔ ''کیا بات ہے تم جاتے نہیں ہو۔'' انہوں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے ابھی ہماری بات ختم نہیں ہوئی۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ مجھے پھاڑ کھانے پر آمادہ تھیں۔ غصے کی وجہ سے سانس تیز چل رہی تھی اور جسم کے خوبصورت نشیب وفراز اور بھی نمایاں ہو گئے تھے۔

میں نے کہا۔ ''میرا ناقص خیال یہ ہے کہ آپ کی ٹوسیٹر چوری نہیں ہوئی تھی۔ اُسے چھ ماہ پہلے ٹیکرا اگلی کے قریب آپ کے ہاتھوں حادثہ پیش آیا تھا اور جس وقت یہ حادثہ پیش آیا آپ کے ساتھ ایک انگریز صاحب بھی موجود تھے......''

میرے ان چند الفاظ نے بیگم صاحبہ کے سر پر بم کے پے در پے دھماکوں کا کام کیا۔ وہ پھٹی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ کوئی نوکر انہیں اس حالت میں دیکھتا تو سمجھتا شاید بیگم صاحبہ نے میرے رُوپ میں فرشتہ اجل کا دیدار کیا ہے۔ وہ دھیمے قدموں سے واپس لوٹیں اور دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میں نے تپائی پر رکھے ہوئے جگ سے پانی کا گلاس بھرا اور اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لیجیے...... پی لیں۔'' انہوں نے لرزاں ہاتھوں سے پانی کا گلاس پکڑ لیا۔ پھر جیسے چونک کر اُسے واپس تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے ''انگریز صاحب'' کا ذکر گول مول انداز میں تھا کیونکہ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ انگریز کون تھا اور اُس کا نام کیا تھا۔ ایک طرح سے میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا اور یہ تیر سیدھا بیگم صاحبہ کے کلیجے میں لگا تھا۔

وہ ایک سمجھدار عورت تھی۔ بڑی جلدی اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ اب انکار فضول ہے اور اس سے بے اعتمادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ چند لمحے اپنے خوبصورت ہونٹ کاٹتے رہنے کے بعد اُس نے کہا۔ ''انسپکٹر! بہتر ہے ہم اندر چل کر بات کریں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔ آپ خواہ مخواہ کو تکلیف نہ دیں۔ آپ مصروف ہوں گی۔ میں آپ کے وکیل سے بات کر لوں گا۔''

وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ پھر ایک دم اُس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔ یوں لگا جیسے

چلچلاتی دھوپ میں بارش ہونے لگی ہے۔ لوہا جتنا سخت ہو اُتنی جلدی ٹوٹ جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ بھی جتنی مضبوط نظر آتی تھیں اندر سے اتنی ہی کمزور تھیں۔ ''پلیز انسپکٹر! میرے ساتھ آؤ۔ میں...... میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

کوئی اور انسپکٹر ہوتا تو اپنا ریٹ بڑھانے کے لیے کہتا، بات تو اب عدالت میں ہو گی بیگم صاحبہ لیکن میں نے ریٹ بڑھانا تھا اور نہ روتی سسکتی عورت پر دباؤ ڈالنا تھا۔ میں اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل دیا۔

وہ نرم موم کی طرح ہو رہی تھی۔ میں نے معمولی تپش دکھا کر اُس کی ''زبان'' کو پگھلا لیا...... پھر جب ایک بار وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اُس نے وہ راز میرے سامنے اُگل دیا جسے وہ چھ ماہ سے چھپائے ہوئے تھی۔ وہ ایک عورت کا سینہ تھا۔ اُس میں اتھاہ گہرائی تھی۔ کوئی اس گہرائی کی تہہ تک پہنچ سکا ہے نہ پہنچ سکے گا۔ مگر وہ خود اس گہرائی کو میرے سامنے ظاہر کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اُس نے بھیگی ہوئی آنکھوں اور لڑکھڑاتی زبان کے ساتھ اقرار کیا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو انسپکٹر! تم نے جو کچھ بھی کہا درست ہے۔'' یہ فقرہ اُس گفتگو کی ابتداء تھا جو میرے اور مہربانو کے درمیان قریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ اس گفتگو سے میں نے جو کچھ اخذ کیا اُس کا خلاصہ یوں ہے۔ سات آٹھ ماہ پہلے بیگم مہربانو کی زندگی میں ایک مرد آیا تھا۔ وہ ایک انگریز فوٹوگرافر ایڈی تھا۔ ایڈی پہاڑی علاقوں کی تصویر کشی کے سلسلے میں نواب رئیسانی کے گھر میں مقیم تھا۔ وہ ایک جواں سال وجیہہ مرد تھا۔ دوسری طرف مہربانو بھی اپنے سراپے میں کشش کا ایک جہاں آباد رکھتی تھی۔ کوئی دیکھ کر کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک پندرہ سالہ لڑکے کی ماں ہے۔ ایڈی اور مہربانو نہ چاہتے ہوئے بھی نگاہوں کے طلسم میں گرفتار ہو گئے۔ یہ بڑا طوفانی قسم کا عشق تھا۔ مہربانو جیسی پارسا عورت اس طوفان کی لپیٹ میں یوں آئی کہ سدھ بدھ کھو بیٹھی۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ٹھہرے ہوئے مہمان کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے اور بیمار شوہر کے سرہانے بیٹھ کر کسی اور دُنیا میں کھوئی رہتی ہے۔ وہ مارچ کی ایک ابر آلود صبح تھی۔ نواب رئیسانی اپنے صاحبزادے کے ساتھ پشاور گئے ہوئے تھے۔ انہیں وہاں کسی انگریز ڈاکٹر سے ملنا تھا۔ دوسری طرف مہربانو کو عشق کے پر لگے ہوئے تھے اور وہ سب کچھ بھول کر اونچی ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ ایڈی اُن دنوں فوٹوگرافی کے سلسلے میں ڈلہوزی گیا ہوا تھا۔ شوہر اور بیٹے کے گھر سے جاتے ہی مہربانو اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بے تاب ہو اُٹھی۔ اُس نے سیاہ برقعہ پہنا ٹوسیٹر گاڑی نکالی اور علی الصبح منہ اندھیرے ڈلہوزی روانہ ہو گئی۔ ایڈی اور مہربانو کی ملاقات ڈلہوزی کے ایک ہوٹل

میں ہوئی۔ وہاں کچھ دیر اپنی ''بے تابیاں'' کم کرنے کے بعد دونوں ''ست دھارا'' جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ایڈی نے ''ست دھارا'' کے قریب ایک پرانا ڈاک بنگلہ کرائے پر لے رکھا تھا اور وہیں فلمیں ڈویلپ کرنے کے لیے لیبارٹری بنا رکھی تھی۔ وہ مہربانو کو اپنی لیبارٹری دکھانے ڈاک بنگلہ لے جا رہا تھا کہ ٹیکرا گلی کے قریب ایک خطرناک موڑ پر پھسلن کی وجہ سے اُن کی گاڑی بے قابو ہو کر سنسان ڈھلوان پر جا گری۔ ایڈی اور مہربانو گاڑی کے اندر پھنس گئے اور گاڑی کی فیول لائن میں آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ زخمی ایڈی اور مہربانو گاڑی کے نیچے دبے ہوئے مدد کے لیے چلا رہے تھے اور گاڑی کسی بھی لمحے دھماکے سے اُڑنے والی تھی۔ یہی موقع تھا جب پسینے میں شرابور ایک نوجوان اتھلیٹ نے سڑک پر سے نشیب میں جھانکا۔ وہ چند لمحے شدید تذبذب میں کھڑا رہا۔ کبھی پیچھے دیکھتا تھا اور کبھی مدد کے لیے چلاتے ہوئے مرد و زن کی طرف۔ اُس کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ پھر اُس کی نگاہ گاڑی کے بونٹ سے چھوٹتی ہوئی چنگاریوں پر پڑی۔ وہ صورت حال کی نزاکت جان گیا۔ چھلانگ لگا کر وہ نشیب میں آیا اور بھاگتا ہوا گاڑی تک پہنچ گیا۔ اُس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر زخمی ایڈی اور مہربانو کو گاڑی تلے سے نکالا اور پتھروں کی اوٹ میں لے گیا۔ بھک بھک کی آوازوں سے گاڑی میں آگ لگ گئی اور بارش کے سبب تھوڑی دیر میں ٹھنڈی بھی ہو گئی۔ ایڈی کا ایک کندھا چکنا چور ہو چکا تھا۔ چہرے اور سر پر بھی گہرے زخم آئے تھے۔ دوسری طرف مہربانو بھی جزوی طور پر زخمی ہوئی تھی۔ اتھلیٹ جس کا نام تیمور تھا مدد کے لیے اپنے دیگر ساتھیوں کو بلانا چاہتا تھا مگر ایڈی اور مہربانو نے اُسے سختی سے منع کر دیا۔ مہربانو ایک ذہین عورت تھی۔ اس نازک صورت حال میں پھنس کر اُس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اُس نے تیمور سے درخواست کی کہ تباہ شدہ گاڑی کو دھکیل کر دریا میں پھینک دیا جائے۔ تیمور اب بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ چمبا کی مشہور و معروف بیگم صاحبہ کو شکل سے جانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ساتھی مرد سے بیگم صاحبہ کا کوئی ''نازک'' رشتہ ہے اور وہ اس رشتے کو ہر صورت راز میں رکھنا چاہتی ہیں۔ اُس نے مہربانو اور ایڈی کے ساتھ مل کر گاڑی کو دریا میں دھکیل دیا پھر اُن دونوں کے ساتھ مل کر موقعے سے حادثے کی ہر نشانی مٹا ڈالی۔ مہربانو نے آنسو بھری نظروں سے تیمور کی طرف دیکھا اور التجا کی کہ وہ اس بارے میں کسی سے بات نہیں کرے گا۔ تیمور نے وعدہ کر لیا۔ وہ دوڑ میں شریک تھا اور زیادہ دیر وہاں ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ورنہ چمبا کی بیگم مہربانو کا راز، راز نہ رہ سکتا۔ مہربانو بھی یہ بات سمجھتی تھی۔ اس نے تیمور سے کہا کہ وہ جائے...... وہ دونوں کسی نہ

کسی طرح اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔

بعد میں مہربانو کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ تیمور کون ہے اور اس نے کس طرح سالانہ ریس کے دوران اپنی جیت کو ہار میں بدل کر اُن دونوں کی مدد کی تھی۔ در حقیقت اُس وقت وہ پہلے نمبر پر جا رہا تھا جب اُسے حادثے کی وجہ سے رکنا پڑا تھا۔ وہ تیمور کی بے حد مشکور تھی۔ پھر جس طرح تیمور نے مہربانو اور ایڈی کا راز اپنے سینے میں دفن کر لیا تھا اس نے تیمور کو مہربانو کی نظروں میں اور بھی بلند مقام دے دیا تھا۔ وہ کسی طور تیمور کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ اس غرض سے وہ ایک دفعہ رازداری سے ڈلہوزی بھی گئی لیکن تیمور سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر یوں ہوا کہ اُسے اپنے بیمار شوہر کو علاج کی غرض سے انگلینڈ لے جانا پڑا۔ انگلینڈ سے وہ لوگ دو تین ہفتے پہلے ہی واپس لوٹے تھے۔ نواب رئیسانی کی حالت اب کافی بہتر تھی۔ دوسری طرف مہربانو بھی بیماریِ عشق سے کافی حد تک صحت یاب ہو چکی تھی۔ ایڈی اپنے ناکارہ زخمی بازو کے ساتھ واپس انگلینڈ جا چکا تھا اور مہربانو چھ سات ماہ پہلے کے شب و روز کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھلا دینا چاہتی تھی...... مہربانو کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اُس کے انگلینڈ جانے کے بعد یہاں تیمور کو کن حالات کا سامنا ہوا ہے۔ وہ بے خبر تھی کہ اُس کی زندگی کی خاطر اپنا کیریئر داؤ پر لگا دینے والا ''بے لوث نوجوان'' اپنوں اور غیروں کے ستم کا شکار ہے۔ نہ اُس کا حوصلہ سلامت رہا ہے اور نہ جسم۔ وہ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ایک حقیر مخلوق بن کر رہ گیا ہے۔ میں نے جب اُسے تیمور کے حالات بتائے تو وہ ششدر رہ گئی۔ شاید اُسے بھی یقین نہیں آیا کہ چھ ماہ پہلے کا خوبصورت اتھلیٹ آج ایک معذور نشئی ہے...... پھر دھیرے دھیرے میں نے مہربانو کی خوبصورت آنکھوں میں ایک بے قراری پیدا ہوتے دیکھی اور ایک عزم سا طلوع ہوتے محسوس کیا......

☆======☆======☆

مہربانو کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں تیمور احسن نے کسی معمولی عورت پر احسان نہیں کیا تھا اور احسان بھی ایسا جو اپنی مثال آپ تھا۔ اپنی کامیابی اور جان داؤ پر لگا کر اُس نے مہربانو کی جان اور عزت بچائی تھی سارے دُکھ اپنے سینے پر جھیل لیے تھے اور خاموش رہا تھا۔ اُس نے اپنے قصہ غم کو لبوں تک نہیں آنے دیا تھا کیونکہ اُس میں چمبا کی معزز ترین پردہ نشین کا نام آتا تھا...... بیگم مہربانو سے میری ملاقات کے صرف دو روز بعد کا واقعہ ہے۔ پتہ چلا کہ چمبا کے نواب رئیسانی اپنی بیگم کے ہمراہ ڈلہوزی آئے تھے۔ گزرتے ہوئے راستے میں اُن کی نگاہ تیمور پر پڑی۔ وہ رُک کر اس کے بارے میں پوچھنے

لگے، جب اُنہیں پتہ چلا کہ یہ وہی لڑکا ہے جو کچھ عرصہ پہلے تک علاقے کا بہترین اتھلیٹ سمجھا جاتا تھا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی گاڑی کے دروازے کھول دیے اور اُس غلیظ گٹھڑی کو اٹھا کر گاڑی میں رکھ لیا۔ اب تیمور نواب صاحب کی چمبا والی رہائش گاہ میں ہے اور سنا جا رہا ہے کہ نواب صاحب اُس کی ٹانگ کا علاج کرائیں گے۔

میں جانتا تھا ان ''مہربانیوں'' کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور کیوں ہے۔ تیمور کو موت سے زندگی کی طرف لوٹانے کے لیے علاقے کی سب دولت مند اور بااثر عورت حرکت میں آ چکی تھی...... اگلے ایک ماہ میں چند واقعات تیزی سے رونما ہوئے...... پہلے معلوم ہوا کہ تیمور کو پشاور بھیجا گیا ہے جہاں اُس کا نشہ چھڑانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دیگر علاج معالجہ ہو رہا ہے پھر معلوم ہوا کہ اُسے ٹانگ کے علاج کے لیے دہلی لے جایا گیا ہے اور ایک معروف انگریز پروفیسر جو آرتھوپیڈک سرجن بھی ہے اُس کی ٹانگ کا آپریشن کرنے والا ہے۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ آپریشن کینسل ہو گیا ہے اور تیمور واپس چمبا آ گیا ہے۔ اس کے بعد ایک روز مجھے بلال شاہ کی زبانی پتہ چلا کہ تیمور کا لنگوٹیا یار انعام خاں اُسے ملنے کے لیے چمبا گیا ہوا تھا۔ میں نے بلال شاہ سے کہہ کر انعام خاں کو تھانے بلا لیا اور اس سے تیمور کا حال احوال پوچھا۔ اس نے تیمور کی ایک تازہ تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک ڈیڑھ مہینے میں ہی وہ بہت حد تک صحت یاب ہو گیا تھا۔ ہڈیوں پر گوشت آ گیا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اصل مقام پر نظر آ رہی تھیں۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور وہ صاف ستھرے لباس میں آرام کرسی پر بیٹھا ایک سپورٹس میگزین دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا ایک برباد شدہ باغ پر پھر بہار آ گئی ہے اور سوکھے تنوں میں سے سبز کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ انعام خاں نے بتایا کہ وہ ''بانو ولاز'' میں بڑے مزے میں ہے۔ بیگم صاحبہ اُس پر بے حد مہربان ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تیمور ایک بار پھر کھیل کے میدان میں واپس آئے گا اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرے گا۔ وہ کہتی ہیں کہ کتنا بھی پیسہ لگے وہ اُس کی ٹانگ ٹھیک کروائیں گی۔''

انعام خاں کی کہی ہوئی بات درست نکلی۔ چند روز بعد پتہ چلا کہ نواب رئیسانی اپنے چیک اپ کے لیے لندن گئے ہیں اور تیمور بھی اُن کے ساتھ ہے یہ ''کایا پلٹ'' حیران کن تھی۔ کہاں یہ کہ ڈلہوزی میں بھی تیمور کو مناسب علاج مہیا نہیں تھا اور کہاں وہ آپریشن کے لیے انگلینڈ کا رُخ کر رہا تھا۔ سچ کہا گیا ہے کہ انسان کو اُس کے کرموں کا صلہ ملتا ہے۔ دیر ہو سکتی ہے لیکن اندھیر نہیں۔ انگلینڈ سے نواب رئیسانی اور تیمور کی واپسی قریباً دو ماہ بعد ہوئی۔

اس سلسلے میں مجھے انعام خاں اور بلال شاہ سے مسلسل خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اصل بات کا انہیں بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ صرف یہی جانتے تھے کہ نواب رئیسانی اور اُن کی بیگم اچانک تیمور پر مہربان ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تیمور سردار شیکھر کے مقابلے میں دوبارہ دوڑ میں حصہ لے۔ انعام خاں کی زبانی پتہ چلا کہ تیمور لندن سے بالکل صحت یاب ہو کر آیا ہے اور بغیر کسی سہارے کے آرام سے چلتا پھرتا ہے۔ انعام خاں نے ایک بہت خاص خبر بھی پہنچائی۔ اُس نے بتایا کہ پورے آٹھ ماہ بعد تیمور اور انجم میں ملاقات ہوئی ہے۔ انجم کے لیے تیمور نے پیغام بھیجا تھا اور بھاگم بھاگ اُس سے ملنے چمبا پہنچ گئی تھی۔ اس ملاقات میں تیمور نے انجم کو اپنی ''قسم'' کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ انشاء اللہ وہ اس قسم کا بوجھ بہت جلد اپنے اور انجم کے سر سے اتار دے گا۔ یہ ''افغان بچے'' کا قول تھا اور انجم کو اس قول پر پورا یقین آ گیا تھا۔

☆======☆======☆

بہار کی وہ سہانی صبح مجھے آج بھی یاد ہے جب ڈلہوزی کنگ کالج کی گراؤنڈ میں ہزاروں تماشائی 18 میل کی میراتھن ریس شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس ریس میں تیمور بھی حصہ لے رہا تھا۔ ٹانگ ٹھیک ہونے کے بعد چار پانچ ماہ کے اندر اندر اُس نے خود کو اس قابل بنا لیا تھا کہ اس ریس میں دوڑ سکے۔ شیکھر بھی اس دوڑ میں حصہ لے رہا تھا۔ تاہم چند ماہ پہلے وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوا تھا اور ویسے بھی آؤٹ آف پریکٹس رہنے سے کچھ موٹا ہو چکا تھا۔ امکان تھا کہ وہ اس ریس میں پانچویں چھٹے نمبر پر ہی آ سکے گا۔ دوسری طرف تیمور کے ریس جیتنے کے امکانات بھی بہت کم تھے۔ دلچسپی کی بات صرف یہ تھی کہ دیکھیں تیمور، شیکھر کو ہرانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں...... اس ریس میں سب سے ''فیورٹ'' سردار فیملی کا ہی ایک نیا لڑکا درشن کمار تھا۔ وہ کنگ کالج میں سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔

کالج کی گراؤنڈ سے ریس کا آغاز ہوا۔ ریس کی لمحہ بہ لمحہ صورت حال جاننے کے لیے سردار اشوک رائے نے مختلف مقامات پر ٹیلیفون سروس کا انتظام کر رکھا تھا۔ ٹیلیفون کے ذریعے جو اطلاع کالج گراؤنڈ میں پہنچتی تھی وہ لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے تمام تماشائیوں تک پہنچا دی جاتی تھی۔ میں اور سب انسپکٹر ہاشم بھی یہ اطلاعات سننے والوں میں شامل تھے۔ ریس کے آغاز ہی میں سردار فیملی کا لڑکا درشن کمار آگے نکل گیا تھا اور امید یہی تھی کہ آخر تک آگے رہے گا۔ ریس کے تیسرے میل سے دو پرانے حریفوں یعنی شیکھر اور تیمور میں سخت

مقابلہ شروع ہوگیا۔ وہ ہر صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہتے تھے تاکہ فیصلہ کن مرحلے میں جیتنے کی پوری کوشش کرسکیں۔ سندر گاؤں تک تیمور آگے تھا لیکن ٹیکرا گلی تک پہنچتے پہنچتے شیکھر آگے نکل گیا اور تیزی کے ساتھ اپنا فاصلہ بڑھانے لگا۔ یہاں سے ''فنشنگ لائن'' ڈھائی میل کے فاصلے پر تھی۔ اس ڈھائی میل کے راستے میں شیکھر اور تیمور میں جان لیوا مقابلہ ہوا۔ جب کھلاڑی ہانپتے کانپتے ہوئے کالج گراؤنڈ میں داخل ہوئے تو تماشائی یہ دیکھ کر اپنی نشستوں سے اُچھل پڑے کہ ماضی کے دو حریف دوڑ میں ایک بار پھر سب سے آگے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو ہرا دینے کے ایسے شدید جذبے سے دوڑ رہے تھے کہ پہلے سے لگایا ہوا ہر اندازہ غلط ثابت ہوگیا تھا۔ درشن کمار جسے چیمپئن سمجھا جارہا تھا تیسرے نمبر پر آرہا تھا اور اُس کا فاصلہ شیکھر سے قریباً پچاس گز تھا۔ شیکھر سے آگے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر دوڑنے والا تیمور احسن تھا۔ وہ باہمت نوجوان جس نے چار سال اپنی جیت کا انتظار کیا تھا اور پانچویں بار اس مقابلے کو جیت کر بھی ہار دیا تھا۔ ایک بار پھر اور شاید آخری بار یہ ریس جیتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تیمور کے حمایتی اُچھل اُچھل کر اُسے داد دے رہے تھے۔ گراؤنڈ میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس وقت گراؤنڈ میں موجود بیشتر لوگوں کی ہمدردیاں تیمور کے ساتھ ہوگئی ہیں۔ وہ اُسے جیتتے دیکھنا چاہتے تھے۔ قریباً دو سو گز کی دوڑ میں زبردست مقابلہ ہوا۔ ایک مرتبہ شیکھر اور تیمور بالکل برابر ہوگئے لیکن آخری لمحوں میں تیمور پھر آگے نکل گیا۔ اُس نے یہ مقابلہ جیتا اور بے دم ہو کر گراؤنڈ میں گر پڑا......

ان گنت لوگوں نے اُسے کندھوں پر اٹھا لیا اور خوشی سے ناچنے لگے۔ ڈلہوزی کی تاریخ میں جیت کا وہ منظر یادگار تھا۔ فرطِ جذبات میں اُچھل کود کرنے والوں میں جہاں تیمور کے دوست اور اُس کے سینکڑوں پرستار شامل تھے وہاں اُس کا باپ ماسٹر حیات بھی تھا۔ جو خواب کئی برس پہلے اُس نے دیکھا تھا وہ آج اُس کے بیٹے نے پورا کیا تھا اور یوں پورا کیا تھا کہ آدھا ڈلہوزی مسرت سے جھوم اُٹھا تھا لیکن اس جیت کی قیمت بیٹے کو کیا ادا کرنی پڑی یہ بھی سن لیجیے۔ تیمور کی ٹانگ میں ایک بار پھر فریکچر ہوگئے۔ دوڑ جیتنے کے بعد وہ تقریباً بے ہوش ہوگیا تھا۔ بعد میں اُس نے بتایا کہ اُس کی ٹانگ میں شدید درد ہو رہا ہے۔ اُسے فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا۔ ٹانگ کے ایکسرے وغیرہ ہوئے بعد میں یہ ایکسرے دہلی پہنچائے گئے۔ انگریز سرجن سخت حیران ہوا کہ ایسی ٹانگ کے ساتھ نہ صرف نوجوان بھاگا ہے بلکہ اٹھارہ میل کی دوڑ بھی جیتا ہے۔ سرجن کانوں کو ہاتھ لگانے لگا اور بولا کہ یہ غیر معمولی واقعہ ہے...... تیمور اس کے بعد کبھی دوڑ میں حصہ نہیں لے سکا۔ وہ اُس کی زندگی کی آخری دوڑ

تھی۔ تاہم اس دوڑ میں اس نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جس کے لیے انسان ساری زندگی ''دوڑتا'' ہے۔ اُسے جیت کی دائمی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ گرانقدر انعامات ملے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنی ''محبت'' جیتی تھی۔ اس نے اپنے اور انجم کے سر سے اُس قسم کا بوجھ اتار دیا تھا جو یوں تو ایک لفظ تھی لیکن وزن میں ہمالیہ کا پہاڑ تھی۔ شاید کچھ پڑھنے والوں کو ایک نوجوان کا قسم کھانا اور اُسے پورا کرنے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دینا، عجیب محسوس ہو لیکن زندگی میں ایسے انوکھے لوگ ملتے ہیں انہی دیوانوں کی دیوانگی سے اس دُنیا کا حسن قائم ہے۔

یہاں سردار اشوک رائے اور اس کے بیٹے سردار شیکھر کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی ہار کو کھلے دل سے تسلیم کیا بلکہ سردار اشوک رائے نے تیمور کو خصوصی انعام بھی دیا۔ یہیں پر بس نہیں ہوئی۔ سردار شیکھر اس سے بھی دو قدم آگے بڑھا۔ وہ جانتا تھا کہ انجم اور تیمور ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور انجم اگر چند روز کے لیے اُس کے نزدیک آئی تھی تو وہ صرف تیمور کو دکھانے اور جلانے کے لیے۔ اُس نے تیمور اور انجم کو ملانے کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔ انجم کے انگلینڈ پلٹ بھائی اُس کے گہرے دوست تھے۔ اس نے انہیں سمجھایا بجھایا اور اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ اپنی بہن کی خوشیوں کی راہ میں دیوار نہ بنیں۔ کچھ کوشش نواب رئیسانی کی طرف سے بھی ہوئی اور یوں انجم اور تیمور کے درمیان حائل رکاوٹیں ایک ایک کر کے دُور ہوگئیں۔

اس کہانی کا ایک کردار جو شروع سے آخر تک پردے میں رہا گوبند ہے۔ گوبند کی گمشدگی ایک بالکل ہی علیحدہ معاملہ ثابت ہوا۔ تیمور انجم اور سردار شیکھر وغیرہ کے قصے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس واقعے میں وہ تلوار بردار ڈوگرا فوجی ملوث تھا جسے علاقے کے لوگ شاہی کہتے تھے۔ ڈلہوزی کے اندھیروں اجالوں میں ڈوبتی اُبھرتی وہ پُرتجسّس کہانی میں آپ کو اگلے صفحات میں سناؤں گا۔

انجم سے شادی کے بعد بھی تیمور کی ٹانگ کا علاج معالجہ ہوتا رہا۔ کچھ عرصے بعد وہ ٹھیک سے چلنے لگا لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے اُس آخری ریس کے بعد وہ کبھی دوڑ نہیں سکا۔ چمبا کے نواب رئیسانی اور اُن کی بیگم تیمور پر بہت مہربان تھے۔ انہوں نے تیمور کو پاؤں پر کھڑا ہونے میں بہت مدد دی۔ چمبا کے فیشن ایبل علاقے میں تیمور نے سیاحوں کے لیے نوادر کی ایک دکان کھول لی۔ اس دکان کو چلنا ہی تھا کیونکہ دکان کو رونق بخشنے والے اہم اور مستقل خریداروں میں نوادر کی دیوانی بیگم مہربانو بھی شامل تھی۔ وہ پرانی چیزوں کی

دیوانی تھی۔ شاید اسی لیے اُسے اپنے پرانے شوہر سے ایک بار پھر والہانہ محبت ہو گئی تھی اور یہ کوئی مصنوعی محبت نہیں تھی۔ وہ دل و جان سے اُسے چاہتی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس عورت نے کبھی اپنے شوہر سے بے وفائی کی ہو گی اور نہ آئندہ کسی سے کہا ہو گا...... نواب رئیسانی کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے مہربانو جیسی بیوی ملی تھی اور مہربانو کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے تیمور اور میرے جیسے ''راز دار'' مل گئے تھے۔ قدرت اکثر پہلی غلطی معاف کر دیتی ہے مہربانو کی چند روزہ بے وفائی کی طرح یہ راز بھی ہمیشہ راز ہی رہا کہ تیمور اپنی زندگی کی ''سیکنڈ لاسٹ'' سالانہ ریس میں کیوں ہار گیا تھا اور پہلے دوسرے نمبر پر آتا آتا وہ انیسویں نمبر پر کیوں چلا گیا۔

☆======☆======☆

صاحب، ملازمہ اور گھڑی

میری یہ کہانی آپ کو میری دوسری کہانیوں سے قدرے مختلف نظر آئے گی۔ در
ایک پولیس والے کو اتنے مختلف لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ ہر گھڑی کوئی نت نئی کہا
ہے۔ ہمارے ہم پیشہ عموماً اپنی سرگرمیوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھتے ورنہ ایک ایک
پچاس پچاس کتابیں با آسانی لکھ سکتا ہے اور اگر وہ دیہاتی تھانے میں رہا ہو تو کیا کہ
ہے۔ ہمارے دیہات کی زمین فصلوں کے علاوہ کہانیوں کے لیے بھی ہمیشہ سے بڑی
رہی ہے مگر اس وقت جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں اُس کا تعلق دیہی علاقے
نہیں۔ تاہم یہ دیہاتی کہانیوں سے کچھ کم دلچسپ نہیں رہے گی۔

1942 کے شروع یا 1941ء کے آخر کی بات ہے سردیوں کا موسم تھا۔ میں اُن
امرتسر کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ کاروباری لوگوں کا علاقہ تھا، اس کے علاوہ ا
بازار بھی میری حدود میں آتے تھے۔ ایسے ہی ایک بازار میں گھڑیوں کی چھوٹی سی ما
تھی۔ اشفاق رضوی نامی پولیس کا ایک مخبر اس مارکیٹ میں موجود تھا۔ یہاں میں آپ
چلوں کہ ہر ایس ایچ او اپنے علاقے کی ضروریات کے مطابق اہم مقامات پر مخبر
انتظام کرتا ہے۔ عموماً یہ مخبر مقامی لوگوں کے اندر سے ہی ہوتا ہے اور پولیس سے اُس
نہایت خفیہ رہتا ہے۔ جب کبھی تھانے سے اُس کا تعلق ظاہر ہو جائے وہ پولیس کے کس
نہیں رہتا۔ اشفاق رضوی نامی جس شخص کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ بھی ایک ایسا ہی
گھڑیوں کی مارکیٹ میں اُس کی اپنی دکان تھی اور بظاہر وہ بڑا سیدھا سادا اور بے ض
شخص لگتا تھا مگر تھا بڑا ہوشیار اور پہلا ایس ایچ او بھی اپنی رپورٹ میں اُس کے لیے
کلمات لکھ کر گیا تھا۔ ایک روز میں تھانے میں بیٹھا ماتحت عملے سے گپ شپ لگا ر
اشفاق رضوی آ پہنچا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے بتایا کہ گھڑی مارکیٹ کے
نامی دکاندار نے ایک مشکوک گھڑی خریدی ہے۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ اُس
مارکیٹ میں گھڑیوں کی فروخت کے علاوہ خرید کا کام بھی ہوتا تھا اور بعض دکاندارو

بورڈ بھی آویزاں کر رکھے تھے کہ یہاں سیکنڈ ہینڈ گھڑیوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ جن
بازاروں میں پرانی اشیاء بیچی جاتی ہیں وہاں سے عموماً پولیس کو کوئی نہ کوئی شکار مل جاتا ہے
”شکار“ سے آپ کوئی اور مطلب نہ لیں۔ کہنے کا مقصد ہے کہ ایسی جگہیں بعض اوقات
مجرموں کے لیے شکنجے کا کام دیتی ہیں، اور وہ مسروقہ یا مشکوک چیز فروخت کرتے کرتے
جرم کی جڑوں سے مٹی ہٹا دیتے ہیں۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا اشفاق رضوی کی۔ اُس نے بتایا کہ جو گھڑی خریدی گئی ہے
اُسے ایک مفلوک الحال عورت بیچنے کے لیے لائی تھی۔ دکاندار نے اُس سے یہ گھڑی کافی
سستی یعنی صرف بیس روپے میں خریدی ہے لیکن حقیقت میں یہ گھڑی خاصی قیمتی ہے۔ میں
نے پوچھا۔ ”کتنی قیمتی ہے؟“

اشفاق نے اُلٹا مجھ سے سوال کیا۔ ”آپ بتائیں اندازاً کس قیمت کی ہوگی؟“

میں نے کہا۔ ”میاں میں یہاں بیٹھ کر اندازہ کیسے لگا سکتا ہوں۔“

اشفاق نے دبے دبے جوش سے کہا۔ ”جناب! جہاں تک اس گناہ گار کی آنکھیں کام
کرتی ہیں۔ کچھ نہیں کچھ نہیں تو اُس کی قیمت پانچ ہزار ہوگی......“

اشفاق کی بات سن کر میرے ساتھ ساتھ دوسرے بھی اُچھل پڑے۔ بلال شاہ قریب
ہی بیٹھا تھا۔ بھاڑ سا منہ کھولے اشفاق کی طرف دیکھتا جا رہا تھا جیسے بیچارے کی ذہنی حالت
پر افسوس کا اظہار کر رہا ہو۔ اگر اشفاق بے پناہ سنجیدہ نہ ہوتا تو شاید میں بھی اُس کی بات کو
مذاق سمجھتا مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ پوری سنجیدگی سے ہمیں گھڑی کی قیمت پانچ ہزار بتا رہا تھا۔
آپ ہماری حیرت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اُن دنوں پانچ ہزار ایک غیر معمولی رقم تھی
اور قیمتی سے قیمتی دستی گھڑی بھی دو ڈھائی ہزار سے اوپر نہیں جاتی تھی۔ ہاں اگر کسی انگریز
صاحب کے ہاتھ میں اس سے مہنگی گھڑی بندھی ہو تو کہا نہیں جا سکتا تھا۔

اشفاق نے ہماری حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ”جناب! میں اپنی
آنکھوں سے نہ دیکھ لیتا تو مجھے بھی یقین نہ آتا اور یہ جو میں نے آپ کو پانچ ہزار قیمت بتائی
ہے تو یہ بھی کم ہے، میرا خیال ہے اُس کی صحیح قیمت ساڑھے پانچ اور چھ کے درمیان
ہے......“

میں نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتا کہ تُو نے گھڑی دیکھی کیسے؟“

وہ اپنی گھنی مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ”خاں صاحب! جیسا کہ آپ جانتے ہیں میری
دکان گوبندر کے بالکل سامنے ہے۔ میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھ کر آسانی سے اُس کی دُکان

میں جھانک سکتا ہوں۔ جیسا کہ ہم دکانداروں کی عادت ہوتی ہے اکثر دوسروں کے گاہکوں پر نظر رکھتے ہیں اور اگر خود بے کار بیٹھے ہوں تو پھر تو ساری توجہ ہی دوسروں کی طرف ہوتی ہے۔ آج دوپہر میں فارغ بیٹھا تھا اس لیے میلے کپڑوں والی وہ جوان سی عورت گوبندر کی دکان میں داخل ہوئی تو میں نے فوراً اندازہ لگالیا کہ وہ کچھ بیچنے آئی ہے۔ بعد کی ساری خرید وفروخت میرے سامنے ہوئی۔ گھڑی کو دیکھنے پرکھنے کے بعد گوبندر پہلے تو اُسے پندرہ روپے پکڑاتا رہا۔ پھر عورت کے اسرار پر اُس نے گلے سے پانچ روپے مزید نکال کر شامل کیے اور اُسے تھما دیے۔ عورت چلی گئی تو گوبندر اور اُس کے دونوں سیلز مین سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اُن کا انداز دیکھ کر ہی مجھے شک ہوگیا کہ وہ کوئی تیر مارنے میں کامیاب رہے ہیں۔ پانچ روپے کا نوٹ لینے کے بہانے میں گوبندر کی دکان میں گیا تو وہ گھڑی کو بغور آتشی شیشے میں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تینوں اس معائنے میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں میری آمد کا پتہ ہی نہیں چلا...... اور جب تک پتہ چلا میں گھڑی کو اچھی طرح پرکھ چکا تھا۔ گوبندر مجھے دیکھ کر پہلے تو گڑبڑایا پھر گھڑی مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھو رضوی! کیسی گھڑی ہے ایک انگریز ڈپٹی کی ٹھیک ہونے کو آئی ہے۔''

میں نے بھی گھڑی کو احتیاط سے دیکھا۔ وہ سوئٹزر لینڈ کی بنی ہوئی تھی۔ ڈائل کور خالص سونے کا تھا اور ڈائل کے اندر چھ گول ہیرے لگے ہوئے تھے۔ ظاہری طور پر گھڑی کی حالت خراب تھی اور اُس کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ مگر اُس کی قیمت سے نہ گوبندر کو انکار تھا اور نہ مجھے۔ بہرحال میں نے گوبندر پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور فرصت پاتے ہی سیدھا آپ کی طرف چلا آیا۔

صورتِ حال کافی دلچسپ تھی۔ ایک بدحال عورت نہایت قیمتی گھڑی صرف بیس روپے میں بیچ کر چلی جاتی ہے اور بنیا دکاندار یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ مہنگی گھڑی ہے اور یقیناً اس عورت کی ملکیت نہیں ہے۔ اُس سے خرید لیتا ہے۔ بغور جائزے سے دو ہی باتیں سمجھ میں آتی تھیں۔ عورت نے گھڑی چرائی ہے یا اُسے کہیں گری پڑی ملی ہے اور وہ منہ اٹھا کر اُسے بیچنے چل دی ہے۔ دوسرا امکان زیادہ قوی محسوس ہوتا تھا کیونکہ چوری کرنے والے اتنے بے خبر نہیں ہوتے کہ مال مسروقہ کی قیمت کا صحیح اندازہ ہی نہ لگا سکیں۔ دوسرے گھڑی ٹوٹی ہوئی بھی تھی۔ غالب امکان یہ تھا کہ وہ کسی حادثے کے سبب یا کسی اور وجہ سے پہننے والے کی کلائی سے نکل گئی ہے اور دیر تک گرد و غبار میں پڑی رہی ہے...... معاملہ خاصا اہم تھا اس لیے میں نے کسی ماتحت کو بھیجنے کی بجائے خود گوبندر نامی دکاندار کے پاس جانے

کا ارادہ کیا۔

☆=====☆=====☆

''سفید پوشی'' کے کاموں میں بلال شاہ بہت کام آیا کرتا تھا۔ میں نے اُسے دو گھوڑا بوسکی کا ایک زبردست جوڑا سلوا کر دیا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں جعلی نگینوں والی انگوٹھیاں ڈال کر اور تلے دار کھسہ پہن کر وہ بالکل جاگیر دار لگنے لگتا تھا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جوں جوں وہ بولتا جاتا تھا اُس کا بھید کھلتا جاتا تھا یعنی رُعب داب کم ہوتا جاتا تھا۔ اس لیے میں نے اُسے ہدایت کر رکھی تھی کہ ایسے موقعوں پر کم سے کم بولا کرے اور زیادہ گھلنے ملنے سے باز رہا کرے...... اس وقت بھی وہ اپنے شاندار لباس میں تھا۔ میں نے اُسے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ اُسے گوبندر کی دُکان پر جا کر کیا کرنا ہے اور کیا کہنا ہے۔ خود میں بھی سادہ لباس میں تھا مگر میرا ارادہ تھا کہ میں دکان میں اُسی وقت جاؤں گا جب بلال شاہ آکر مجھے بتائے گا کہ مطلوبہ گھڑی دُکان میں موجود ہے۔

مکمل پروگرام یہ تھا کہ میں گوبندر کی دُکان سے تھوڑی دُور ایک چائے خانے میں بیٹھ جاؤں۔ بلال شاہ گوبندر کے پاس جائے گا اور گاہک بن کر اس سے ایسے سوال کرے گا کہ گوبندر اُسے مطلوبہ گھڑی دکھانے پر آمادہ ہوجائے۔ مثلاً بلال شاہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے کوئی امپورٹڈ گھڑی چاہیے۔ سونے کا ڈائل کور ہو۔ اگر سیکنڈ ہینڈ ہو تو بھی چلے گی...... وغیرہ وغیرہ۔ جب گوبندر اُسے گھڑی دکھا دے اور بلال شاہ کو یقین ہوجائے کہ یہ وہی گھڑی ہے تو وہ آکر مجھے بتا دے۔ اس کے بعد گوبندر کے لیے چالاکی دکھانے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

حسبِ پروگرام بلال شاہ مجھے چائے خانے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ شام کا وقت تھا بیٹھے بیٹھے عشاء کی اذان ہونے کو آئی مگر بلال شاہ نہیں لوٹا۔ آخر میں اُکتا کر اُٹھا اور دل میں بلال شاہ کو صلواتیں سناتا گوبندر کی دُکان پر پہنچا۔ یہ دیکھ کر خون کھول گیا کہ بلال شاہ دکان کے عقبی حصے میں شیشے کے چھوٹے سے کیبن میں بیٹھا ٹھاٹ سے کیک پیسٹریاں اور نمک پارے اُڑا رہا ہے۔ ایک دُبلا پتلا چالاک سا شخص جو یقیناً گوبندر تھا بڑے احترام سے اُس کے پاس بیٹھا تھا۔ بلال شاہ مٹکے جیسا سر ہلا ہلا کر اُس کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا مگر منہ سے کچھ نہیں بول رہا تھا۔ منہ کو کھانے کے علاوہ اور فرصت بھی کہاں تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو بلال شاہ بری طرح چونک پڑا۔ میری قہر آلود نظروں کے جواب میں اُس نے منہ والی پیسٹری ثابت نگلی اور دانت نکال کر بولا۔

"آیئے...... آیئے خاں صاحب! یہ گوبندر بڑا بیبا بچہ ہے اس کے پاس ایک گھڑی ہے جو ہم خرید سکتے ہیں۔"

بلال شاہ کی بات سے ظاہر تھا کہ مطلوبہ گھڑی اس وقت دُکان میں موجود ہے۔ نے مزید ڈرامہ مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی مجھے بلال شاہ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ میں شیشے کے کیبن میں داخل ہوتے ہی بلال شاہ کو دھکے سے پیچھے ہٹایا اور سیدھا گوبندر گریبان میں ہاتھ ڈالا۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے اُبلی پڑ رہی تھیں اور چہرہ تاریک تھا۔

"کک...... کیا بات ہے مہا...... راج......" اُس نے ہندوؤں کے خالص لہجے پوچھا۔

میں نے اُس کی گدی پر ایک ہاتھ جمایا اور کہا۔ "مہاراج کے بچے! نکال وہ گھ کہاں ہے؟"

اتنے میں بلال شاہ نے آگے بڑھ کر اُس کے کوٹ کی بالائی جیب سے گھڑی ن لی۔ اس وقت گھڑی خوب چمک رہی تھی۔ لگتا تھا اُسے صاف کیا گیا ہے۔ تاہم شیشہ ا تک ٹوٹا ہوا تھا۔ اتنی دیر میں گوبندر اور اُس کے سیلز مین اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ دکا پولیس کا چھاپہ پڑا ہے اور اب اُن کی خیر نہیں۔ وہ زرد چہروں کے ساتھ سہمے ہوئے کھڑ تھے۔ میں نے اُسی وقت گوبندر اور اُس کے ہیڈ سیلز مین کو ساتھ لیا اور تھانے آ گیا۔

تھانے پہنچتے پہنچتے گوبندر کو اتنی عقل آ چکی تھی کہ اُسے گھڑی کے بارے جھوٹ نہ بولنا چاہیے۔ جھوٹ بول کر اُس کی مشکل میں اضافہ ہی ہو سکتا تھا۔ ہاں اگر وہ صاف صا بتا دیتا کہ اُس نے گھڑی کسی سے خریدی ہے تو کسی حد تک اُس کی بچت ہو سکتی تھی۔ میر توقع کے مطابق تھانے پہنچ کر گوبندر نے سب کچھ صاف بک دیا۔ بہر حال میں اُسے ا آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ اس سے پہلے بھی ایسے منافع وا سودے کرتا رہا ہے۔ میں نے دو کانسٹیبلوں سے کہہ کر اُس کی تھوڑی سی ٹھکائی کروائی اور حوالات میں ڈال دیا۔

اب مسئلہ اُس عورت تک پہنچنے کا تھا۔ ہوشیار دکاندار پرانی چیز خریدتے وقت عم فروخت کنندہ کا نام پتہ نوٹ کر لیتے ہیں اور یہ ہوشیاری گوبندر نے بھی دکھائی تھی۔ اُس ڈائری میں عورت کا مکمل پتہ لکھا ہوا تھا۔ اب خدا بہتر جانتا تھا کہ پتہ غلط ہے یا درست... اس وقت تک رات کے قریباً نو بج چکے تھے میں نے یہ کام صبح پر ڈالنے کی بجائے اُسی وقت

عورت کی طرف روانگی اختیار کی۔ سادہ کپڑے تبدیل کیے بغیر میں اور بلال شاہ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ایک قریبی بستی کی طرف چل دیے۔ ڈھونڈتے پوچھتے ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم زینب نامی اُس عورت کے گھر پہنچے۔ لکڑی کے خستہ دروازے پر پردے کے نام پر کچھ چیتھڑے جھول رہے تھے۔ اندر سے کسی بوڑھے کی کھانسی اور بچے کی ریں ریں ایک ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ بلال کی بھاری بھرکم دستکوں کے جواب میں بوڑھا باہر آیا اور آنکھوں پر ہاتھ کا سائبان بنا کر پریشان نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "بابا! زینب بی بی تیری بہو ہے؟"

بوڑھے نے بے خیالی میں "ہاں" کہا۔ پھر چونکنے کے لہجے میں بولا۔ "کیا بات ہے پترو؟ کون ہو تم؟"

پتر کے خطاب پر بلال شاہ نے اپنی ڈبل توند کو گرم چادر میں چھپانے کی کوشش کی پھر حلیمی لہجے میں بولا۔ "بابا جی! ہم تھانے سے آئے ہیں۔ ضروری کام ہے آپ سے۔"

بوڑھے کے بولنے سے پہلے میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "بابا! تیری بہو پر چوری کا الزام ہے۔ اب جلدی بتا اُس کے ساتھ کس نے تھانے جانا ہے اور کیسے جانا ہے۔"

میرے سخت لہجے نے کھاگ بڈھے کو بوکھلا دیا۔ وہ جو اپنی بہو کے ذکر پر ہمیں بری طرح گھورنے لگا تھا قدرے نرم پڑ گیا...... تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہمیں اپنے گھر کے برآمدے میں ایک خستہ چارپائی پر بٹھا رہا تھا۔ بوڑھے کی آواز پر وہ عورت باہر آ گئی جو اندر بچے کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دو اجنبی مردوں کو سسر کے ساتھ پا کر اُس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ بلب کی مدھم روشنی میں اُس کے خدوخال صاف نظر آ رہے تھے۔ اُسے عورت کہنا زیادتی تھی وہ ایک جوان لڑکی تھی مگر خستہ حالی کی وجہ سے زائد العمر نظر آتی تھی۔ رنگ گندمی تھا۔ آنکھیں کالی اور پُرکشش تھیں۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ ہم پولیس والے ہیں اور اُسے چوری کے الزام میں پکڑنے آئے ہیں تو وہ ایک عام عورت کی طرح خوفزدہ ہو گئی اور انجانے اندیشے آنسو بن کر اُس کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ...... اُس کا خاوند جو مزدوری کرتا تھا۔ ایک سال پہلے سیڑھی سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد سے وہ اپنے بچے کے ساتھ بوڑھے سسر کے ساتھ مقیم ہے اور لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا اور دونوں کا پیٹ پالتی ہے۔

میں نے کہا۔ "جو گھڑی آج دوپہر تم نے بیچی ہے وہ کہاں سے لی تھی؟"

اچانک زینب کی آنکھوں میں خوف کے سائے گہرے ہو گئے۔ "کک...... کون سی

گھڑی؟'' وہ ہکلائی پھر بولی۔''اچھا..... وہ گھڑی، وہ تو مجھے مالکن نے دی تھی۔''

''کس مالکن نے؟''

''جن کے گھر میں کام کرتی ہوں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ آپ..... آپ مالکن سے پوچھ سکتے ہیں۔ انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے مجھے دی تھی۔ وہ صاحب کے لیے نئی گھڑی لائی تھیں..... اور یہ پرانی انہوں نے مجھے دے دی تھی کہتی تھیں رمضان آنے والا ہے۔ تم روزے رکھتی ہو، اس پر ٹائم دیکھ لیا کرنا..... مم..... میں۔''

''ہاں کہو کہو رک کیوں گئیں؟'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔''میں نے سوچا ٹائم کا کیا ہے، مسجد سے آواز آ جاتی ہے۔ اس کو بیچ دیتی ہوں۔ عید کے لیے دو کپڑے کا انتظام ہو جائے گا.....''

میں کچھ دیر گہری نظروں سے اُس کا چہرہ تکنے کے بعد بولا۔''جانتی ہے دو کپڑوں کے انتظام کے لیے جو گھڑی تو بیچی ہے وہ کتنے کی ہے۔''

''جج..... جی، میں نے تو..... بیس روپے میں بیچی ہے۔''

میں نے کہا۔''وہ گھڑی جو تُو نے بیس کی بیچی ہے کم از کم پانچ ہزار کی ہے اور کوئی مالکن اتنی اُلو کی پٹھی نہیں ہو سکتی کہ پانچ ہزار کی گھڑی اُٹھا کر نوکرانی کو دے دے۔'' لڑکی اور اُس کا سسر ہونقوں کی طرح منہ کھولے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔''دیکھ زینب بی بی! تُو بچے والی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تجھے پولیس والوں کے ٹھڈے کھانے پڑیں۔ بھلا اس میں ہے کہ سچ سچ بتا دے یہ گھڑی کہاں سے لی ہے۔''

لڑکی روہانسی آواز میں بولی۔''تھانیدار جی! مجھے میرے بچے کی قسم یہ گھڑی مجھے مالکن نے دی تھی۔''

عورت نے بچے کی قسم کھائی تو مجھے قدرے نرم ہونا پڑا۔ عورت جب اپنے بچے کی قسم کھاتی ہے تو پھر اُس قسم میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔

''اچھا! تیری مالکن اس وقت کہاں ملے گی؟''

جواب میں بوڑھا بولا۔''جناب! سڑک پار نئی آبادی کی کوٹھیاں ہیں۔ وہاں ''صاحب کالونی'' میں کام کرنے جاتی ہے۔ سنت سنگھ نام کا کوئی سرکاری افسر ہے۔ اُس کے ہاں۔''

میں نے بوڑھے کو ڈانٹا کہ وہ صرف لڑکی کو بات کرنے دے۔ لڑکی نے بچے کو چپ کرانے کے لیے کولہے پر اچھالتے ہوئے کہا۔''جناب! وہ ٹیلیفون کے محکمے میں کام کرتے

ہیں۔ 109 صاحب کالونی میں رہتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ابھی آپ کے ساتھ وہاں چل سکتی ہوں۔''

میں نے لڑکی کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سچائی کی جھلک تھی۔ میں نے کہا۔''ٹھیک ہے۔ میں یا میرا کوئی آدمی صبح نو بجے تیرے پاس پہنچ جائے گا۔ تجھے اُس کے ساتھ صاحب کالونی جانا ہو گا لیکن میری ایک بات یاد رکھ اگر تُو نے یا کسی اور نے صبح نو بجے سے پہلے گھر سے نکلنے کی کوشش کی تو بہت برا ہو گا۔''

بوڑھے نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔''اللہ نہ کرے جی کہ ہم آپ کا حکم توڑیں۔ آپ جیسا کہتے ہیں ویسا ہی ہو گا۔''

میں اور بلال شاہ تھانے واپس آ گئے۔ اگلے روز نو بجے سے پہلے ہی علاقے کے ڈی ایس پی صاحب میرے تھانے پہنچ گئے۔ دراصل انہیں پانچ ہزار کی گھڑی یہاں کھینچ لائی تھی، واقعی یہ ایک دلچسپ اور حیران کن کیس تھا اور وہ اس میں ذاتی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں گھڑی دکھائی اور اب تک ہونے والی پیش رفت سے آگاہ کیا۔ ڈی ایس پی صاحب حوالاتی گوبندر سے بھی ملے اور مختلف سوالات کیے۔ اس دوران انہوں نے مجھے اپنی جیپ کی چابی دی اور کہا کہ میں تفتیش کے لیے خود ''صاحب کالونی'' جاؤں۔

ایک سب انسپکٹر اور کانسٹیبل کے ساتھ میں زینب کے گھر پہنچا اور اُسے ساتھ لے کر صاحب کالونی کا رُخ کیا۔ ہم سادہ لباس میں تھے۔ ہماری جیپ ایک چھوٹے سے خوشنما بنگلے کے سامنے پہنچ کر رکی۔ گیٹ پر ایس ڈی او سنت سنگھ کے نام کی پلیٹ لگی تھی۔ ملازمہ زینب ہمیں پہلے ہی بتا چکی تھی کہ مالک آج کل شہر سے باہر ہیں۔ گھر میں ان کی بیوی کملا اور ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ ہم نے کال بیل بجائی تو کملا خود دروازہ کھولنے پہنچی۔ وہ ایک جوان اور حسین عورت تھی۔ اُس نے ساڑھی پہن رکھی تھی اور بال بڑے سلیقے سے جوڑے کی صورت باندھ رکھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ پہلے جھجکی پھر آنچل سے سر ڈھانپتے ہوئے شائستگی سے بولی۔

''جی فرمایئے؟''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی اُس کی نگاہ اپنی نوکرانی زینب پر پڑ گئی اور اُس کے چہرے پر اضطراب نظر آنے لگا میں نے کہا۔

''بی بی! میں پولیس انسپکٹر ہوں اور آپ سے کچھ ضروری سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

کملا گھبرا کر بولی۔ ’’گھر میں اس وقت کوئی مرد نہیں۔‘‘ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔
’’اچھا ٹھہریے! میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتی ہوں۔‘‘ اُس وقت کے رواج کے مطابق عموماً ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا۔ کملا نے دروازہ کھولا اور ہم نے خود کو ایک سجے سجائے کمرے میں پایا۔ سجاوٹ سے نفاست اور سادگی کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک کارنس پر سنت سنگھ کی فریم شدہ تصویر پڑی تھی۔ یہ تصویر دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک خوبرو اور صحت مند آدمی ہے۔

کملا کی ساس ہمارے لیے چائے بنانے لگی اور خود کملا ہمارے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کا شوہر سرکاری کام سے دوسرے شہر گیا ہوا ہے اور اُس کی آمد آج کل میں متوقع ہے۔

میں نے جیب سے گھڑی نکالی اور کملا کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ’’یہ گھڑی آپ نے اپنی ملازمہ کو دی تھی؟‘‘

کملا نے گھڑی کو دیکھتے ساتھ ہی پہچان لیا۔ وہ حیرت سے میرا چہرہ تکتی رہی پھر بولی۔
’’جی ہاں...... میں نے خود دی تھی۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’کیوں؟‘‘

وہ جھجک کر بولی۔ ’’یہ ذاتی سا سوال ہے...... بہرحال آپ پوچھ رہے ہیں تو بتا دیتی ہوں۔ چند دن بعد ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے۔ میں نے اُن کو بطور تحفہ دینے کے لیے ایک نئی گھڑی خریدی، یہ پرانی گھڑی میں نے فالتو سمجھ کر زینب کو دے دی۔‘‘

’’ٹھیک، یعنی آپ نے یہ گھڑی فالتو سمجھ کر زینب کو دے دی۔ خیر سے آپ کے شوہر ماہانہ کیا کما لیتے ہیں؟‘‘

میرے لہجے نے اُسے ہراساں کر دیا۔ وہ بولی۔ ’’مم...... مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے آپ ایسے سوال ان ہی سے پوچھیں تو بہتر ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’پھر بھی آپ اُن کی بیگم ہیں۔ کچھ تو اندازہ ہوگا۔‘‘

وہ الجھے لہجے میں بولی۔ ’’یہی کوئی...... چار پانچ سو تنخواہ ہوگی۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’حیرت ہے آپ کے شوہر کی تنخواہ چار پانچ سو روپے ہے اور آپ اپنی ملازمہ کو پانچ ہزار کی گھڑی بخشش میں دے رہی ہیں۔‘‘

’’پانچ ہزار کی گھڑی؟‘‘ کملا جیسے اپنی جگہ سے اُچھل پڑی۔

میں نے کہا۔ ’’جی ہاں! ایک ایس ڈی او کی بیوی پانچ ہزار کی گھڑی اپنی ملازمہ کو

دے ڈالے تو اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔‘‘

کملا گھبرا کر بولی۔ ’’انسپکٹر صاحب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ یہ تو ایک معمولی گھڑی ہے انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ عام سی گھڑی ہے۔ پچھلے سوموار کو جب وہ اپنے سرکاری کام پر جانے کی تیاری کر رہے تھے یہ باتھ روم کے پختہ فرش پر گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اسے یہیں چھوڑ گئے۔ میں نے سوچا کہ مرمت کراتے پھریں گے اس لیے نئی گھڑی خرید لی۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ کے شوہر کو ابھی تک علم نہیں کہ آپ ان کی گھڑی بخشش میں دے چکی ہیں۔‘‘

کملا بولی۔ ’’میں نے آپ کو بتایا نا کہ یہ واقعہ اُن کے جانے کے بعد ہوا۔ وہ ابھی تک اپنے کام سے واپس ہی نہیں لوٹے۔‘‘

صورت حال اب کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ سنت سنگھ نے اپنی بیوی کو بھی گھڑی کی اصل قدر و قیمت سے بے خبر رکھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُس کی غیر موجودگی میں بیوی نے انتہائی قیمتی گھڑی خیرات کر ڈالی تھی...... ابھی ہم کملا سے سوال و جواب میں مصروف تھے کہ کال بیل بجنے لگی۔ میری ہدایت پر سب انسپکٹر اُٹھ کر باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک حیران و پریشان شخص کو لیے اندر داخل ہوا، پتلون کوٹ میں ملبوس یہ ایک خوبرو سکھ تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں ساڑھی کا ایک ڈبہ تھا۔ چہرے پر گرد و غبار تھا اور تھکن کا احساس ہوتا تھا۔ یہ سنت سنگھ تھا جو اپنے دفتری ٹور کے بعد گھر واپس لوٹا تھا۔ اپنی نو بیاہتا بیوی اور ساس کو پولیس والوں کے گھیرے میں پا کر اُس کا ہراساں ہونا یقینی تھا۔ خوبصورت کملا اُسے دیکھ کر سسکنے لگی۔ اُس کی ماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’بیٹا سنت! تھانیدار صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟‘‘

سنت سنگھ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے جیب سے گھڑی نکالی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر کہا۔ ’’سنت صاحب! یہ گھڑی آپ نے کہاں سے لی؟‘‘

گھڑی دیکھ کر سنت کے چہرے نے کئی رنگ بدلے وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ’’انسپکٹر! میں سمجھا نہیں۔‘‘

کملا نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ’’ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس گھڑی کی قیمت پانچ ہزار ہے اور یہ آپ نے ناجائز کمائی سے خریدی ہے۔‘‘

سنت سنگھ نے بوکھلا کر کہا۔ ’’آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے انسپکٹر! اس کی قیمت پانچ ہزار نہیں...... زیادہ سے زیادہ چار ساڑھے چار سو روپیہ ہوگی...... لیکن...... لیکن یہ آپ کے

پاس کیسے پہنچی؟''

میں نے کہا۔''اگر اس کی قیمت ساڑھے چار سو روپیہ ہے تو پھر یہ کسی طرح بھی میرے پاس پہنچ سکتی تھی لیکن اگر یہ پانچ ہزار کی ہے تو پھر تمہاری حیرت بجا ہے۔''

اب سنت سنگھ بوکھلا کر کبھی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی میری طرف میں نے کہا۔

''ایس ڈی او سنت سنگھ تمہیں میرے ساتھ کچھ دیر کے لیے تھانے چلنا ہوگا۔''

میرے اس فقرے نے جہاں سنت سنگھ کا رنگ اڑا دیا وہاں کملا کو بھی سسکنے پر مجبور کر دیا۔ سنت کی ماں فریادی لہجے میں بولی۔

''تھانیدار صاحب! میرا سنت بالکل بے قصور ہے۔ گرو کی سوگند یہ کبھی حرام کا ایک پیسہ بھی گھر میں نہیں لایا۔''

میں نے بڑھیا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سنت سنگھ سے کہا۔

''بالفرض ہم مان لیں کہ یہ گھڑی اتنی قیمتی نہیں جتنی ہم کہہ رہے ہیں تو کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ یہ گھڑی تم نے کہاں سے خریدی؟''

اُس نے امرتسر کے ہی ایک بازار کا نام لیا۔ میں نے پوچھا۔''رسید وغیرہ ہے؟'' وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا۔''دکان تو تمہیں یاد ہوگی چلو ہمارے ساتھ، ابھی تصدیق ہو جائے گی۔''

عجب تذبذب اور خوف کے عالم میں اُس نے ماں اور بیوی کو دیکھا اور ہمارے ساتھ جانے کو اُٹھ کھڑا ہوا۔ بوکھلاہٹ میں ساڑھی کا ڈبہ اس کے ہاتھ سے گر کر کھل گیا اور نہایت قیمتی ساڑھی فرش پر پھیل کر اُس کا منہ چڑھانے لگی۔ ساڑھی کے ڈبے میں لپ اسٹک اور میک اپ کا کچھ دوسرا سامان بھی تھا، یہ سب کچھ جو سنت سنگھ نے بڑے چاؤ سے بیوی کو پیش کرنا تھا، فرش پر بکھر کر اُن کی حسرت میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں نے سنت کو ساتھ لیا۔ جانے سے پہلے اُس نے بیوی کو کسی ضمانتی کے بارے بتایا اور کہا کہ ٹیلیفون پر اُس سے فوراً رابطہ قائم کرے۔ بیوی فون کرنے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور ہم سنت سنگھ کو لے کر جیپ میں آ بیٹھے۔

جیپ سنت سنگھ کے بتائے ہوئے بازار کی جانب روانہ ہوئی مگر ابھی ہم نصف راستے میں تھے کہ سنت سنگھ نے اپنے جھوٹ کا اعتراف کر لیا۔ اُس نے کہا کہ گھڑی اُس نے خریدی نہیں تھی بلکہ ایک دوست نے تحفے میں دی تھی۔

میں نے کہا۔''تم مانتے ہو کہ گھڑی کی قیمت وہی ہے جو ہم نے بتائی ہے۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔''جی ہاں۔''

میں نے کہا۔''تمہیں اپنے اُس دوست کا پتہ بتانا ہوگا جو اتنا صاحبِ استطاعت ہے کہ تمہیں پانچ چھ ہزار کی گھڑی گفٹ کر سکے۔''

سنت سنگھ کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر پریشانیوں نے ڈیرے ڈال لیے۔ کہنے لگا ''میرا وہ دوست انگلینڈ جا چکا ہے۔''

میں نے کہا۔''دوست انگلینڈ جا چکا ہے تو اُس کے والی وارث تو یہاں ہوں گے۔ ہمیں اُن سے ملواؤ ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر سب پتہ چل جائے گا۔''

تھانہ میں پہنچ کر سنت سنگھ نے ہمیں شوبھا سنگھ نامی ایک ادویات فروش کا پتہ بتایا۔ میں نے اپنے سب انسپکٹر کو دو ماتحتوں کے ساتھ بھیجا۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہ چوڑے ماتھے والے ایک فربہ اندام شخص کو تھانے لے آئے۔ یہ شوبھا سنگھ کا باپ تھا۔

میں نے اُس سے کہا۔''تمہارے لڑکے کے دوست سنت سنگھ سے ایک گھڑی برآمد ہوئی ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ گھڑی اُسے تمہارے لڑکے نے دی تھی۔''

شوبھا سنگھ کے باپ نے ہنستے ہوئے کہا۔''تھانیدار صاحب! کیوں مذاق کرتے ہیں۔ اُس نکھٹو کی اتنی پسلی کہاں تھی کہ پانچ پانچ ہزار کی گھڑیاں دوستوں کو دے سکتا۔ وہ تو دُکان کا کرایہ بھی مجھ سے لے کر دیا کرتا تھا۔ اگر اتنا ہی خوشحال ہوتا تو بحری جہاز کا چوڑا بن کر کالے پانی نہ جاتا۔''

میں نے کہا۔''کیا مطلب وہ انگلینڈ میں نہیں ہے؟''

وہ بولا۔''کہاں جی! کہاں کا انگلینڈ۔ وہ تو ایک بحری جہاز پر صفائی کا کام کرتا ہے۔ ابھی پرسوں خط آیا تھا بڑی تنگی کے دن گزار رہا ہے۔''

میں نے کہا۔''سنت سنگھ سے تمہارے بیٹے کا کیا رشتہ تھا؟''

وہ بڑے بوڑھوں کے انداز میں بگڑ کر بولا۔''رشتہ وہی تھا جو ایک نکھٹو کا دوسرے نکھٹو سے ہوتا ہے۔ وہ دُکان پر بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا تھا۔ یہ دفتر سے چھٹی کر کے اس کے پاس آ بیٹھتا تھا۔ پھر جب اس پر فراڈ کا کیس بنا تو میں نے شوبھا سنگھ کو سختی سے منع کر دیا کہ اس کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا بند کر دے۔''

''کس پر فراڈ کا کیس بنا تھا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''اسی سنت سنگھ پر جی!'' جہاندیدہ سکھ نے آنکھیں گھما کر کہا۔''آپ کو معلوم نہیں؟ حیرت ہے۔ اس نے ٹیلیفون کے محکمے سے تانبے کی تار چرا لی تھی۔ کئی ہزار کا چکر تھا کوئی

ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے یہ...... میرا خیال ہے ابھی تک کیس چل رہا ہے۔''

یہ میرے لیے نیا انکشاف تھا۔ میں نے مزید سوالات کے بعد شوبھا سنگھ کے باپ کو تو واپس بھیج دیا اور فوری طور پر سنت سنگھ کے محکمے سے رابطہ قائم کیا۔ میں بذات خود ٹیلیفون کے دفتر پہنچا اور سنت سنگھ کے ایک افسر سے ملاقات کی۔ اس شخص کی زبانی پتہ چلا کہ سنت کے خلاف سیشن کورٹ میں ایک مقدمہ زیر سماعت ہے اس مقدمے میں سنت سنگھ کے علاوہ محکمے کے ایک اسٹور کیپر کو بھی فریق بنایا گیا ہے۔

میں نے اس افسر سے کہا کہ میں کیس کی تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔ اُس نے مجھے محکمے کے ایک قانونی ماہر کے پاس بھیج دیا۔ اس ماہر نے جو معلومات فراہم کیں ان سے پتہ چلا کہ ڈیڑھ برس پہلے محکمے کے گودام سے ٹیلیفون کی سینکڑوں فٹ تار غائب ہوگئی تھی۔ اس تار کی حفاظت چونکہ سنت سنگھ کی ذمے داری تھی۔ اس لیے اُس پر شک کیا گیا۔ کیس عدالت میں پہنچا اور سنت سنگھ نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ اُس کی نیک نامی سے جلنے والے کچھ لوگوں نے اُسے دانستہ طور پر پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک ایماندار ملازم ہے اور اُس نے کسی موقعے پر بددیانتی سے کام نہیں لیا۔

اب صورت یہ تھی کہ میرے پاس سنت سنگھ کے خلاف ایک ٹھوس ثبوت موجود تھا اور اگر میں یہ ثبوت متعلقہ محکمے کو پیش کر دیتا تو سنت کے خلاف فراڈ کیس بے حد مضبوط ہو جاتا اور عین ممکن تھا وہ پانچ ہزار کی گھڑی اُسے پانچ چھ برس کے لیے جیل بھیج دیتی۔

اگلے روز میں تھانے میں سنت سنگھ سے پوچھ گچھ میں مصروف تھا کہ سنتری نے ایک ملاقاتی کی اطلاع دی۔ اُس نے بتایا کہ ایک عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میرے ذہن میں فوراً سنت کی بیوی کملا کا خیال آیا۔ میں نے سمجھا وہ کسی ضمانتی کو لے کر آئی ہے مگر میرے پوچھنے پر سنتری نے بتایا کہ عورت اکیلی ہے۔ میں اُلجھن کا شکار دوسرے کمرے میں پہنچا تو کملا اپنے لمبے بال پشت پر پھیلائے کرسی پر بیٹھی تھی۔ سادہ سی ساڑھی میں وہ کسی ہندی فلم کی ہیروئن نظر آتی تھی۔ اُسے تنہا دیکھ کر میرے ذہن میں اندیشہ جاگا کہ کہیں وہ مجھے کوئی غلط راستہ تو دکھانا نہیں چاہتی۔ اُس کے ساتھ کسی مرد ضمانتی کا نہ ہونا غیر معمولی امر تھا۔ بہرحال میں اُس کے سامنے کرسی پر جا بیٹھا۔ اُسے چائے کی پیش کش کی جو اُس نے بڑی شائستگی سے رد کر دی۔

میں نے کہا۔ ''فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''وہ کہاں ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''فی الحال وہ تھانے میں ہیں۔ میں تیزی سے تفتیش کر رہا ہوں۔ ایک آدھ دن میں بات کھل جائے گی۔''

کہنے لگی۔ ''آپ نے اُن کا کتنا ریمانڈ لیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سات روز کا۔ ضرورت پڑی تو مزید بھی لیا جا سکتا ہے۔''

اپنے پرس سے اُس نے کچھ دوائیاں نکالیں اور گلوگیر آواز میں بولی۔ ''یہ اُن تک پہنچا دیجیے۔ انہیں دمے کی تکلیف ہے اور سردی میں وہ باقاعدگی سے دوائی کھاتے ہیں۔''

میں نے بے دلی سے دوائی رکھ لی۔ دوائی پہنچا کر اُس نے بالواسطہ مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ میں سنت سنگھ پر سختی نہ کروں کیونکہ وہ مریض ہے۔ وہ شکل وصورت سے تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکی لگتی تھی۔ میں حیران ہو رہا تھا وہ ابھی تک شوہر کے لیے کسی ضمانتی کا انتظام کیوں نہیں کر سکی۔

کملا نے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں...... میں اپنے شوہر سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ اتنی کہ شاید آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' وہ رومال آنکھوں پر رکھ کر سسکنے لگی۔ میں سمجھا کہ اب وہ اُس کے لیے رحم کی التجائیں کرے گی۔ مگر وہ آنسو پونچھ کر ٹھوس لہجے میں بولی۔

''انسپکٹر صاحب! میں شک کی آگ میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے شوہر کا دامن ہر غلاظت سے پاک دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرا شوہر آج تک مجھے اس بات کا یقین دلاتا رہا ہے کہ اس کے خلاف بدعنوانی کا جھوٹا کیس بنایا گیا تھا اور میں صدق دل سے اُس کی بات پر یقین کرتی رہی ہوں۔ مجھے یہ بھروسہ اور مان رہا ہے کہ میرا شوہر مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا، مگر اب...... اُس گھڑی نے میرے دل میں شک کا بیج بو دیا ہے۔ اگر اُس نے ہمیشہ حلال کی روزی کمائی ہے تو یہ گھڑی اُس کے پاس کہاں سے آئی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس معاملے کی پوری تحقیق کریں میں گرو سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ میرا شوہر نردوش ثابت ہو اور میری زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے۔''

کملا کے جذبات نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے کہا۔ ''بی بی! تم سکون سے گھر جاؤ۔ میں عام پولیس والوں سے ذرا مختلف شخص ہوں۔ گالی گلوچ اور مار پٹائی سے نفرت کرتا ہوں۔ تمہارا شوہر اگر مجرم ہے تو اُس کی سزا کورٹ سے شروع ہوگی۔ تھانے سے نہیں۔''

وہ مجھے احسان مندی کی نظروں سے دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اس دوران میرے بلاوے پر اُس تھانے کا انسپکٹر بھی پہنچ گیا جہاں ڈیڑھ سال پہلے سنت سنگھ کے خلاف چوری کا

پرچہ درج ہوا تھا۔ ہم دونوں نے حوالات میں سنت سنگھ سے پوچھ گچھ شروع کی

☆======☆======☆

پانچ چھ دن میں حالات کیا سے کیا ہو گئے۔ سنت سنگھ کو اس تھانے میں منتقل
جہاں اُس کے خلاف چوری کا پرچہ کٹا تھا۔ وہاں کے انسپکٹر نے جو ایک سخت گ
سنگھ پر ہر حربہ آزمایا لیکن اُس نے کچھ نہیں بتایا کہ وہ قیمتی گھڑی اُس کے پاس
یہاں تک کہ تشدد کے سبب اُس کا پرانا مرض عود کر آیا اور اُسے مقامی ہسپتال پہنچ
ہزار کی رقم کچھ معمولی نہیں تھی اور اب صاف محسوس ہو رہا تھا کہ سنت سنگھ چوری
سزا پائے گا۔''

☆======☆======☆

ایک روز میں تھانے میں بیٹھا اسی کیس کی اونچ نیچ پر غور کر رہا تھا کہ اچانک ایک خیال ذہن میں آیا۔ عین ممکن تھا کہ یہ گھڑی واقعی سنت سنگھ کو تحفے میں ملی ہو لیکن دوست کی بجائے کسی ''سہیلی'' نے دی ہو اس لیے سنت سنگھ اُس ''دوست'' کا نام بتانے سے انکار کر رہا ہو اسی سبب اُس نے اپنی بیوی کو گھڑی کی اصل قیمت نہ بتائی ہو...... یہ خیال میرے ذہن میں بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں نہیں آیا تھا۔ شاید اس کی وجہ کملا تھی۔ اُس جیسی خوبصورت عورت کی موجودگی میں شوہر نامدار ادھر اُدھر منہ مارنے کا کم ہی سوچتا ہے۔ بہر حال مردوں سے بعید کچھ نہیں اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ سنت سنگھ کی شادی سے پہلے کا کوئی چکر ہو۔ میں نے فوراً سوچا کہ اس آئیڈیے سے اُس سکھ انسپکٹر کو آگاہ کرنا چاہیے جو سنت سنگھ کا کیس ڈیل کر رہا ہے مگر پھر دل نہیں مانا۔ اُس اجڈ انسپکٹر سے مار پٹائی کے علاوہ اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے آواز دے کر اپنے مخبر بلال شاہ کو بلایا وہ باہر دھوپ میں بیٹھا مفت کے گنے اپنے منہ کے بیلنے میں سے گزار رہا تھا۔ میرے بلاوے پر اندر آیا تو گنے کا چھلکا ابھی تک اس کے منہ میں تھا اور مسواک کی طرح حرکت کر رہا تھا۔

میں نے بلال شاہ سے کہا۔ ''بلال اُس روز تجھے اُس عورت پر بڑا ترس آیا تھا نا جو ایس ڈی او سنت سنگھ کے لیے دوائیاں لے کر آئی تھی۔''

بلال شاہ بولا۔ ''یہی تو اپنے ساتھ مصیبت ہے خان صاحب! اللہ کی بنائی ہوئی ہر خوبصورت چیز پر ترس آ جاتا ہے۔ ویسے یہ ایس ڈی او تو ویسے بھی بھلا مانس شخص ہے۔ میرا دل تو گواہی دیتا ہے کہ اسے پھنسایا گیا ہے۔ ایک آدمی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے ساتھی اسے رشوت کا رستہ دکھاتے تھے۔ یہ نہیں مانا تو انہوں نے کیس ڈال دیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سب کچھ تو عدالت جان لے گی۔ ہاں اگر تُو اس کی کچھ مدد کرنا چاہتا ہے تو ایک کام کر سکتا ہے۔''

''وہ کیا؟'' بلال شاہ نے اللہ کے بنائے ہوئے خوبصورت گنے کو دانتوں سے

اُدھیڑتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''ایسا کر کہ سنت سنگھ کے دفتر یا محلے سے اُس کے کسی بے تکلف دوست کا کھوج لگا اور یہ پتہ چلانے کی کوشش کر کہ شادی سے پہلے یا شادی کے بعد اُس کے کسی لڑکی سے تعلقات تو نہیں رہے......''

کام دلچسپ تھا اس لیے بلال شاہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

......پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ آخر ایک روز بلال شاہ دبلے پتلے سے ایک نوجوان کے ساتھ تھانے پہنچا۔ اُس نے تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ''اس کا نام شوبھا سنگھ ہے۔ بحری جہاز میں ملازمت کرتا ہے۔ پرسوں ہی دو ماہ کی چھٹی پر پہنچا ہے۔ سنت سنگھ کا گہرا دوست ہے۔''

میں شوبھا سنگھ کے بارے پہلے ہی جانتا تھا لہٰذا مزید سوالات کی ضرورت پیش نہ آئی۔ شوبھا سنگھ، سنت سنگھ کی گرفتاری سے آگاہ ہو چکا تھا اور اُس کے متعلق خاصا پریشان تھا۔ سنت سنگھ والی گھڑی ابھی تک میری تحویل میں تھی۔ میں نے شوبھا کو گھڑی دکھائی تو وہ اُسے پہچان نہ سکا۔

اُس نے کہا کہ اُس نے سنت سنگھ کو آخری بار ڈیڑھ سال قبل دیکھا تھا اور اُس وقت سنت کے پاس یہ گھڑی نہیں تھی۔ میں نے شوبھا سنگھ سے سنت کی رومانی زندگی کے بارے سوالات شروع کیے۔ وہ پہلے تو چھپاتا رہا مگر جب اُس نے محسوس کیا کہ میں سنت کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہوں تو اُس نے بہت کچھ بتا دیا۔ اُس کے مطابق شادی سے پہلے سنت کے دو تین لڑکیوں سے مراسم رہے تھے، لیکن ان میں تنوجہ نامی ایک سکھ لڑکی سے اُس کے گہرے مراسم تھے۔ یہ بتا کر شوبھا سنگھ نے مجھے حیران کر دیا کہ تنوجہ کا تعلق امرتسر کے پانچ امیر ترین گھرانوں میں سے ایک گھرانے سے تھا۔ وہ لکھ پتی کارخانے دار کی بیٹی تھی۔ اُس کا باپ سیٹھ پھول سنگھ عرف پٹیالے والا شراب اور کیمیکل کے کئی کارخانوں کا مالک تھا۔ اُس کی بیٹی سے سنت سنگھ کے تعلق کا سن کر مجھے محسوس ہوا کہ اِس کیس کی گمشدہ کڑیاں ملنے والی ہیں۔ میں نے شوبھا سنگھ کو رازداری کا پابند کر کے رخصت کر دیا اور ضروری تیاری کے بعد سیٹھ پٹیالے والا کی طرف روانہ ہوا۔

سیٹھ کی شاندار کوٹھی شہر کے مضافات میں واقع تھی۔ یہ اُس کی اپنی زمینیں تھیں اور بڑی سڑک سے رہائش گاہ تک سیٹھ نے اپنے خرچ پر پختہ سڑک بنوا رکھی تھی۔ میں موٹر سائیکل سے اتر کر کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو اندر بے حد خوبصورت لان میں ایک نوجوان

لڑکا اور لڑکی ٹینس کھیلنے میں مصروف تھے۔ دونوں نے تنگ نیکریں پہن رکھی تھیں۔ لڑکے نے نیلے رنگ کی پگڑی اور لڑکی نے گلابی رنگ کا ربن باندھ رکھا تھا۔ سفید وردی اور طرے دار پگڑی والا ایک ملازم نیٹ کے پاس مؤدب کھڑا تھا۔ میں سادہ لباس میں پہنچا تھا اس لیے کوٹھی کے لحیم شحیم چوکیدار نے مجھے کڑی نظروں سے گھورا۔ میں نے سیٹھ کا پوچھا۔ تو چوکیدار نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ میں نے کہا۔ ''میں اُن کی صاحبزادی مس تنوجہ سے ملنا چاہوں گا۔'' چوکیدار نے ایک بار پھر مجھے نظروں سے گھورا پھر لڑکی کے پاس جا کر کچھ کہا۔ لڑکی نے ایک لمحے کے لیے کھیل روک دیا میری طرف دیکھا۔ پہچاننے میں ناکام ہوئی تو برا سا منہ بنا کر کچھ بڑبڑائی اور چوکیدار تیز قدموں سے میری طرف لوٹ آیا۔

''کیا نام ہے تمہارا۔ کس کام سے ملنا ہے؟'' اُس نے کرخت لہجے میں ایک ساتھ دو سوال پوچھے۔ میرا ذہن شرارت پر آمادہ ہوا۔ میں نے کاغذ کے ایک پرزے پر سنت سنگھ کے الفاظ لکھ کر بھیج دیا۔ اس دفعہ نتیجہ بالکل مختلف نکلا۔ چوکیدار کا دیا ہوا پرزہ دیکھتے ہی لڑکی کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اُس نے اپنے پارٹنر سے کچھ کہا۔ وہ ستانے کے لیے رنگین چھتری کے نیچے جا بیٹھا۔ لڑکی جو تنوجہ تھی مضطربانہ چال چلتی گیٹ پر پہنچی۔ جوبن اُس پر ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ گردن اور چہرا پسینے سے شرابور تھے۔ کچھ دیر مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر پُر اندیش آواز میں بولی۔

''کیا بات ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ بہت سنگین معاملہ ہے کچھ وقت چاہتا ہوں۔''

اُس کے نازک ہونٹ لرزنے لگے۔ گھوم کر لان کی طرف دیکھا پھر بولی۔

''اس وقت میرے شوہر ساتھ ہیں۔ کل گیارہ بجے سے دو بجے کے درمیان آ جانا۔ میں چوکیدار سے کہہ دوں گی۔ وہ تمہیں روکے گا نہیں۔''

میں شکریہ ادا کر کے واپس موٹر سائیکل کی طرف لوٹ آیا۔

☆======☆======☆

اگلے دن ٹھیک بارہ بجے میں کوٹھی کے وسیع ڈرائنگ روم میں تنوجہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ گیراج خالی تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تنوجہ کے شوہر کے علاوہ اُس کا باپ بھی گھر میں موجود نہیں۔ وہ گھڑی جو میں ساتھ لایا تھا سامنے شیشے کی تپائی پر پڑی تھی اور تنوجہ یک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ آخر وہ لرزاں آواز میں بولی۔

"یہ آپ کو کہاں سے ملی؟"

"سنت سنگھ سے۔ وہ سخت مصیبت میں گرفتار ہے۔"

"کیا ہوا اُسے۔" تنوجہ تڑپ کر بولی۔

میں نے گھڑی برآمد ہونے سے لے کر سنت کے گرفتار ہونے تک تمام واقعات اُسے سنا دیے۔ وہ بھیگی آنکھوں سے سب کچھ سنتی رہی۔ یہ جان کر اُس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا کہ اُسے بدنامی سے بچانے کے لیے سنت نے پولیس کا بے پناہ تشدد برداشت کیا ہے اور اپنا پورا کیریئر داؤ پر لگا رکھا ہے (اور اگر وہ واقعی حوصلہ ہار کر تنوجہ کا نام زبان پر لے آتا تو سیٹھ پھول سنگھ کی بدنامی دور دور تک پھیل جاتی) جب میں نے بات ختم کی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے اٹھی اور ایک الماری سے نوٹوں کی گڈی نکال لائی۔ میرے سامنے رکھ کر بولی۔

انسپکٹر! یہ سب کچھ رکھ لو اور جیسے بھی ہو سنتو کو اس مصیبت سے نکالنے کی کوشش کرو۔ وہ بے قصور ہے، نردوش ہے۔ یہ گھڑی میں نے ہی اُسے گفٹ کی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا میری زندگی کا یہ پہلا اور آخری تحفہ اُس کے لیے وبالِ جان بن جائے گا۔"

میں نے نوٹ سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "برائے مہربانی! آپ یہ رقم اپنے پاس رکھیں اور مجھ سے کوئی تعاون چاہتی ہیں تو بس اتنا کریں کہ تمام حالات سے مجھے تفصیلی آگاہ کریں۔"

میرے روکھے اور تحکمانہ لہجے کا برا منائے تنوجہ مجھے اپنی روئیداد سنانے لگی۔ تفصیل کے لیے تو کئی صفحے درکار ہوں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کالج کے زمانے سے تنوجہ سنت سنگھ سے پیار کرتی تھی۔ مگر ظالم سماج اُن کے راستے میں آیا اور آخر دونوں کو اپنی راہیں جدا کرنا پڑیں۔ جدائی کا سفر شروع کرنے سے پہلے تنوجہ نے اپنے محبوب کو پہلا اور آخری تحفہ دیا تھا۔ اُس کے انمول محبوب کی طرح یہ گھڑی بھی لاکھوں میں ایک تھی۔ بعد ازاں سنت کی شادی ہوگئی اور کچھ عرصہ بعد تنوجہ کی بھی۔ اب وہ ایک دوسرے کو صرف اپنی نیک تمناؤں میں یاد رکھے ہوئے تھے۔ تنوجہ نے اپنے رومانس کی تفصیلات بتاتے ہوئے ایک اور اہم انکشاف کیا۔ غالباً وہ خاصی جذباتی ہوگئی تھی اور جذبات کی رو میں اس نے مجھے بتایا کہ اُسے شک ہے کہ سنت پر بننے والے کیس میں اُس کے پتا کا ہاتھ ہے۔ کیونکہ اگر وہ کیس نہ بنتا تو عین ممکن تھا وہ دونوں اپنی منزل پانے میں کامیاب ہو جاتے۔ سنگھ پر کیس بننے کی وجہ سے وہ باپ کے سامنے لاجواب ہوگئی اور اُس کی منگنی ایک اور جگہ کر دی گئی۔

میں نے اس سلسلے میں تنوجہ کو مزید کریدنا چاہا مگر اچانک وہ دوبارہ اپنے خول میں چھپ گئی۔ شاید اُسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ روانی میں مجھے ضرورت سے زیادہ بتا گئی ہے۔ کچھ بھی تھا آخر سیٹھ پھول سنگھ اُس کا باپ تھا اور وہ اُس کی برائی نہیں کرسکتی تھی۔

میں قریباً ڈیڑھ گھنٹہ تنوجہ کے پاس بیٹھا رہا۔ آخر اس وعدے کے ساتھ واپس رخصت ہوا کہ سنت سنگھ کے لیے مجھ سے جو بھی بن سکا ضرور کروں گا...... انہی سوچوں میں گم میں اپنی موٹر سائیکل تک پہنچا اور بڑی سڑک کی طرف روانہ ہوگیا۔ گھڑی کا معمہ تو تقریباً حل ہوگیا تھا مگر سنت سنگھ کو سزا سے بچانے کے لیے اور باعزت بری کرانے کے لیے ضروری تھا کہ محکمہ ٹیلیفون کے اصل چور کا سراغ لگایا جاتا، اور ثابت کیا جاتا کہ سنت بے گناہ ہے۔ مگر یہ سر کھپائی کا کام تھا اور چونکہ کیس میرے تھانے سے ٹرانسفر ہو چکا تھا اس لیے میں یہ دردِ سر مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا تھا کہ متعلقہ انسپکٹر کو اپنی حاصل کردہ معلومات سے آگاہ کردوں۔ اُسے بتادوں کہ یہ گھڑی دراصل سنت سنگھ کے پاس کیسے پہنچی تھی اور یہ اشارہ بھی دے دوں کہ سنت کی محبوبہ یعنی تنوجہ کے باپ کا اس معاملے میں ہاتھ ہو سکتا ہے اور اگر رازداری سے سیٹھ پھول سنگھ کے بارے معلومات حاصل کی جائیں تو ممکن ہے اس گتھی کا سرا ہاتھ آجائے۔

میں یہ طول طویل پروگرام بنا رہا تھا اور قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ اس گتھی کا سرا چند ہی لمحوں میں خود بخود میرے ہاتھ آنے والا تھا...... میں اپنے خیالوں میں مگن بڑی سڑک پر پہنچا تو ایک سکوٹر سوار سیٹھ پھول عرف پٹیالہ والا کے گھر کی طرف مڑتا نظر آیا۔ کیونکہ یہ ذیلی سڑک صرف سیٹھ کی رہائش گاہ تک جاتی تھی۔ لہٰذا شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ شخص سیٹھ کے پاس جا رہا ہے۔ جس چیز نے مجھے چونکایا وہ سکوٹر سوار کی جانی پہچانی صورت تھی۔ میں نے سکوٹر سوار کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی مگر میری نگاہ دھوکہ نہیں کھا سکتی تھی۔ وہ ایس ڈی او سنت سنگھ کا سابق اسسٹنٹ راجیو کمار تھا۔ میں نے صرف دو روز پیشتر اُسے عدالت میں دیکھا تھا۔ سنت سنگھ کیس کے سلسلے میں وہ استغاثہ کا گواہ تھا۔ وکیل صفائی نے اُس پر کڑی جرح کی تھی مگر وہ اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا تھا کہ وقوعہ کے روز سنت سنگھ نے اُسے زبردستی ایک غیر سرکاری اور غیر ضروری کام پر بھیج دیا تھا اور بعد ازاں سٹور کیپر کے ساتھ مل کر تار غائب کر دی تھی۔ ایک لحاظ سے یہی شخص استغاثے کا سب سے مضبوط گواہ تھا اور اس وقت میں اس "مضبوط گواہ" کو سیٹھ پھول سنگھ کے آستانے کی جانب جاتے دیکھ رہا تھا۔ تنوجہ کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ "ممکن ہے سنتو پر بننے والے کیس میں پتا کا ہاتھ ہو۔"

یہ الفاظ مشیت ایزدی کی طرح خود بخود اُس کی زبان سے نکل گئے تھے اور عجیب اتفاق تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد میں ان الفاظ کی صورت اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ راجیو کمار کو دیکھنے اور پہچاننے کے ساتھ ہی میری موٹر سائیکل کے بریک چرچرائے اور میں رُک گیا۔ اس اضطراری حرکت نے راجیو کو بھی چوکنا کر دیا اُس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پہچان گیا۔ اُس کے ساتھ ہی اُس نے سکوٹر کی رفتار تیز کر دی۔ میں نے موٹر سائیکل موڑی اور اُس کے پیچھے ڈال دی۔ جونہی اُسے تعاقب کا احساس ہوا وہ بوکھلا گیا۔ اُس نے سکوٹر کو سڑک سے اُتار کر ایک پگڈنڈی پر دوڑا دیا۔ شاید مجھے چکمہ دے کر پھر بڑی سڑک پر پہنچ جانا چاہتا تھا میں اُسے موقعہ دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ حتیٰ الامکان رفتار سے میں بھی موٹر سائیکل کچے میں دوڑانے لگا۔ گرد وغبار کے بگولوں میں ایک زبردست دوڑ کے بعد آخر میں نے اُسے جا لیا۔ اُس کا سکوٹر پانی کے ایک کھال میں پھنس گیا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل سے اُتر کر اُسے دبوچ لیا اور زبردست ٹھکائی شروع کر دی۔ دور کے کھیتوں سے دو تین کسان بھی بھاگم بھاگ پہنچ گئے۔ میں نے بطور انسپکٹر اپنا تعارف کرایا اور اُنہیں کہا کہ وہ کسی تانگے ریڑھے کا انتظام کریں تاکہ اس کمبخت کو تھانے پہنچایا جائے۔

☆======☆======☆

تھانے پہنچ کر تھوڑی سی چھترول کے بعد نازک مزاج راجیو نے سب کچھ بک دیا۔ اُس نے بتایا کہ تار اُس نے پگھلا کر کوئی چھ ہزار میں بیچی تھی۔ سٹور کیپر اس چکر میں شامل نہیں تھا۔ بلکہ اس نے ایک ڈوپلی کیٹ یعنی متبادل چابی سے کام چلایا تھا اور یہ سب کچھ اُس نے سیٹھ پٹیالہ والا کی ہدایت پر کیا تھا تاکہ سنت سنگھ کو اس کیس میں پھنسایا جا سکے۔ تانبے کی قیمت کے علاوہ سیٹھ نے اُسے دو ہزار روپیہ نقد بھی دیا تھا اور یہ ضمانت دی تھی کہ وہ اس سلسلے میں تمام قانونی اخراجات پورے کرے گا۔ اب چونکہ سنت سنگھ کے پاس سے قیمتی گھڑی برآمد ہونے کے بعد کیس میں نئی جان پڑ گئی تھی اس لیے وہ سیٹھ کے پاس جا رہا تھا تاکہ اُسے صورت حال سے آگاہ کرے۔

سنت سنگھ کے لالچی ماتحت کے اقبالی بیان کے بعد اب سنت کے بے گناہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے یہ تمام معلومات بمعہ اقبالی مجرم کے متعلقہ تھانیدار کے حوالے کر دیں اور اُسے کہا کہ اب راجیو کو بچنا نہیں چاہیے۔ میں نے ایک دوسری ہدایت اُسے یہ بھی کی کہ اس پورے معاملے سے گھڑی کا ذکر بالکل گول ہو جانا چاہیے کیونکہ اس سے دو نوبیاہتا جوڑوں کی زندگیاں متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ (سکھ انسپکٹر اُس کا نام اب

مجھے یاد نہیں) بہت خوش تھا کیونکہ اُسے سب کچھ کیا کرایا مل گیا تھا۔ وہ سینہ پھلا کر کہہ سکتا تھا میں میٹرک فیل سکھ ہوں تو کیا ہوا۔ دیکھو! میں نے کتنا پیچیدہ کیس حل کیا ہے؟

☆======☆======☆

جس روز میں نے اقبالی مجرم کو سکھ انسپکٹر کے حوالے کیا اُسی روز میں صاحب کالونی میں سنت کی بیوی کملا کے پاس گیا۔ بنگلہ نما چھوٹی سی کوٹھی میں ویرانی اور تاریکی کا راج تھا۔ میں نے کال بیل دی تو کملا کی ساس سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ برآمد ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''میں سنت سنگھ کی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

کملا کی ساس بگڑ کر بولی۔ ''تھانیدار! پچھلی دفعہ آئے تھے تو میرے بیٹے کی خوشیاں برباد کر گئے۔ اب کیا چھیننے آئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ماں جی! اب چھیننے نہیں کچھ دینے آیا ہوں۔''

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ پولیس والے بھی کچھ دے سکتے ہیں۔ میں بڑھیا کو حوصلہ تسلی دے کر اندر داخل ہوا تو کمروں میں گہری ویرانی تھی۔ ملازمہ ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''سنت کی بیوی کہاں ہے۔''

ملازمہ زینب نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دوپہر سے اندر بند ہیں اور رو رہی ہیں آج اُن کی شادی کی سالگرہ تھی۔ کیا کیا سوچا تھا بی بی جی نے۔ یہ کریں گے وہ کریں گے۔ کوٹھی سجائیں گے مہمان بلائیں گے۔ مگر ہوا کیا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا میں اُن سے مل سکتا ہوں۔''

ملازمہ زینب اٹھی اور ڈرے ڈرے انداز میں بند دروازے پر دستک دینے لگی۔ تیسری چوتھی دستک پر دروازہ کھلا اور خوبصورت کملا، کملائی ہوئی سی باہر نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا اٹیچی کیس تھا۔ ایک دوسرا اٹیچی کیس سامنے فرش پر پڑا تھا۔ وہ کہیں جانے کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکی۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور ادھ کھلے دروازے سے مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ مجبوراً وہ میری طرف چلی آئی۔

میں نے کہا۔ ''شاید آپ والدین کے ہاں جا رہی ہیں؟''

وہ حسب معمول شائستہ لہجے میں بولی۔ ''جی ہاں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا آپ رُک نہیں سکتیں۔''

''جی کیا مطلب؟'' وہ اس ذاتی سوال پر چونک کر بولی۔

میں نے کہا۔ ''اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سنت سنگھ بے گناہ ہے تو کیا آپ پھر بھی نہیں رکیں گی۔''

اُس کی نمناک آنکھوں میں اُمید کی ہلکی سی کرن نظر آئی اور وہ کسی بچے کی طرح معصوم نظر آنے لگی۔ ''جی آپ...... کیا کہہ رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''مسز سنت سنگھ! آپ کا شوہر بے گناہ ثابت ہو چکا ہے۔ اب عدالت کو صرف رسمی کارروائی کرنا ہے......''

وہ حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر جیسے اٹیچی کیس کا بوجھ اُسے شدت سے محسوس ہونے لگا اور اُس نے غیر ارادی طور پر اُسے جھک کر فرش پر رکھ دیا۔

''کیا آپ پورے یقین سے کہہ رہے ہیں۔'' وہ خوشی سے لرزاں آواز میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''پورے یقین سے۔ آپ کو شادی کی سالگرہ پر میں نے یہ ''اطلاع'' تحفے میں دی ہے۔ اب یہ اٹیچی کیس کھولیے۔ سامان رکھیے، گھر کی بتیاں جلایے اور چہروں پر رونق لے آیے۔ مجھے یقین ہے اس پیشی پر سنت سنگھ بری ہو جائے گا......''

کملا مجھ سے تفصیلات پوچھنے لگی۔ میں چیدہ چیدہ باتیں بتانے لگا۔ گھر میں خوشی کی ایک غیر مرئی لہر دوڑنے لگی تھی۔ کملا کے ساتھ ساتھ اُس کی ساس اور ملازمہ زینب کے چہرے بھی کھلے ہوئے تھے۔ میں نے جاتے جاتے کملا سے کہا۔ ''مسز سنت سنگھ! اس خوشی میں اپنی ملازمہ کو بھی شریک رکھیے۔ یہ بیچاری پانچ ہزار کی گھڑی بیس روپے میں فروخت کر کے پچھتا رہی ہوگی۔ اسے کم از کم عید کے لیے دو تین جوڑے کپڑوں کے ضرور بنوا دیجیے۔''

کملا نے چونک کر پوچھا۔ ''ہاں...... اُس گھڑی کا کیا پتہ چلا۔''

میں نے کہا۔ ''وہی جو آپ کے شوہر نے کہا تھا...... سنت سنگھ کو وہ گھڑی اُس کے دوست شوبھا سنگھ ہی نے دی تھی۔''

☆======☆======☆

ذرا سی بات

یہ ایک نہایت عجیب وغریب اور سنسنی خیز واردات تھی۔ ایک گھوڑا ''قتل'' کر دیا گیا تھا۔ یہ گھوڑا کرم دین کے گھر آئے ہوئے ایک مہمان کا تھا، جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ مہمان دراصل کرم دین کا بھانجا تھا۔ کرم دین گاؤں کا ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ کچھ اثر ورسوخ بھی رکھتا تھا۔ جب میں اس حیران کن واقعے کی تحقیق کے لیے اُس کی حویلی پہنچا تو وہ دروازے سے باہر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے جوڑوں کا پرانا درد تھا اس لیے خود تھانے نہیں آسکا تھا۔ میں اُس کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے اندر پہنچا۔ حویلی کا ایک حصہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ کرم دین کا بھانجا یوسف آج کل اسی حصے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ایک صحت مند نوجوان تھا۔ چہرہ گول اور بال گھونگھریالے تھے۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی اندازہ لگایا کہ وہ سخت خوفزدہ ہے۔ وہ جس کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا اُس کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔ چونکہ سردیوں کے دن تھے، گھوڑا برآمدے کے کونے میں بندھا تھا۔ رات کسی وقت کوئی شخص حویلی کے اس حصے میں داخل ہوا اور اُس نے نہایت جنونی انداز میں گھوڑے کو ہلاک کر دیا۔ گھوڑے کو ہلاک کرنے کے لیے جو آلہ استعمال کیا گیا وہ ٹوکا تھا۔ ٹوکے کا ایک بھرپور وار گھوڑے کی گردن پر کیا گیا تھا۔ یہ زخم کوئی پانچ انچ گہرا چلا گیا تھا۔ بعد میں شاید گھوڑا گر گیا تھا اور مجرم نے شہ رگ کی طرف سے اُس کی گردن تین جگہ سے کاٹ دی تھی۔ اُس نے اسی پر بس نہیں کیا تھا، سخت وحشت کے عالم میں اُس نے گھوڑے کے سر پر ٹوکے کے پے در پے وار کیے تھے اور پیٹ پھاڑ کر اُس کی آنتیں باہر نکال دی تھیں۔ یقیناً یہ ایک وحشیانہ کارروائی تھی۔ سفید رنگ کا جوان گھوڑا برآمدے کے وسط میں بے حرکت پڑا تھا۔ اُس کا خون ایک تالاب کی صورت میں جما ہوا تھا۔ گھوڑے کے مالک یوسف نے خوفزدہ لہجے میں بتایا کہ رات کے پچھلے پہر اُسے پیشاب کی حاجت ہوئی۔ وہ حویلی سے نکل کر قریبی کھیتوں میں چلا گیا۔ جب کوئی پون گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو گھوڑا مردہ پڑا تھا۔ کمرے میں اُس کی چارپائی بھی ٹوٹی ہوئی تھی...... چارپائی کے ذکر پر مجھے کمرہ دیکھنے

کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے ادھ کھلے دروازے سے کمرے میں جھانکا۔ اندر کا منظر یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ جنونی شخص درحقیقت یوسف کو قتل کرنے آیا تھا۔ یہ یوسف کی خوش قسمتی تھی کہ وہ کمرے میں موجود نہیں تھا اور قاتل کا غصہ اس بے زبان گھوڑے پر اُتر گیا۔ میں نے دیکھا، یوسف کی چارپائی دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ لحاف پھٹا ہوا تھا اور تکیے سے نکلنے والی روئی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا مجرم نے ہر شے پر اندھا دھند ٹوکا چلایا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر ذہن پر عجیب طرح کا خوف سوار ہو جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی مجرم کسی کونے سے نکلے گا اور وحشیانہ انداز میں ٹوکا چلانا شروع کر دے گا۔

یوسف کی حالت بہت پتلی تھی وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے غور سے موقعے کا جائزہ لے کر اُس سے کہا۔ ''تیرا کہنا ہے کہ جب مجرم گھر میں داخل ہوا تو تُو کھیتوں میں تھا۔''

''جج...... جی ہاں۔'' یوسف ہکلایا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھ جو کچھ ہوا ہے، سچ سچ بتا۔ یہ نہ ہو تم لوگوں کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔''

''کیا مطلب جی؟'' یوسف کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

''مطلب یہ کہ جب گھوڑے کو مارا گیا تُو گھر میں ہی موجود تھا۔''

''میں...... میں سچ کہہ رہا ہوں جی۔''

میں نے کرم دین سے کہا۔ ''کرم دینا! تیرا بھانجا مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے اسے سمجھا کہ معاملہ خواہ مخواہ خراب نہ کرے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ واردات کے وقت کھیتوں میں ہو۔''

میرے پُریقین لہجے نے یوسف کو پریشان کر دیا۔ وہ میری بات ماننا بھی نہیں چاہتا تھا اور جھٹلانے کی ہمت بھی اُس میں نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

''کرم دین! اس سے پوچھ کہ کھیتوں سے واپس آکر یہ کمرے میں کیسے داخل ہوا تھا؟''

یوسف نے کہا۔ ''جناب دروازے سے گزر کر اور کیسے؟''

میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دہلیز پر مردہ گھوڑے کا خون پھیلا ہوا تھا یہ خون اتنی جگہ میں تھا کہ اسے پھلانگ کر کمرے میں داخل نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ گھوڑا ہلاک

ہونے کے بعد اگر کوئی کمرے میں داخل ہوتا تو اُس کے پاؤں سے لگنے والا خون کمرے میں نشان چھوڑ جاتا۔ مگر ایسا کوئی نشان کمرے میں نہیں تھا۔ ہاں ایسے نشان برآمدے میں پائے جاتے تھے اور یقیناً یہ یوسف کے قدموں کے تھے۔ جب وہ کمرے سے نکلا تھا تو خون اُس کے جوتے سے لگ گیا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، واردات کے بعد یوسف صرف ایک بار دروازے سے گزرا ہے اور وہ اُس وقت جب وہ مجرم کے جانے کے بعد واردات کی اطلاع دینے حویلی کی طرف بھاگا ہے۔

میں نے یہ سب کچھ یوسف کو بتایا تو اُس کے پاس تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ مان گیا کہ مجرم کے خوف سے وہ کمرے میں چھپ گیا تھا اور اُس وقت تک چھپا رہا تھا جب تک وہ چلا نہیں گیا۔ جان بچانے کے لیے وہ ایک بڑے جستی صندوق میں گھس گیا تھا (اسے پیٹی کہا جاتا ہے)

میں نے کرم دین سے کہا۔ ''کرم دین! اگر معاملے کی صحیح تفتیش چاہتے ہو تو اونگی بونگی مت مارو، جو بھی معاملہ ہے مجھے صاف بتا دو۔''

کرم دین مجھے اپنے ساتھ بیٹھک میں لے آیا۔ نوکر چاکر خدمت میں لگ گئے۔ کرم دین نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! یہ تیسری بار ہے کہ کسی نے میرے بھانجے کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ رستم پور گاؤں کا رہنے والا ہے۔ تین دفعہ وہاں اس پر حملہ ہوا ہے۔ ایک بار تو قسمت اچھی تھی جو یہ بچ گیا۔ کسی نے اس کے کمرے میں یہ اتنا بڑا زہریلا ناگ چھوڑ دیا۔ ناگ ساری رات ایک دیگچے میں کنڈلی مارے بیٹھا رہا۔ صبح جب اُس نے دودھ دھونے کے لیے دیگچا اٹھایا تو ناگ نے کاٹنے کی کوشش کی۔ اُس نے دیگچا پھینک کر اُسے لاٹھیوں سے مار ڈالا۔ لڑکا بہادر ہے جی لیکن جب ہر وقت جان کا خطرہ لگا رہے تو بندے میں رہ کیا جاتا ہے۔ دیکھیں کیسا سفید لٹھے جیسا رنگ ہو رہا ہے اس کا۔ میں خود رستم پور جا کر اسے یہاں لے آیا تھا، لیکن ویریوں (دشمنوں) نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔''

میں نے پوچھا۔ ''حملہ آور کے بارے تمہارا کیا اندازہ ہے۔''

کرم دین حقہ گڑگڑا کر بولا۔ ''تھانیدار صاحب! یوسف کا باپ کھاتا پیتا زمیندار ہے پانچ چھ مربعے جگہ ہے۔ زمین والوں کے چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں لیکن سمجھ نہیں آتی یوسف کی جان کا دُشمن کون ہو سکتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کوئی رشتے کا معاملہ، کوئی ذات برادری کا جھگڑا؟''

کرم دین بولا۔ ''جی پرانی دشمنی تو کوئی نہیں۔ ایک دو بکھیڑے ہیں۔ دو سال پہلے

یوسف کا ایک چاچا قتل ہوا تھا۔ وارثوں نے یوسف کے باپ پر بھی شبہ کیا تھا۔ پھر یہ بات آئی گئی ہو گئی۔''

میں نے کافی دیر یوسف اور اس کے ماموں سے گفتگو کی۔ میں نے کرم دین کو مشورہ دیا کہ وہ یوسف کو حویلی کے اندر رکھے اور ممکن ہو تو ایک آدھ بندہ اُس کے پہرے پر لگا دے۔ کرم دین نے کہا۔ ''جناب! میں تو اپنے سارے ملازموں کو لاٹھیاں دے کر اُس کے دروازے پہ کھڑا کر دوں گا مگر بات تو تب ہی بنے گی جب وہ لوگ پکڑے جائیں گے۔''

☆======☆======☆

اگلی رات کا واقعہ ہے۔ دس بجے کا وقت تھا۔ ایک ضروری کام کے سبب میں تھانے میں تھا۔ اندھیری رات تھی۔ گرج چمک کے ساتھ بوندا باندی جاری تھی۔ میں اُٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ دفعتہً کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور یوسف دہلیز پر نظر آیا وہ خوف اور سردی سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ لگتا تھا موت کا فرشتہ اُس کے تعاقب میں ہے۔ اُس کا چہرہ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

''بیٹھ جا میاں۔'' میں نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے خطرہ ہو گیا تھا کہ وہ گر ہی نہ پڑے۔ وہ جلدی سے بیٹھ گیا اور پھر اچانک...... اُس نے مجھے حیران کر دیا۔ اُس نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپایا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''تھانیدار صاحب! میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تھانیدار صاحب! میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

اتنے لمبے تڑنگے آدمی کو بچوں کی طرح روتے دیکھنا عجیب تجربہ تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے اسّی سالہ بوڑھے کے اندر بھی ایک بچہ موجود ہوتا ہے...... یوسف کی دھاڑیں سن کر دو سپاہی میرے کمرے میں جھانکنے لگے۔ میں نے انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد یوسف پُرسکون ہوا تو میں نے کہا۔

''بھلے مانس! اب تجھے کیا ڈر ہے۔ کرم دین نے بتایا تھا کہ اُس نے تجھ پر چار آدمیوں کا پہرا بٹھایا ہے۔''

یوسف بولا۔ ''تھانیدار صاحب! ان پہروں سے کچھ نہیں ہو گا۔ پہرا تو...... پہرا تو میرے باپ نے بھی بٹھایا تھا۔ وہ جو کوئی بھی ہے بڑا ہوشیار شخص ہے۔ مجھے تو اب ان پہریداروں سے بھی ڈر آتا ہے۔ کیا پتہ کوئی اس کے ساتھ ہی ملا ہوا ہو۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ نوجوان مسلسل ہراساں رہنے سے اب خوف کی اُس منزل پر پہنچ گیا

ہے جہاں اپنا سایہ بھی ڈرا دیتا ہے۔

میں نے کہا۔''یوسف! مجھے ایک بات پوری ایمانداری سے بتا۔ تیرا ماموں کہتا ہے کہ ایک سے زیادہ آدمی تیرے پیچھے ہیں جبکہ تیرا کہنا ہے کہ وہ ایک آدمی ہے۔ سچ بات کیا ہے؟''

یوسف بولا۔''سچ بات تو یہ ہے جناب کہ مجھے بھی کچھ پتہ نہیں۔ اس سے پہلے رستم پور میں جب حملہ ہوا تھا تو اُس وقت بھی ایک شخص نے ٹوکا چلایا تھا وہ میرے راستے میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ میں گزرنے لگا تو ایک دم کماد کے کھیت سے نکلا اور سامنے آ گیا۔ اُس نے چہرہ پگڑی میں چھپا رکھا تھا۔ پورے زور سے ٹوکا گھما کر اُس نے میرے سر پر مارنا چاہا۔ میں پیچھے ہٹا تو ٹوکا میرے کندھے پر لگا۔ میں مڑ کر واپس بھاگا۔ اُس نے پیچھا کیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ سامنے سے تین چار گھڑ سوار آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ واپس کماد میں گھس گیا۔''

میں نے کہا۔''یوسف میاں ذہن پر زور ڈالو اور ایسے لوگوں کے نام لکھواؤ جن پر تم تھوڑا بہت شک بھی کر سکتے ہو۔''

یوسف نے سوچ سوچ کر ایک دو نام لکھوائے۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس کارروائی کو صرف خانہ پُری سمجھ رہا ہے۔ نام لکھوا کر وہ گڑگڑانے لگا۔

''انسپکٹر صاحب! میں نے آپ کی بڑی نیک نامی سنی ہے میرا دل کہتا ہے کہ آپ ہی مجھے اس پاگل سے بچا سکتے ہیں۔ آپ کے کمرے میں بیٹھ کر مجھے جو سکون ملا ہے خدا کی قسم کہیں نہیں ملا۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ مجھے اپنے ساتھ رہنے دیں۔''

میں نے کہا۔''بھلے مانس یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو ابھی اٹھ کر گھر جا رہا تھا۔''

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔''بس مجھے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ انسپکٹر صاحب! میں کوئی غریب آدمی نہیں ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ یقین کریں میں اپنی طاقت اور آپ کے اندازے سے بڑھ کر آپ کی خدمت کروں گا۔ بس مجھے اس اندھی موت سے بچا لیں۔''

میں نے کہا۔''یوسف میاں! حوصلے سے کام لو۔ میرے سو مسئلے ہیں۔ سو جگہ آنا جانا ہوتا ہے۔ میں تمہیں کہاں کہاں ساتھ لیے پھروں گا۔ یا کہہ دو کہ نوکری چھوڑ دوں اور تمہارے پہرے پر بیٹھ جاؤں۔''

میری بات پر وہ پھر آبدیدہ ہو گیا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔''انسپکٹر صاحب! میں آپ کو

بتا رہا ہوں وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیں۔''

مجھے اُس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ترس بھی۔ بہرحال یہ میرے علاقے کا معاملہ تھا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ ویسے بھی یوسف کچھ ایسا غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ مجرم کے غضب کا اندازہ بے زبان جانور کی وحشیانہ چیر پھاڑ سے ہوتا تھا۔ میں نے کچھ سوچ بچار کے بعد یوسف سے کہا۔

''دیکھ بھائی! میں ایسا کرتا ہوں اپنے دو ہوشیار کانسٹیبل تیری حفاظت پر لگا دیتا ہوں۔ اُن میں سے ایک کے پاس پکی رائفل ہو گی۔ وہ چوبیس گھنٹے تیرے ساتھ رہیں گے۔''

یوسف نے کہا۔''انسپکٹر صاحب! اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ جو بہتر سمجھیں کریں۔'' لگتا تھا اُس کے دل کا غبار اب نکل چکا ہے۔

میں نے کہا۔''وہ دونوں میرے بھروسے کے آدمی ہیں تم چین سے جا کر سو جاؤ۔ ابھی آدھ گھنٹے میں وہ تمہارے پاس پہنچ جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' یوسف نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

میں اس کی ٹھنڈی سانس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ میں نے اُسے رُکنے کا اشارہ کیا اور دس منٹ بعد دونوں کانسٹیبلوں کے ساتھ ہی اُسے گھر روانہ کیا۔

☆======☆======☆

اگلے روز میں نے اپنے سب انسپکٹر کو اس معاملے کی تحقیق پر لگا دیا۔ خاص طور پر میں چاہتا تھا کہ یوسف کے مقتول چچا کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ یوسف نے مشتبہ افراد کی فہرست میں چچا کے کسی بیٹے یا رشتے دار کا نام نہیں لکھوایا تھا مگر میں اپنے طور پر تسلی کر لینا چاہتا تھا۔

سب انسپکٹر کی تحقیق جاری تھی کہ قریبی موضع میں ڈکیتی کی ایک واردات میں دو افراد بھی قتل ہوئے۔ مجرموں کا کھوج لگانے کے لیے مجھے پوری توجہ دینی پڑی۔ تھانے کا پورا عملہ مصروف ہو گیا۔ میں نے ایک روز کے لیے اُن کانسٹیبلوں کو بھی بلا لیا جو کرم دین کے گھر یوسف کے پہرے پر تھے۔ یوسف بھی اُن کانسٹیبلوں کے ساتھ ساتھ ہی تھانے چلا آیا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ نے اُنہیں بلا لیا ہے۔''

میں نے ذرا جھلا کر کہا۔''یار! اچھے بھلے صحت مند آدمی ہو، کیوں اتنا ڈرتے ہو۔ کچھ نہیں ہو جائے گا تمہیں۔''

وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ مجھے پھر ترس آ گیا۔ جان کا خوف آدمی کو کیا کیا بنا دیتا ہے۔ یوسف مضبوط ہاتھ پیر والا مضبوط نوجوان تھا۔ کھاتے پیتے گھرانوں افراد کی طرح اُس کی توند بھی تھوڑی سی نکلی ہوئی تھی۔ موٹی گردن میں سونے کا وزنی کیئا لٹک رہا تھا۔ ریشمی لباس اور چم چم کرتا جوتا۔ بال تھوڑے سے گھونگھریالے تھے اور بیچ مانگ نکالی ہوئی تھی۔ عام حالات میں کوئی اس شخص کو بزدلی کا طعنہ دیتا تو وہ مرنے مارنے اُتر آتا، لیکن جان کے مسلسل خوف نے اُسے سب کچھ کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اُس شرمندگی مٹانے کے لیے کہا۔

''یوسف میاں! میرا مطلب ہے کہ تم گھر جاؤ۔ میں نے کانسٹیبلوں کو عارضی طور پر ہے۔ شام کو یا کل صبح تک وہ تمہاری ڈیوٹی پر پہنچ جائیں گے۔''

یوسف نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے جی! لیکن یہ بتا دیں کہ کانسٹیبلوں کے آنے تک اپنے کمرے میں رہوں یا اِدھر اُدھر ہو جاؤں۔''

میں نے کہا۔ ''بے فکر ہو کر اپنے کمرے میں رہو۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔''

کچھ دیر بیٹھ کر وہ واپس چلا گیا۔ مجھے بھی گاؤں سے باہر جانا تھا۔ ڈکیتی کا کیس خا پیچیدہ ثابت ہو رہا تھا۔ انگریز ایس پی بے حد سخت تھا۔ بار بار اُس کے ہرکارے رپور لینے کے لیے آ رہے تھے۔ قریباً چھ روز اسی بھاگ دوڑ میں گزر گئے۔ اس دوران مجھ ایک فاش غلطی یہ ہوئی کہ میں کانسٹیبلوں کو واپس یوسف کے پہرے پر نہ بھیج سکا۔ چھٹے ر جب ڈکیتی کے مجرم گرفتار ہوئے اور مجھے اس ہنگامے سے فرصت ملی تو دفتر میں بیٹھنا نصیب ہوا۔ اُس روز دس بجے مجھے یہ پتہ چلا کہ کل شام یوسف پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور وہ شدید ز حالت میں امرتسر ہسپتال میں ہے۔ اس خبر نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً کرم دین بلانے کے لیے سپاہی دوڑایا۔ کرم دین تو نہیں آیا لیکن اُس کا بڑا بیٹا طفیل سپاہی کے سا تھانے پہنچا۔ اُس نے بتایا کہ کرم دین بھی ہسپتال میں ہے۔ اُسے بھی چوٹیں آئی ہیں۔ کے واقعے کے بارے میں بتاتے ہوئے اُس نے کہا۔

''تھانیدار جی! نہر پار کے گاؤں ستو کی میں ایک عُرس تھا۔ چاچے (کرم دین) بھرا یوسف سے کہا کہ وہ بھی سب کے ساتھ عرس پر جائے۔ دراصل ہم سب گھر والے سال عرس پر جاتے ہیں۔ یوسف کہتا تھا کہ وہ گھر پر رہے گا مگر ہم سب نے کہہ سن کر اُ تیار کر لیا۔ اُس نے کہا کہ ٹھیک ہے میں تھانیدار صاحب سے پوچھ کر چلا جاتا ہوں۔ وہ آ سے پوچھنے تھانے آیا، لیکن آپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ چاچے نے اُس سے کہا کہ تھانید

نے تجھے نیک کام سے منع تو نہیں کیا تھا۔ اللہ والے کا دربار ہے۔ وہاں دل کی مرادیں پوری ہوتی ہیں اور دُعائیں سنی جاتی ہیں۔ سوہنا رب تیری مشکل بھی آسان کرے گا۔ کل صبح کوئی چھ بجے ہم عرس کے لیے روانہ ہوئے۔ تین تانگے تھے ایک میں عورتیں اور بچے تھے اور دو میں مرد، خیریت سے پہنچ گئے واپسی پر شام کے وقت جب ہم نہر کے پاس پہنچے تو اچانک درختوں سے نکل کر چار آدمی سامنے آ گئے۔ انہوں نے ڈھاٹے لگا رکھے تھے اور ہاتھوں میں برچھیاں تھیں ایک شخص نے جس کے ہاتھ میں ٹوکا تھا یوسف کا نام لے کر للکارا مارا اور بولا۔ ''تو لاکھ پہروں میں بیٹھ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے تانگے پر حملہ کر دیا۔ کوچوان تو جان بچانے کے لیے بھاگ گیا ہم پانچ آدمیوں نے جن میں چاچا بھی تھا برچھی والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہمارے پاس ایک رائفل بھی تھی مگر بدقسمتی سے اس میں کارتوس پھنس گیا۔ ایک شخص جس کے ہاتھ میں ٹوکا تھا یوسف پر جھپٹا اور دو تین وار کیے۔ ایک وار یوسف کی ٹانگ پر لگا اور ہڈی کاٹ گیا وہ وہیں گر کر تڑپنے لگا۔ اتنے میں ہمارا دوسرا تانگہ بھی پہنچ گیا۔ چھ سات آدمی نعرے مارتے ہوئے تانگے سے اُترے تو برچھیوں والے بھاگ نکلے۔ ہمارے آدمیوں نے درختوں میں اُن کا پیچھا کیا مگر وہ ہاتھ نہیں آئے۔ یوسف شدید زخمی ایک کھیت میں پڑا تھا۔ پہلے تو ہمیں لگا کہ وہ مارا گیا، پھر کچھ کچھ سانس نظر آئی۔ ہم نے اُسے اُسی تانگے میں رکھا اور پکی سڑک کی طرف بھاگے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا۔ اب یہ بتاؤ۔ کہ کسی حملہ آور کی پہچان ہوئی۔''

کرم دین کا بیٹا نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''جناب! لڑائی کے دوران اُن میں سے ایک آدمی کا ڈھاٹا کھل گیا تھا۔ میں نے بڑے غور سے اُسے دیکھا مگر پہچان نہ سکا۔ دوسروں کی بھی کوئی پہچان نہیں ہوئی...... ہاں ایک برچھی ٹوٹ کر وہاں گر گئی تھی، وہ ہم اٹھا لائے ہیں۔'' میرے کہنے پر اُس نے تہبند کی ڈب کھولی اور برچھی کا اگلا حصہ میز پر رکھ دیا۔ کہنے لگا۔ ''یہ دیکھیں جناب اس پر کچھ لکھا بھی ہوا ہے۔'' میں نے دیکھا برچھی کی ایک طرف باریک لفظوں کے ساتھ کچھ لکھا ہوا تھا۔ لکھائی مدھم پڑ چکی تھی مگر کوشش کے بعد میں پڑھنے میں کامیاب رہا۔ ''مستری اشرف پردیسی'' کے الفاظ لکھے تھے۔ ہتھوڑی اور لوہے کی کیل سے دھات پر نقطے ڈالے گئے تھے۔ ان نقطوں نے مندرجہ بالا الفاظ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ ٹوٹی ہوئی برچھی ایک اہم سراغ ثابت ہو سکتی تھی۔

مجھے اس واردات سے دلی صدمہ پہنچا تھا۔ وجہ ظاہر ہے یہی تھی کہ ایک آدمی کا اعتماد

میری وجہ سے مجروح ہوا۔ اُس نے مجھ پر اندھا اعتماد کیا اور میری غفلت سے اُسے جان کے لالے پڑے۔ یہ خبر سن کر مجھے مزید افسوس ہوا کہ یوسف کی ٹانگ گھٹنے سے کاٹ دی گئی ہے۔ اُس کے جسم میں زہر پھیلنے کا اندیشہ اب بھی موجود تھا۔ میں نے خود سے عہد کیا کہ جلد سے جلد مجرموں کا کھوج لگانے کی کوشش کروں گا۔ سب سے پہلے میں امرتسر پہنچا اور ہسپتال میں یوسف کو دیکھا۔ اُس کے دو آپریشن ہو چکے تھے اور اب حالت خطرے سے باہر تھی۔ وہ ہوش میں تھا۔ میں نے اُس سے ایک دو باتیں کیں۔ اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا بازو پکڑ لیا۔ ابھی وہ بات کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے۔ میں اس بچے کھچے اعتماد کو خالی لفظوں کی تسلی دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اُس کا کندھا تھپتھپایا اور باہر نکل آیا۔

سب انسپکٹر کی مکمل رپورٹ آ چکی تھی۔ وہ کوئی اہم سراغ ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔ اب میرے پاس آگے بڑھنے کا واحد راستہ وہ ٹوٹی برچھی تھی۔ اُس پر کندہ نام سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی اشرف پردیسی نامی لوہار نے بنائی ہے۔ اُن دنوں ہر گاؤں میں ایک آدھ لوہار ضرور ہوتا تھا۔ میں نے سب انسپکٹر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اردگرد کے دیہات میں اشرف نامی لوہار کا پتہ کرے۔ سب انسپکٹر نے تیسرے روز مجھے اپنی ناکامی کی خبر سنائی۔ مجھے پہلے ہی اُس شخص سے اچھی توقع نہیں تھی۔ اس سے پہلے اُس نے مشتبہ ناموں پر تحقیق کی تھی اور کچھ حاصل نہیں کر سکا تھا۔ بس اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے چند اُلٹی سیدھی باتیں رپورٹ میں لکھ دی تھیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ایسے نااہل ماتحت کارکردگی دکھانے کے چکر میں تفتیش کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں۔ بہرحال میں نے اُس سب انسپکٹر پر لعنت بھیجی اور خود اُس لوہار کی تلاش میں نکلا۔

اُن دنوں میرے پاس ایک رواں گھوڑی تھی۔ اِس نسل کی گھوڑیاں سبک خرامی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں چال ایسی ہموار کہ جیسے پانی پر تیر رہی ہے اُن دنوں ہم عام گھوڑوں کو ''موریس'' اور رواں چال کی گھوڑی کو شیورلیٹ کہا کرتے تھے...... تو اپنی شیورلیٹ پر بیٹھ کر میں دوپہر تک چار پانچ دیہات میں گھوما۔ اشرف نامی کسی لوہار کا پتہ نہیں چلا۔

نہر پار جانے کے لیے میں پُل پر پہنچا تو وہاں ایک عجیب منظر آیا۔ ایک لڑکی جس کے تمام کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ پریشانی کے عالم میں چیخ رہی تھی۔ وہ برگد کے ایک درخت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُس جانب غور سے دیکھا تو ایک آٹھ نو سالہ لڑکا نظر آیا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور شاخوں سے چمٹا ہوا تھا۔ پھر مجھے سمجھ آئی کہ لڑکی کیوں چلا رہی ہے۔ ایک

چیل ''قطب قطائیں'' کی آواز نکالتی ہوئی بار بار لڑکے پر جھپٹ رہی تھی۔ میں جلد ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ یہ لڑکی نہر پر کپڑے دھو رہی تھی۔ لڑکا جو شاید اس کا چھوٹا بھائی تھا گولاں (برگد کا پھل) کھانے کے لیے اوپر چڑھ گیا تھا۔ وہاں چیل کا گھونسلہ تھا۔ وہ اُس پر حملہ آور ہو گئی تھی۔ اب گھبراہٹ میں لڑکے سے نیچے نہیں اُترا جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر لڑکی چلائی...... ''تھانیدار جی! رب واسطے اسے نیچے اتار دو۔'' صورت حال دلچسپ تھی۔ میں گھوڑی چلا کر آگے آیا اور پھر گھوڑی پر کھڑا ہو کر میں نے ننگ دھڑنگ لڑکے کو نیچے اُتار لیا۔ چیل طیش کے عالم میں مجھ پر بھی حملہ آور ہوئی، لیکن میری ٹوپی گرانے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ ہاں لڑکے کی اچھی خاصی مرمت ہوئی تھی۔ اُس کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے اور ایک دو جگہ سے خون رِس رہا تھا۔ وہ پہلے تو صرف رو رہا تھا لیکن اب رونے کے ساتھ ساتھ ہنس بھی رہا تھا۔ لڑکی نے ایک دوہتڑ اُس کی کمر پر مارا اور بولی۔ ''پیڑ جو گیا ہور کھا گولاں۔''

لڑکے نے لڑکی کو ماں کہہ کر پکارا تو مجھے اُن کے رشتے کا علم ہوا۔ وہ عمر میں اُس کی ماں ہرگز نہیں لگتی تھی۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں اُس کی شادی ہو گئی ہوگی۔ ابھی تک تو اُسے اپنے بچے کی فکر تھی اب اُس کا دھیان اپنی طرف گیا اور اُس نے بازو موڑ کر سینے پر رکھ لیا۔ وہ ایک خوبصورت اور بھرپور لڑکی تھی۔ لرزاں آواز میں بولی۔ ''تھانیدار جی! آپ کی بڑی مہربانی۔ مجھے تو ڈر تھا یہ کمبخت ڈیلا (آنکھ) نکلوا کر نیچے آئے گا۔'' میں نے کہا۔

''بہن! مہربانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ بتا یہ اوپر کیسے چڑھا تھا؟''

بولی۔ ''ادھر ایک گدھا گھوم رہا تھا۔ اس پر چڑھ کر اوپر چلا گیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''گدھے کو اور بھی کئی کام ہوں گے۔ وہ کب تک نیچے کھڑا اس کا انتظار کرتا اس لیے وہ کھسک گیا۔''

میری اس بات پر ماں بیٹا کھلکھلا کر ہنس پڑے...... میں پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جس گاؤں میں مَیں اب پہنچا اُس کا نام ''کنڈلی'' تھا۔ یہاں بھی دو لوہار موجود تھے مگر ان میں سے کسی کا نام ''اشرف پردیسی'' نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ ان میں سے ایک کو مل لوں۔ میں جس لوہار سے ملا اُس کا نام جیون تھا۔ عمر کوئی ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔ میں نے اُسے برچھی دکھائی۔ وہ اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر بولا۔

''مائی باپ! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ لگتا ہے یہ شہر کی بنی ہوئی ہے۔''

جیون کی بات نے میری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ شہر میں کوئی کسی کو کب پہچانتا ہے،

اگر برچھی وہاں سے خریدی گئی تھی تو خریدار کا سراغ ملنا ناممکن تھا۔ میں نے اُٹھتے اُٹھتے کہا۔

''بابا! اس پر کسی مستری اشرف پردیسی کا نام لکھا تھا۔ تیری نظر میں اس نام کا کوئی کاریگر ہے۔''

مستری اشرف کا نام سن کر بابے جیون کے کان کھڑے ہوئے وہ بولا۔ ''اس پر مستری اشرف کا نام لکھا ہے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بابا جیون کچھ دیر گم صم رہا پھر کہنے لگا۔ ''سرکار! مستری اشرف نام کا لڑکا تو اس گاؤں میں ہے مگر وہ لوہار نہیں وہ تو راج گیری کرتا ہے۔ کرتا کیا ہے، کرتا تھا۔ اب تو چھوڑ چکا ہے۔''

بابے جیون کی بات نے مجھے چونکایا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ پہلے میرا دھیان اس طرف کیوں نہیں گیا۔ ضروری تو نہیں تھا کہ برچھی پر برچھی ساز کا نام ہی لکھا ہو۔ یہ برچھی کے مالک کا نام بھی ہو سکتا تھا۔ دراصل مستری کے لفظ نے ہمیں کسی اور زاویے سے نہیں سوچنے دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں نے نہ صرف اشرف پردیسی کا کھوج لگا لیا بلکہ جوتے مار مار کر اُس سے یہ بھی منوا لیا کہ یہ اُس کی برچھی ہے۔ یہ ساری کارروائی چوہدری کی حویلی میں ہوئی۔ جب اشرف نے برچھی قبول کر لی تو اُسے یہ بھی بتانا پڑا کہ یہ موقعہ واردات پر کیسے پہنچی۔ پہلے تو اُس نے جان بچانے کا گھسا پٹا کلیہ آزمایا اور کہنے لگا کہ برچھی چوری ہو گئی تھی مگر جب موسلا دھار چھترول ہوئی تو وہ مان گیا کہ عرس کے روز وہ موقعہ واردات پر موجود تھا۔ نہایت خوفزدہ لہجے میں اُس نے بتایا کہ وہ قہر سنگھ کا ساتھی ہے۔ قہر سنگھ کے بارے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا چوہدری اور اُس کے کارندوں کی زبانی صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ اسی گاؤں میں رہتا ہے اور اُس کی تھوڑی سی زمین ہے۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہوا کہ بتانے والے قہر سنگھ کی ذات سے خوفزدہ ہیں اور اس کی اصلیت چھپا رہے ہیں۔ میں نے اُن پر زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا اور اُس کے گھر کا پتہ پوچھ کر خود ہی ملنے چل پڑا۔ قہر سنگھ کا گھر گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھا۔ گھر دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہو گا۔ گلی کی بہت سی زمین اُس نے اپنے گھر میں شامل کر رکھی تھی۔ اُس کی دو موٹی تازی بھینسیں بھی گلی میں بندھی تھیں جس سے راہگیروں کا گزرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کرخت نسوانی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟ آرام کر...... آتی ہوں۔''

پھر کسی نے جھٹکے سے دروازہ کھولا، میں حیران رہ گیا، یہ وہی لڑکی تھی جس سے نہر پر ملاقات ہوئی تھی اب اُس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ سیاہ بال اُس کے شانوں پر بکھرے

ہوئے تھے۔ عقب میں وہی لونڈا نظر آ رہا تھا۔

''آ...... آپ یہاں۔'' وہ ہکلائی۔

''ہاں...... مجھے قہر سنگھ سے ملنا ہے۔''

''وہ تو...... وہ تو گھر میں نہیں، لیکن آپ...... آپ اندر آ جائیں۔''

''نہیں بہن! میں جلدی میں ہوں۔ ویسے قہر سنگھ تمہارا کیا لگتا ہے۔''

''میرا مرد ہے جی!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ پھر کہنے لگی۔ ''آپ اندر آ جائیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں۔''

اُس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میرے قدم خود بخود دہلیز پار کر گئے۔ اُس نے جلدی سے برآمدے میں ایک چارپائی ڈالی اور دودھ لسی کا انتظام کرنے لگی۔ میں نے اُسے منع کر دیا اور کہا کہ اُسے جو بتانا ہے جلد بتا دے۔

لڑکی اپنے چھوٹے بچے کو گود میں اُٹھائے میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئی اور قہر سنگھ کی باتیں کرنے لگی۔ جلد ہی میں جان گیا کہ یہ لڑکی بے حد کارآمد ہے۔ قہر سنگھ اُس کا شوہر ضرور تھا مگر وہ اُس سے نفرت کرتی تھی۔ میں نے لڑکی کو کریدا تو معلوم ہوا کہ قہر سنگھ آج سے دس سال پہلے اُسے ایک دور دراز گاؤں سے اُٹھا کر لایا تھا۔ اُس نے اُس سے زبردستی شادی کی تھی اور بچے پیدا کیے تھے۔ اتنے برس گزرنے کے باوجود لڑکی اُسے اپنا دشمن ہی سمجھتی تھی۔ اُس کے دل کے کسی کونے میں اس بات کی شدید خواہش تھی کہ قہر سنگھ کو اس کے کیے کی سزا ملے۔ لڑکی نے اپنا نام جہانی بتایا۔ وہ سکھ تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ کھل گئی۔ اُس نے صاف لفظوں میں کہا۔ اُس کے مرد نے اُسے قیدیوں کی طرح رکھا ہوا ہے اور وہ اُس سے نفرت کرتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''جہانی! اگر قہر سنگھ پکڑا گیا اور اُسے لمبی سزا ہو جائے تو تیرا کیا بنے گا۔''

اُس نے گود کے بچے کا سر چوما اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''میرے یہ دونوں پتر سلامت رہیں میں ان کے سہارے ساری زندگی کاٹ دوں گی۔ انہیں پالنے کے لیے آٹھ پہر محنت مزدوری کر سکتی ہوں، لیکن اس مرد کے پاؤں کی جوتی بن کر نہیں رہ سکتی۔''

میں قہر سنگھ کے گھر زیادہ دیر نہیں رہا، لیکن اس مختصر سے وقت میں جہانی نے کچھ ایسی باتیں میرے کان میں ڈال دیں کہ قہر سنگھ کو گھیرنا آسان ہو گیا۔ اُس نے بتایا کہ قہر سنگھ کے گھر آنے کا کوئی وقت نہیں۔ بعض دفعہ وہ کئی کئی دن گھر کا رُخ نہیں کرتا۔ اُس نے کہا کہ ''ویروالی'' گاؤں کے پاس ایک بیلا ہے۔ وہاں فوجیوں کی کچھ پرانی بیرکیں ہیں، قہر سنگھ

نے وہیں اپنا اڈا بنا رکھا ہے اُس کے اس ٹھکانے کا علم گاؤں میں بھی کسی کو نہیں۔

جہانی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مستری اشرف گدھے کی طرح مار کھانے کے باوجود قہر سنگھ کے اس ٹھکانے کے بارے نہیں بتا سکا تھا۔ جہانی سے رُخصت ہو کر میں پھر چوہدری کے پاس آیا اور اُسے بتایا کہ قہر سنگھ کی عورت بڑی منہ پھٹ ہے۔ تھانے میں جا کر اُس کا دماغ ٹھیک ہو گا۔ اُس نے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

یہ باتیں اس لیے ضروری تھیں کہ قہر سنگھ بیوی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ جیسا کہ اب تک کی تفتیش سے پتہ چلا تھا وہ بڑا اخر دماغ شخص تھا اور اُس نے پورے گاؤں کو سہار کھا تھا۔ اگر اُس کے اڈے پر میرا چھاپا ناکام ہوتا تو اُس کا دھیان اپنی بیوی کی طرف جا سکتا تھا۔

چوہدری کی حویلی سے میں سیدھا اپنے گاؤں پہنچا۔ مستری اشرف کے ہاتھوں میں رسی کی ہتھکڑی تھی اور وہ میرے ساتھ تھا۔ تھانے پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دو مخبروں کو ''ویروالی'' روانہ کیا تاکہ وہ بیلے کی خبر لائیں۔ شام تک دونوں مخبر واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بیلے میں پہنچے تھے۔ وہاں دو تین بیرکوں کے کھنڈر موجود ہیں لیکن خفیہ کوئی نہیں۔ ایک جہازی سائز کی چارپائی پڑی تھی۔ تین چار آدمی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ مزدور جھاڑیاں اور گھاس کاٹنے میں مصروف تھے۔ پتہ چلا کہ وہ اس جگہ کو آباد کر رہے ہیں (مطلب کہ کھیتی باڑی کا ارادہ رکھتے ہیں) مخبروں نے بتایا کہ وہ لوگ انہیں بھی بیگار پر لگانا چاہتے تھے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئے ہیں۔

مخبروں کی اطلاع سے ظاہر تھا کہ بیلے میں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ میں نے ایک چھاپا مار پارٹی تیار کی اور عشاء کی اذان کے وقت ویروالی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ احتیاطاً میں نے کارتوسوں کی ایک فالتو پیٹی بھی ساتھ لے لی تھی۔ پارٹی میں کل آٹھ جوان تھے جو چھ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب ہم بیلے میں پہنچے تو ہو کا عالم تھا۔ یہ فروری مارچ کے دن تھے۔ دیہات کی کھلی فضا میں یہ موسم بھی کافی خنک ہوتا ہے۔ ہم نے گھوڑے ایک جگہ باندھے اور ایک کانسٹیبل کو نگرانی پر چھوڑ کر آگے بڑھے۔ اندر ایک جگہ آگ روشن تھی اور باتوں کی آواز آتی تھی۔ محتاط انداز سے چلتے ہم لوگ آگ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ایک شخص مزے لے لے کر سوہنی مہینوال کا قصہ بیان کر رہا تھا...... دوسرا شخص دیوار سے ٹیک لگائے چارپائی پر نیم دراز تھا۔ اُس نے دونوں ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں اور دو آدمی مٹھیاں بھر رہے تھے۔ فضا میں تاڑی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ایک شخص بولا۔ ''میرا خیال ہے اُستاد سو گیا۔''

نیم دراز شخص کی غنودگی سے بھرپور آواز آئی۔ ''اوئے میں نہیں سویا...... ہاں آگے بتا اُس اُلو کے پٹھے نے سوہنی کی ساری دُکان خرید لی۔ پھر کیا ہوا۔''

کہانی سنانے والا بولا۔ ''اُستاد! وہ تو پرانی بات ہو گئی اب تو سوہنی کا خصم اُس کا گھٹ بھرنے والا ہے۔ تُو سن کیا رہا ہے؟''

اُستاد نے کہانی سنانے والے کو ایک ننگی گال دی اور بولا۔ ''چل سو جا پھر جا کر تُو بھی۔'' ساتھ ہی اس نے ایک زوردار ٹانگ داستان گو کی پسلی پر ماری وہ چمگادڑ کی طرح اُڑ کر دو گز دور جا گرا۔

......اُس وقت میں پستول تانے جھاڑیوں سے نکل آیا۔ اے ایس آئی میرے ساتھ تھا۔ ''خبردار!'' اُس کی آواز سناٹے میں گونجی، کوئی حرکت نہ کرے۔'' وہاں کل پانچ افراد تھے۔ سب کا نشہ ہرن ہو گیا۔ چارپائی پر دراز شخص بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ساتھیوں کی طرح اُس کی آنکھوں میں بھی خوف تھا لیکن حیرت انگیز تیزی سے اُس نے اپنے خوف پر قابو پایا اور بولا۔

''کیا بات ہے بادشاہو! کیا قصور ہو گیا ہے ہم سے؟''

میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہی قہر سنگھ ہے۔ جوڑے کے نیچے اُس کا چوڑا چکلا چہرا اور چہرے کے نیچے تنومند گردن تھی۔ اُس کی شکل میں عجیب طرح کی سختی تھی۔ اُس کا نام ٹھیک ہی قہر سنگھ رکھا گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اصل نام کچھ اور ہو بعد میں قہر سنگھ پڑ گیا ہو۔ حالانکہ وہ بڑی شرافت سے بول رہا تھا مگر اس شرافت میں چھپی ہوئی بدمعاشی مجھے وارننگ دے رہی تھی کہ ہوشیار ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''یہاں تم لوگ کیا کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''زمین آباد کر رہے ہیں جی!''

''کس کی اجازت سے؟''

''جی وہ اپنے...... تحصیلدار صاحب کے حکم سے۔''

قہر سنگھ کا یہ فقرہ مجھے بہت کچھ سمجھا گیا۔ پہلے وہ چوہدری صاحب کا نام لینے لگا تھا اور میرے سوال کا صحیح جواب بھی یہی بنتا تھا مگر پھر عین موقع پر وہ تحصیلدار کو درمیان میں لے آیا تھا۔ اُس کا یہ فقرہ بتا گیا کہ ویروالی کے چوہدری خاندان سے اُس کا کوئی ناجائز رابطہ ہے۔

میں نے ثبوت پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''جناب! میں کل آپ کو کاغذات دکھا دوں گا۔''

''اس وقت کیا ہے تمہارے پاس!'' میں نے گرج کر پوچھا۔

''اس وقت تو میری زبان ہی ہے جی!'' وہ ذرا تنک کر بولا۔

''تم سب کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔''

اُس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اُس وقت میرا ایک کانسٹیبل جو بیرک میں گھس گیا تھا ا
بندوق تھامے اندر سے برآمد ہوا۔ ''خاں صاحب! اندر ناجائز اسلحہ ہے۔ اس طرح کی
رائفلیں اور پڑی ہیں۔''

جونہی کانسٹیبل کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ درختوں کے قریب کھڑے تین اف
بھاگ نکلے۔ انہوں نے اُس ایک لمحہ سے فائدہ اُٹھایا تھا جب ہم کانسٹیبل کی بات سن ر
تھے۔ میرے ساتھی اُن کے پیچھے بھاگے۔ چوتھے شخص نے بھی موقعے سے فائدہ اٹھانا
مگر میرے پستول سے شعلہ نکلا اور گولی اُس کی ران میں پیوست ہوگئی۔ قہر سنگھ نے لپک
جھپٹا مارا اور پستول میرے ہاتھ سے گرا دیا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا لیکن میں چھلانگ لگا کر ا
کے اُوپر گرا۔ اُس کے حلق سے غراہٹ نکلی اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گ
پھر میرا ایک طوفانی مکہ کھا کر وہ چارپائی پر گر پڑا۔ اُس کی ناک سے خون آبشار کی طرح ب
لگا تھا۔ دفعتہً اُس نے میلے سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور آہنی ٹوکا نکال لیا۔ ٹوکا دیکھتے
میں سمجھ گیا کہ میں صحیح جگہ پہنچا ہوں۔ قہر سنگھ نے ٹوکا دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اُس
آنکھوں سے دیوانگی جھلک رہی تھی۔ خطرناک لہجے میں بولا۔

''چلا جا تھانیدار! ورنہ مارا جائے گا۔ میں کہتا ہوں چپ چاپ چلا جا۔'' واقعی اُس
انداز کسی بھی تھانیدار کو واپس تھانے بھیج سکتا تھا، لیکن میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا
اب قہر سنگھ اور میں اس طرح کھڑے تھے کہ ہمارے درمیان پستول تھا۔ آگ کی روشنی میں
اُس کا دستہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بارہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ قہر سنگھ بھی جا
چکا تھا کہ میں پستول کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ درختوں سے گولیاں چل
کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا اے ایس آئی بلند آواز میں ماتحتوں کو ہدایتیں دے رہا تھا
میں نے آخری مرتبہ پستول کو دیکھا۔ درمیانی فاصلے کو نظروں میں تولا۔ ذہن میں وقت
حساب جوڑا اور اچانک پستول کی طرف دوڑا۔ میرے حرکت میں آنے کے ساتھ ہی قہر سنگھ
بھی متحرک ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ٹوکا بلند ہو چکا تھا۔ وہ پستول پکڑنے سے پہلے مجھ پر وا
کرنا چاہتا تھا۔ اِدھر میں نے پستول اٹھایا اُدھر قہر سنگھ کا قاتل ٹوکا چمکا۔ میں نے دائیں پہل
پر جھک کر اپنا سر بچایا اور ایک طرف نکل گیا۔ چند فٹ آگے جا کر میں تیزی سے گھوما اور قہ

سنگھ کے ہاتھ کو نشانہ بنایا گولی عین نشانے پر بیٹھی اور قہر سنگھ جو پھر میری طرف لپک رہا تھا۔
بازو پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔

''خبردار! دوسری گولی سر میں ماروں گا۔'' میں نے وارننگ دی۔ قہر سنگھ نے خون بار
نظروں سے مجھے دیکھا اور دانت کچکچا کر رہ گیا۔

☆======☆======☆

میرا اندازہ درست نکلا۔ قہر سنگھ کا رابطہ ''ویروالی'' کے چوہدریوں سے تھا۔ اگلے ہی
روز وہ تھانے پہنچ گئے۔ میں اُس وقت قہر سنگھ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ میرا واحد سوال یہی تھا
کہ یوسف ولد چوہدری اللہ دتہ سے اُس کی کیا دُشمنی ہے اور اُس نے اُس پر قاتلانہ حملے
کیوں کیے؟

قہر سنگھ کچھ بھی بتانے سے انکاری تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے ''پیچھے'' پر بھروسہ
کر رہا تھا۔ اُسے امید تھی کہ چھوٹ جائے گا۔ دس بجے کے قریب چوہدری ست نام سنگھ کی
جیپ تھانے کے سامنے رُکی۔ ست نام سنگھ، چوہدری مہتاب سنگھ کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔
ان لوگوں کی پہنچ دور تک تھی۔ مجھے محتاط ہونا پڑا۔ ست نام سنگھ نے مجھ سے پوچھا کہ قہر سنگھ پر
الزام کیا ہے۔ میں نے بتایا کہ 307 اور 320 کا کیس ہے۔ اس کے قبضے سے ناجائز اسلحہ
برآمد ہوا ہے۔ مزید برآں اس شخص نے قتل کی نیت پر مجھ پر حملہ کیا ہے۔ اس کے خلاف کافی
دنوں سے تحقیق ہو رہی تھی۔ پولیس کے پاس اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قاتلانہ حملہ میں
ملوث رہا ہے۔

ست نام سنگھ نے کہا۔ ''نواز خاں! باقی باتیں چھوڑو رات تم لوگوں میں جو ہاتھا پائی
ہوئی وہ صرف اس وجہ سے تھی کہ تم نے قہر سنگھ کے پاس سے ناجائز اسلحہ برآمد کیا تھا...... تو
میں یہ بتانے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ وہ اسلحہ ناجائز نہیں تھا...... یہ رہے اُن پانچوں
رائفلوں کے لائسنس۔''

میں نے لائسنس دیکھے وہ بالکل درست تھے۔ ست نام سنگھ نے اُس زمین کے
کاغذات بھی میرے سامنے رکھ دیے جس پر قہر سنگھ نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ کہنے لگا۔ ''نواز
خاں! یہ اُس بیلے کے کاغذات ہیں۔ اچھی طرح دیکھ لو۔ قہر سنگھ میری ہدایت پر ہی وہاں
کٹائی کر رہا تھا۔ باقی اب بھی اگر تم باہر سے ضمانت چاہتے ہو تو کوئی ایک نام لے دو،
ضمانت میں لے کر دوں گا۔''

صاف محسوس ہوتا تھا کہ ست نام سنگھ ہر قیمت پر قہر سنگھ کو چھڑانا چاہتا ہے۔ میں نے

کہا۔ ''چوہدری صاحب! میں سب کچھ بھول سکتا ہوں مگر یہ نہیں کہ قہر نے میرے ایک عزیز دوست پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اُسے اس بری طرح زخمی کیا گیا کہ وہ نہ صرف ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا بلکہ ابھی تک زندگی موت کی کش مکش میں ہے۔''

چوہدری کافی دیر تک مجھ سے بحث کرتا رہا پھر شام کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ میں جانتا تھا شام تک وہ کوئی تگڑی سفارش لے آئے گا، میں نے اس دوران قہر سنگھ کی زبان کھلوانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ جوتے کھا کر وہ اور زیادہ شیر ہوتا تھا اور بعض اوقات وحشیانہ قہقہے لگانے لگتا تھا۔ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی، نہایت سخت جان شخص تھا۔ مجھے یاد آیا، کہ طیش کے عالم میں اُس نے کس طرح یوسف کا گھوڑا ذبح کر دیا تھا۔ اُس کا چھوٹ جانا یوسف کے لیے بہت خطرناک تھا۔ وہ ایک غصیلا اور کریک شخص تھا۔

تاہم شام تک پے در پے ایسے واقعات ہوئے کہ مجھے قہر سنگھ کو چھوڑنا پڑا۔ پہلے علاقے کے چار پانچ بااثر افراد اُس کی سفارش لے کر آئے، پھر مجھے ایک اعلیٰ افسر کی دستی چٹھی موصول ہوئی، پھر شام کو چوہدری ست نام سنگھ خود ایس پی کو لے کر پہنچ گیا۔ میں نے قہر سنگھ کو ضمانت پر چھوڑ دیا۔ چوہدریوں کے زور کا تو مجھے پہلے بھی پتہ تھا لیکن اب ظاہر ہو گیا کہ وہ ناک اونچی رکھنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بہرحال میں ہتھیار ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ایسے فرعون فطرت چوہدریوں سے میں نے کئی بار ٹکر لی تھی اور اُن کی من مانیوں کی بھرپور مزاحمت کی تھی۔ میرے دل میں ایک شک تھا اسے رفع کرنے کے لیے میں اگلے روز امرتسر جا پہنچا۔ یوسف سے ملاقات ہوئی اُسے اب عام وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ حالت بہتر تھی اور اب وہ دھیمے لہجے میں بول بھی سکتا تھا۔ میں نے اُسے قہر سنگھ کے بارے تفصیل سے بتایا اور پوچھا کہ آیا اس شخص سے اُس کی کوئی عداوت ہے۔ یوسف نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے۔ یوں لگا جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ کچھ دیر خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ نے چوہدری ست نام سنگھ کا نام لے کر مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ ان لوگوں سے میری کوئی عداوت تو نہیں لیکن ایک شک مجھے اب ہو رہا ہے...... آج سے کوئی پانچ مہینے پہلے کی بات ہے، سردیوں کے دن تھے میں اپنے ایک یار کے ساتھ گھوڑے پر سوار شکار کے لیے نکلا ہوا تھا۔ جنگلی خرگوشوں کا پیچھا کرتے ہم ''ڈیروالی'' کی طرف نکل گئے۔ راستے میں ایک جگہ لڑکی نظر آئی۔ اُس نے مردانہ کرتا اور میلی سی دھوتی پہن رکھی تھی، کسی غریب گھر کی لگتی تھی۔ ویسے ہی...... دل میں شیطان آ گیا، میں اُسے چھیڑ بیٹھا۔

وہ تو ایک دم آگ بگولا ہو گئی۔ اُس نے کچھ ایسی بات کی کہ مجھے بھی غصہ آ گیا، گھوڑے سے اُتر کر میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ اُس نے میرے منہ پر تھوکا تو میں نے تھپڑ دے مارا۔ بات بڑھ گئی۔ وہ چیخ کر بولی۔ تجھے اسی جگہ ٹکڑے نہ کروا دیا تو میرا نام دلشاد نہیں۔ اتنے میں دو تین لڑکیاں بھاگتی ہوئی آ گئیں۔ ایک لڑکی کی زبانی پتہ چلا کہ مجھ سے جھگڑنے والی دراصل چوہدری ست نام سنگھ کی نوبیاہتا بیوی ہے۔ چوہدری ست نام سنگھ کا نام میں نے پہلے بھی کئی بار سنا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ست نام جیسے زبردست چوہدری کی بیوی اور اس لباس میں۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اُس نے بھیس بدلا ہوا تھا۔ گاؤں میں کسی سہیلی کی شادی تھی۔ لڑکیاں سوانگ بھر کر وہاں گیت گانے جا رہی تھیں۔ بہرحال ہم میں تکرار ہو ہی رہی تھی کہ چند گھڑ سوار نظر آئے۔ ایک لڑکی کی زبانی یہ سن کر میرا خون خشک ہو گیا کہ چوہدری ست نام آ رہا ہے۔ وہ قریب پہنچے تو دلشاد زور زور سے رونے لگی۔ ایک لڑکی نے سارا قصہ بیان کیا۔ ست نام کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے سوچا اگر یہاں اکڑ دکھائی تو کام بگڑ جائے گا۔ ست نام مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ میں نے اُس کے قریب پہنچ کر کہا۔

''بھائی! معاف کرنا مجھے معلوم ہوتا کہ یہ آپ کے گھرانے کی عورت ہے تو ایک لفظ زبان سے نہ نکالتا۔'' ویسے بھی یہ بات درست تھی، میں لڑکی کے میلے کچیلے لباس سے دھوکہ کھا گیا تھا۔ میری یہ بات ست نام سنگھ کے باپ کی سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے کہہ سن کر بیٹے کا غصہ ٹھنڈا کیا اور ہمیں چند جھڑکیاں دے کر وہاں سے رُخصت کر دیا۔''

...... میں نے یوسف کے سرہانے بیٹھ کر اُس کی ساری بات سنی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہو نہ ہو یہ اُسی واقعے کا شاخسانہ ہے۔ وہ ذرا سی بات ایک بتنگڑ بن چکی ہے۔ اپنے طور پر میں نے اس واقعے کی کڑیاں کچھ اس طرح جوڑیں۔ جھگڑے کے وقت چونکہ ست نام کے ساتھ اُس کا باپ بھی تھا لہٰذا وہ اپنے طیش پر قابو پا گیا۔ بعد میں اُس کی بیوی نے اُسے بھڑکایا۔ ہو سکتا ہے اُس نے یوسف پر کچھ جھوٹے الزام بھی لگائے ہوں۔ بہرحال اُس نے شوہر کو اس قدر اُکسا دیا کہ وہ یوسف کی جان لینے پر آمادہ ہو گیا۔ یوسف جیسے چھوٹے زمیندار کی جان لینا ست نام کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ یہ تو ایسا تھا جیسے کوئی چیونٹی کو مسل دے۔ اُس نے اس چیونٹی کو مسلنے کے لیے قہر سنگھ کی اُنگلیاں استعمال کیں لیکن یہاں وہ غیبی طاقت آڑے آئی جو ہر شے پر قادر ہے۔ حیرت انگیز طور پر یوسف قاتلانہ حملوں سے محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ قہر سنگھ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ آخر ایک ناکامی کے بعد اُس نے یوسف کا گھوڑا تک تہ تیغ کر ڈالا......

میں نے ہسپتال کی اُس وارڈ میں بیٹھ کر جو تجزیہ کیا تھا وہ بعد میں نوے فیصد درست ثابت ہوا۔ صرف اتنی بات کا اور پتہ چلا کہ دلشاد کور نے اُس روز اپنی ماں کے دودھ کی قسم کھائی تھی کہ وہ یوسف کے ٹکڑے کروا کے چھوڑے گی...... نو بیاہتا بیوی کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ جب اُس نے مرچ مسالا لگا کر شوہر کے کان بھرے تو اُسے یوسف کا قتل فرضِ اولین محسوس ہونے لگا۔ اُس نے موت کے ہرکارے قہر سنگھ کو بلایا اور یوسف کے پیچھے لگا دیا...... یہ تھا پورا قصہ۔

☆======☆======☆

کوئی ایک ماہ بعد یوسف بیساکھی کے سہارے چلنے میں کامیاب ہوگیا۔ زمیندار باپ نے اُس پر پانی کی طرح روپیہ بہایا تھا۔ اُس کے ظاہری زخم تو ٹھیک ہو گئے تھے لیکن اندرونی روگ وہیں کا وہیں تھا۔ موت کا خوف اُس کے سر سے ٹلا نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو یوسف کو اُس کے گناہوں کی سزا مل رہی تھی۔ دلشاد کا آنچل کھینچنے سے پہلے زمینداری کے گھمنڈ میں اُس نے نہ جانے کتنی غریب لڑکیوں کی بددعائیں لی تھیں۔ وہ دیہات کا ایک روایتی امیرزادہ تھا، اور ایسے امیرزادوں کی تمام برائیاں اُس میں موجود تھیں۔ آخر سیر کو سوا سیر مل گیا تھا۔

اگر میں یوسف کی طرفداری کر رہا تھا تو صرف اس لیے کہ میری لاپرواہی نے اُسے نقصان پہنچایا تھا۔ دوسرے یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ وہ مسلمان ہے، جیسا بھی برا بھلا ہے کلمہ گو تو ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چوہدری ست نام اپنا انتقام بھولے گا نہیں۔ بدلے کی یہ آگ لمبی عداوت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے ایک روز میں چوہدریوں کی حویلی جا پہنچا۔

چوہدری ست نام نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنی عالیشان بیٹھک میں لے گیا۔ بیٹھک کی ایک ایک شے سے چوہدریوں کی امارت جھلکتی تھی۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اس بیٹھک میں آ چکا تھا۔ یہ کوئی دو سال پرانی بات تھی۔ مگر اُس وقت کی بیٹھک اور اب کی بیٹھک میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سب پرانی چیزیں اُٹھا دی گئی تھیں۔ نئے سے نیا فرنیچر اور سجاوٹ کا سامان کمرے میں بھرا پڑا تھا۔ ملازموں کی ایک فوج خدمت کے لیے موجود تھی۔ تکلفات سے فارغ ہو کر میں اصل موضوع پر آیا۔ اشاروں کنایوں میں مَیں نے چوہدری کو بتا دیا کہ یوسف کے ساتھ اُس کی دشمنی سے میں آگاہ ہو چکا ہوں۔ یہ اطلاع پا کر بھی ست نام کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نظر نہیں آئی وہ اطمینان سے حقہ گڑگڑاتا رہا۔

آخر میں نے کھل کر بات کی۔ میں نے کہا۔

''چوہدری صاحب! دُشمنی کمزور کی ہو یا طاقتور کی نقصان دہ ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے یوسف آپ کے جوڑ کا نہیں مگر اس جھگڑے میں آپ کا کچھ نہ کچھ نقصان ضرور ہوگا۔ چاہے وہ جان کا ہو۔ مال کا ہو یا نیک نامی کا۔ میں مانتا ہوں کہ یوسف نے ایک غلطی کی تھی۔ اس غلطی کی اُسے کافی سزا مل چکی ہے۔ وہ زندگی بھر کے لیے معذور ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ اُسے معاف کر دیں۔ دل صاف کر کے ایک دوسرے کو گلے لگا لیں...... وہ خود یہاں آ کر آپ سے معافی مانگ لے گا......''

چوہدری ست نام اطمینان سے میری باتیں سنتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اثر لے رہا ہے۔ مگر جب میرے چپ ہونے پر وہ بولا تو مجھے حیران کر گیا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ اس قدر سنگدل اور کینہ پرور ثابت ہوگا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلیری سے بولا۔

''نہیں نواز خاں! یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سب کچھ اُس حرامزادے کو اُس وقت سوچنا چاہیے تھا جب وہ چوہدری ست نام کی جو میں اُس کی بیوی کو تھپڑ مار رہا تھا۔ اُس کی بے حرمتی کر رہا تھا۔ یہ اُس کی بڑی خوش قسمتی ہے نواز خاں! جو وہ اب تک سانس لے رہا ہے۔ اُس کی سانس میرے سینے پر آرے کی طرح چلتی ہے...... سمجھ آئی تجھے۔''

چوہدری ست نام کے الفاظ میں جو خطرناک دھمکی پوشیدہ تھی وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں کوئی آدھ گھنٹہ چوہدری کے پاس بیٹھا لیکن وہ اس موضوع پر دوبارہ بات کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ میں نے دو تین بار گفتگو کا رُخ موڑنے کی کوشش کی مگر وہ ہر بار کنی کترا گیا۔ اُس کا رویہ حوصلہ شکن بلکہ تاؤ دلانے والا تھا۔

میں تھانے واپس آ گیا اور اس گتھی کو سلجھانے کی راہ ڈھونڈنے لگا۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ ایک دفعہ بڑے چوہدری مہتاب سنگھ سے ملاقات کی جائے۔ وہ بیٹوں کی نسبت کچھ تحمل مزاج شخص تھا۔ ویسے بھی وہ مجھے جانتا تھا۔ دو سال پہلے زمین کے ایک جھگڑے میں مَیں نے اُس کی مدد کی تھی...... اگلے روز دوپہر کے وقت میں چوہدری مہتاب سے ملنے ویروالی پہنچا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ آج کل پرانی حویلی میں رہتا ہے اور کچھ بیمار ہے۔ یہ حویلی، نئی حویلی کے پچھواڑے ایک باغ میں واقع تھی۔ میں دروازے پر پہنچا تو لمبی مونچھوں والے ایک نوکر نے استقبال کیا۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے مہتاب سنگھ سے ملانا نہیں چاہتا، یا ملانے سے پہلے کسی سے اجازت لینا چاہتا ہے۔ بہرحال میں نے اُسے زیادہ ٹال مٹول کا موقع نہیں دیا اور

اندر چلا گیا۔ چوہدری مہتاب سنگھ حویلی کے ایک کمرے میں تنہا بستر پر لیٹا تھا۔ وہ خاصا کمزور نظر آ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اُس نے مجھے پہچانا اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کیسے آئے ہو نواز خاں!''

میں نے کہا۔ ''سنا تھا آپ بیمار ہیں، سوچا دیکھ آؤں۔''

مہتاب سنگھ نے ایک گہری سانس لی۔ ''نواز خاں بڑھاپا بیماری ہے، اور دولتمند بڑھاپا دوہری بیماری ہے۔ ایک طرف سے انسان کو بڑھاپا مارتا ہے اور دوسری طرف سے دولت...... یہ دولت بڑی بے وفا ہے نواز خاں! خون کے رشتوں میں زہر گھول دیتی ہے......''

مجھے بوڑھے مہتاب سنگھ کی باتوں سے کسی اور ہی معاملے کی بو آ رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ اُسے کریدنا شروع کیا اور وہ جلدی جلدی اپنے خول کے اندر سے برآمد ہوتا چلا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے قدرت نے کسی خاص مقصد کے تحت مجھے یہاں بھیجا ہے۔ مہتاب سنگھ بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔ وہ مجھے بہت کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ اپنی اولاد کی طرف سے انتہائی پریشان تھا۔ خاص طور پر بڑا بیٹا ست نام سنگھ اُس سے نہایت ابتر سلوک کر رہا تھا۔

بوڑھے نے کہا۔ ''انگریزی دواؤں کے نام پر یہ لوگ نہ جانے مجھے کیا کچھ کھلاتے رہتے ہیں۔ دن بدن خون خشک ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کسی دن سوتے میں کوئی میرا گلا کاٹ جائے گا۔ میری ارتھی کا سپنا میری اولاد کی آنکھوں میں دن رات سمایا رہتا ہے۔ میں اُن کے چہروں پر یہ لکھا ہوا دیکھتا ہوں۔ ''باپو! تم مرکیوں نہیں جاتے، تم مرکیوں نہیں جاتے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''چوہدری صاحب! میں کل یا پرسوں ایک آدمی آپ کے پاس بھیجوں گا۔ آپ کسی طرح اُسے حویلی میں ملازم رکھ لیں۔ وہ شخص شکل سے سیدھا سادا دیہاتی نظر آتا ہے لیکن ایک نہایت ہوشیار سب انسپکٹر ہے۔ اس قسم کے کاموں کا اُسے وسیع تجربہ ہے۔ چند دنوں میں وہ پوری تحقیق کر لے گا۔ اگر آپ کے شبہے درست ہوئے تو پھر ہم اگلا قدم اٹھائیں گے۔ آپ کسی طرح کا اندیشہ نہ کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور رہوں گا......''

بوڑھے کو پوری طرح سمجھا بجھا کر میں اُٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میری چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجانے لگی۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ چوہدری ست نام سنگھ دروازے پر نظر آیا۔ پستول اُس کے

کندھے سے لٹک رہا تھا۔ اُس کے عقب میں کچھ اور چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک چہرا قہر سنگھ کا تھا۔ وہ تیز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے نواز خاں؟'' چوہدری ست نام مسکرا کر بولا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''چوہدری صاحب کی بیماری کا سنا تھا۔ خیریت پوچھنے چلا آیا۔ سوچا تھا واپسی پر آپ سے بھی ملتا جاؤں گا۔''

''......تو فارغ ہو گئے ہو؟'' ست نام معنی خیز لہجے میں بولا۔

''ہاں چلئے۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

بوڑھے مہتاب کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ ست نام نے ملازم کو پانی پلانے کا حکم دیا اور خود مجھے ساتھ لیتا ہوا باہر نکل آیا۔ میں صدر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جب اچانک ست نام نے میرا راستہ روک لیا۔ ''ادھر نہیں نواز خاں...... ادھر، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' اُس نے ایک دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اُس کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ قہر سنگھ دو ساتھیوں کے ساتھ ہمارے پیچھے تھا۔ کمرے میں پہنچ کر ست نام سنگھ نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کا چہرہ دیکھا اور مجھے وہاں عجیب سی کیفیت نظر آئی۔ یوں لگا جیسے میں ایک بالکل اجنبی شخص کے سامنے بیٹھا ہوں۔ اُس نے جلتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''نواز خاں! میں تیری بہت عزت کرتا تھا...... لیکن افسوس کہ تُو نے ضرورت سے زیادہ جان لیا ہے......''

یہ فقرہ نہیں تھا۔ ایک ٹائم بم تھا، جس کی گراریاں کافی دیر سے گھوم رہی تھیں اور اب وہ ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی فقرہ نہیں تھا۔ اس میں ست نام سنگھ نے سب کچھ بیان کر دیا تھا۔ اس میں مہتاب سنگھ کے خدشوں کی تصدیق بھی تھی اور نئی حویلی میں ہونے والی سازشوں کی جھلک بھی۔ اس میں میری موت کا اعلان بھی تھا اور ست نام سنگھ کی طاقت کا اظہار بھی۔ یہ الفاظ سننے کے بعد بھی اگر میں خاموش بیٹھا رہتا تو اُس کا مطلب تھا مجھے اپنی زندگی سے پیار نہیں اور میں کچھ نہایت قیمتی لمحے ضائع کر رہا ہوں...... میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ ریوالور فضول ہو جاتا مجھے اسے استعمال کرنا تھا۔ میرا ہاتھ بجلی کی تیزی سے ریوالور تک گیا۔ اس سے پہلے کہ قہر سنگھ مجھ پر جھپٹتا میں نے چھلانگ لگائی اور ست نام سنگھ کے سر پر پہنچ گیا۔ میراں بایاں بازو اُس کی گردن کے گرد حمائل ہوا اور دائیں ہاتھ سے ریوالور اُس کی کنپٹی سے لگا دیا۔

''خبردار!'' میں پوری ایمانداری سے بولا۔ ''کوئی بھی ہلا تو اسے گولی ماردوں گا۔''
قہر سنگھ میرا یہ روپ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ پر ابھی تک میری گولی کا زخم تھا...... وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ میرے ہاتھ لبلبی پر تھے اور لبلبی اپنا نصف فاصلہ طے کر چکی تھی۔ انگلی کی ایک جنبش ست نام سنگھ کے مغرور کھوپڑے میں سوراخ کرسکتی تھی۔ میں نے تیز نظروں سے قہر سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کو گھورا اور ست نام کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ حویلی کے دوسرے ملازم بھی کونوں کھدروں سے نکل آئے تھے اور وحشت زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ہر شخص کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس سناٹے میں صرف کبھی کبھی ست نام کی ہانپتی ہوئی آواز آتی تھی۔ وہ مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ باہر وہ تانگہ کھڑا تھا جس پر میں یہاں پہنچا تھا۔ میں ریوالور کے زور پر ست نام کو تانگے پر لایا۔ جونہی ہم پچھلی نشست پر بیٹھے ہوشیار کوچوان نے گھوڑا آگے بڑھا دیا......

☆======☆======☆

ست نام سنگھ کی گرفتاری کے بعد دو مہینوں کے اندر اندر کئی واقعات رونما ہوئے۔ درحقیقت اس گرفتاری نے ''ویروالی'' کے چوہدریوں کی کایا پلٹ دی۔ مہتاب سنگھ نے اپنے دونوں بیٹوں کو عاق کر دیا۔ قہر سنگھ سمیت ست نام سنگھ کے کئی ساتھی گرفتار ہوئے اور اُن پر سنگین نوعیت کے مقدمات بنے۔ خود ست نام سنگھ اور اُس کے بھائی کو قتل، اقدام قتل اور اغوا کے کئی مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوئے اور اُن کی بیویاں عرش سے فرش پر آ گئیں۔ یوسف صحت یاب ہو کر اپنے گاؤں واپس گیا۔ جان کے ''جان لیوا'' خوف سے چھٹکارا پا کر وہ بہت خوش تھا۔ ان گرفتاریوں سے بہت سے لوگ خوش ہوئے لیکن میرے خیال میں سب سے زیادہ خوشی اُس عورت کو ہوئی ہوگی، قہر سنگھ جس کا ''مرد'' تھا۔ یقیناً جہانی نے جب قہر سنگھ کی عمر قید کا سنا ہوگا تو وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ گردوارے ماتھا ٹیکنے گئی ہوگی۔

......آج بھی کبھی جب میں اس کیس کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ بعض اوقات غرور اور بے جا ہٹ دھرمی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ اگر اُس روز ست نام سنگھ میری بات مان لیتا اور یوسف کو معاف کر دیتا تو میرے ذہن میں کبھی اُس کے باپ سے ملنے کا خیال نہ آیا اور یوں اُس کے جرم پر ہمیشہ پردہ پڑا رہتا۔ کسی نے سچ کہا ہے انسان خود اپنے پاؤں پر چل کر اپنے انجام تک پہنچتا ہے۔

☆======☆======☆

محبت کی ماری

گزرے وقت کی باتیں یاد کرنے بیٹھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ ایک بہت پرانی بجھی بجھی سی فلم پردۂ اسکرین پر چل رہی ہے۔ لاتعداد واقعات اور اَن گنت کیس آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ لکھنے بیٹھوں تو کئی کتابیں کالی ہو جائیں لیکن میری خواہش ہوتی ہے کہ صرف وہ واقعات آپ کی خدمت میں پیش کروں جو دلچسپ ہوں اور ذرا مختلف قسم کے ہوں۔ اس کے علاوہ میرا دل بھی یہ چاہتا ہے کہ سب کہانیاں ایک ہی ماحول کی نہ ہوں۔ اُن میں دیہاتوں، شہروں، جنگلوں ہر جگہ کے واقعات ہوں اور ہر دفعہ کوئی نیا منظر آپ کی آنکھوں کے سامنے آئے۔ اس دفعہ جو واقعہ میں نے آپ کے لیے چنا ہے اس کا تعلق ضلع گجرات کے ایک دور افتادہ گاؤں سے ہے۔ آپ اس گاؤں کا نام کندی وال سمجھ لیں۔ کندی وال جرنیلی سڑک سے قریباً چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ راستہ دشوار اور زندگی کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کندی وال کا تھانہ بھی بس عجائب خانہ ہی تھا۔ چار پانچ کچے کوٹھے تھے جن پر ٹاہلی اور بکائن کے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ پورے تھانے میں صرف دو میز اور چار کرسیاں تھیں۔ باقی کا کام چارپائیوں سے لیا جاتا تھا۔ تھانے کے بالکل قریب ایک چھوٹا کنواں یعنی کھوئی تھی۔ گاؤں کے مرد و زن سارا دن یہاں سے پانی بھرتے تھے۔ کھوئی کا پانی بہہ بہہ کر تھانے میں آتا تھا اور احاطے میں ہر وقت دلدل بنی رہتی تھی۔

مجھے اس تھانے میں آئے ہوئے بیس پچیس دن ہوئے تھے کہ گاؤں سے باہر کھیتوں میں ایک قتل ہو گیا۔ اس واقعے کی اطلاع مجھے صبح آٹھ بجے ملی۔ میں اپنے اے ایس آئی رمضان کے ساتھ موقع پر پہنچا۔ گاؤں کی آبادی جس جگہ ختم ہوتی تھی وہاں سے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان کھیتوں میں بھی اِکا دکا مکان موجود تھے۔ ایک ایسا ہی مکان اسماعیل نامی ایک زمیندار کا تھا۔ اسماعیل تو فوت ہو چکا تھا اب اس کے دو بیٹے اپنی ماں کے ساتھ یہاں رہتے تھے۔ بڑا بیٹا اکبر شادی شدہ تھا جبکہ چھوٹے اسلم کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ جیل میں ہے۔ اس مکان کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا حاطہ بھی تھا جہاں چند بھینسیں، ایک گھوڑا اور ایک کتا بندھا ہوا تھا۔ یہ بلڈاگ کتا کافی جسیم تھا اور رات کو اس کے بھونکنے کی آواز مجھے کئی فرلانگ دور تھانے میں آیا کرتی تھی۔

مقتول کی لاش اس احاطے سے قریباً تیس گز دور گندم کے ادھ پکے کھیتوں میں پڑی تھی۔ موقع پر کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں گاؤں کا چوہدری محمد بوٹا اور پٹواری ہاشم بھی شامل تھا۔ ہاشم قانون کی باریکیاں سمجھنے والا ہوشیار چالاک بندہ تھا۔ اس نے کسی کو کھیت میں گھسنے دیا تھا اور نہ کسی چیز کو ہاتھ لگانے دیا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر خوف و ہراس پایا جاتا تھا اور وہ دائرے کی شکل میں دور دور کھڑے لاش کا نظارہ کر رہے تھے۔ یہ لاش ایک تیس پینتیس سالہ شخص کی تھی۔ اس نے ڈبی دار کپڑے کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشاوری چپل تھی۔ سر ننگا اور شیو ذرا بڑھی ہوئی تھی۔ وہ اوندھے منہ خشک زمین پر پڑا تھا۔ بظاہر جسم پر کوئی زخم نظر نہیں آ رہا تھا لیکن سر کے پاس زمین پر خون کے دھبے تھے۔ یہ شخص اس گاؤں کا نہیں تھا اور نہ ہی اسے کبھی یہاں دیکھا گیا تھا۔

میں نے قریب جا کر لاش کا معائنہ کیا متوفی شکل وصورت سے جرائم پیشہ نظر آتا تھا۔ اُس کی قمیض کے نیچے شلوار کے نیفے میں ایک بڑے پھل کا چاقو موجود تھا۔ میں نے اُسے کندھوں سے تھام کر بڑے آرام سے سیدھا کیا۔ اُس کی دائیں کنپٹی پر ایک زخم تھا۔ یہ زخم کسی تیز دھار آلے کا نہیں تھا۔ ڈنڈے اینٹ یا لاٹھی وغیرہ سے ضرب لگائی گئی تھی۔ لاش کے اردگرد کی زمین دیکھنے سے صاف طور پر پتہ چلتا تھا کہ یہاں دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ متوفی کے پاؤں سے ایک چپل اُتر چکی تھی۔ اُس کے گریبان سے ٹوٹنے والے دو بٹن بھی موقع پر پڑے تھے۔ اس کے علاوہ زمین پر پاؤں رگڑے جانے کے مدھم نشان بھی نظر آ رہے تھے۔ جو سب سے عجیب شے موقع پر پائی گئی وہ تین مرے ہوئے چوہے تھے۔ یہ چوہے کیسے مرے اور لاش کے قریب کیوں پڑے ہوئے تھے اس کا جواب حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مرنے والے کی لاش کے پاس ہی ایک رومال گرا پڑا تھا۔ اس رومال میں دو تین پراٹھے بندھے ہوئے تھے۔ یہ قیمے والے پراٹھے تھے۔ رات کسی وقت چوہوں نے اُن پراٹھوں پر ہلا بولا تھا۔ یہ لذیذ کھانا اُن کے لیے آخری ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ پراٹھوں میں زہر تھا۔ ممکن تھا کچھ اور چھوٹے موٹے جاندار بھی کھیت میں مرے پڑے ہوں لیکن لاش کے پاس صرف یہ چوہے ہی نظر آ رہے تھے۔

موقعہ سے شہادتیں جمع کرتے وقت میں نے پراٹھوں اور مرے ہوئے چوہوں سمیت سب چیزیں اٹھوا لیں۔ موقعہ واردات کا نقشہ تیار کرایا گیا اس کے بعد لوگوں کے بیان لیے گئے۔ اُن دنوں دیہات میں قتل و غارت روزمرہ کی بات تھی۔ آئے دن کسی کھیت نالے یا جوہڑ میں کوئی لاش مل جاتی تھی۔ قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے لوگ دشمنیاں خود چکاتے تھے۔ لہٰذا لاشیں بھی ملتی رہتی تھیں لیکن اس لاش کو دیکھنے کے بعد لوگوں پر عجیب طرح کا خوف و ہراس طاری تھا۔ وہ کھل کر کوئی بیان بھی نہیں دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ چوہدری بوٹا خود بھی کسی بچے کی طرح سہا ہوا

تھا۔ اس گاؤں میں سب سے ہوشیار شخص پٹواری ہاشم ہی تھا مگر اُسے بھی شہر کی ہوا سال میں ایک آدھ بار ہی لگتی تھی۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی زبردست توہم پرست تھا۔ پیروں فقیروں، تعویذ گنڈوں اور ہوائی چیزوں پر پختہ یقین رکھنے والا۔

میں نے اُسے ایک طرف لے جا کر ٹٹولا تو وہ کہنے لگا۔ ''جناب! گاؤں والوں کا خیال ہے کہ یہ قتل شتل کچھ نہیں اس بندے کو ہوائی چیزوں نے مارا ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے پٹواری ہاشم کو گھورتے ہوئے کہا۔

ہاشم کی نظریں بھینسوں والے کچے احاطے کی طرف اُٹھ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ ڈری ڈری نظروں سے شکاری کتے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ کافی بڑا کتا تھا۔ آنکھیں بالکل سرخ اور منہ بھینس کے بچھڑے جتنا تھا۔ اُس کے منہ پر جالی چڑھی ہوئی تھی ورنہ وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے ہاشم نے پوچھا۔ ''آپ نے سائیں سانول کا نام سنا ہوا ہے؟'' میرا جواب نفی میں تھا۔ ہاشم بولا۔ ''سائیں سانول علاقے کا بڑا مشہور آدمی ہے۔ یہاں سے کچھ دور روہی نالے کے کنارے جھونپڑی ڈال کر رہتا ہے۔ کسی زمانے میں بڑا سوہنا جوان تھا۔ کھیت مزدوری کرتا تھا۔ پھر اُس نے داڑھی رکھ لی اور چلے کاٹنے لگا۔ آہستہ آہستہ بالکل ہی درویش بن گیا۔ اب سارا دن اپنی جھونپڑی میں پڑا رہتا ہے۔ نہ کسی سے بات کرتا ہے نہ کسی بات کا جواب دیتا ہے۔ سائیں سانول کے پاس ہر وقت چار پانچ کتے موجود رہتے ہیں۔ وہ پتہ نہیں کہاں سے کتوں کے چھوٹے پلے لے آتا ہے۔ انہیں بڑے پیار سے پالتا پوستا ہے۔ تازہ گوشت کھلاتا ہے اور رات کو اپنے ساتھ جھونپڑی میں لے کر سوتا ہے۔ پھر کتے بڑے ہو جاتے ہیں تو ایک ایک کر کے چلے جاتے ہیں یا وہ خود انہیں کہیں چھوڑ آتا ہے۔ اس کے بعد وہ پالنے کے لیے نئے بچے لے آتا ہے..... اب پچھلے ڈیڑھ دو سال سے اُس نے کتے پالنے کم کر دیے ہیں پھر بھی ایک دو کتے تو اُس کے پاس رہتے ہی ہیں۔''

میں نے ہاشم کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''تم ہوائی چیزوں کی بات کرتے کرتے سائیں سانول کا ذکر لے کر بیٹھ گئے ہو۔''

وہ بولا۔ ''میں اسی طرف آ رہا تھا جناب..... یہ جو سامنے کتا آپ دیکھ رہے ہیں ناں..... دیکھ رہے ہیں ناں؟'' میں نے ''ہاں'' میں جواب دیا۔ وہ سرگوشی میں کہنے لگا۔ ''گاؤں والوں کا خیال ہے کہ یہ کتا نہیں..... کتے کے بھیس میں کوئی ہوائی شے ہے..... اُن کا کہنا ہے کہ یہ سائیں سانول کے کتوں میں سے ہے اور سائیں سانول کے کتے اصل میں کتے نہیں ہوتے..... آپ سمجھ رہے ہیں ناں میری بات۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے بھی اپنے جسم میں کپکپی سی محسوس ہوئی لیکن پھر میرا اعتماد اس کپکپی پر غالب آ گیا۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ بلڈاگ اصل میں کوئی ہوائی شے ہے۔'' ہاشم اقرار میں سر ہلانے لگا۔ وہ چکرا سا گیا تھا۔ حقیقت میں اُس کا خیال بھی وہی تھا جو بستی والوں کا تھا یعنی کہ یہ کتا اصل میں کتا نہیں ہے لیکن وہ میرے سامنے یہ بات ماننا نہیں چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔

''میں بستی والوں کی بات کر رہا ہوں جناب! وہ کہتے ہیں کہ اس کتے میں کوئی بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چلو مان لیا کہ بستی والے یہ کہتے ہیں لیکن کیوں کہتے ہیں۔ ہر خیال کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔''

وہ پُراسرار انداز میں بولا۔ ''وجہ تو بہت سی ہیں جناب...... مثلاً ایک وجہ تو یہی ہے کہ کتے کو ہر روز بہت سا تازہ گوشت کھانے کو مل جاتا ہے۔ اب یہ گوشت اس کے سامنے کون رکھ جاتا ہے کسی کو کچھ پتہ نہیں۔ بارش ہو طوفان ہو یہ گوشت کتے کو ملتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی رات کو کوئی اُس کے سامنے ذبح کیا ہوا خرگوش یا مرغ وغیرہ پھینک جاتا ہے۔ تین چار ماہ پہلے کی بات ہے ہمارے ہی گاؤں کے ایک شخص جوگندر سنگھ ماچھی نے سوچا کہ وہ رات کو چھپ کر دیکھے گا کہ کتے کے پاس کون آتا ہے۔ وہ شام پڑے چوری چھپے یہاں آیا اور مکئی کے کھیت میں گھس کر بیٹھ گیا۔ آدھی رات سے ذرا پہلے اُسے کالے سانپ نے ڈس لیا۔ وہ چیختا چلاتا گاؤں کے اندر پہنچا۔ فوراً اسے قریبی قصبے کے سنیاسی کے پاس پہنچایا گیا۔ بروقت دوا دارو سے اُس کی جان بچ گئی لیکن کئی دن تک ناک منہ اور کانوں سے خون آتا رہا۔ اس واقعے کے بعد لوگوں کو پختہ یقین ہو گیا کہ یہ کوئی معمولی کتا نہیں ہے۔ اب کئی لوگ چڑھاوے کے طور پر راتب بنا کر کتے کے سامنے رکھ جاتے ہیں۔ کبھی کوئی بکرے کی کلیجی پھینک جاتا ہے، کبھی گوشت اور کبھی قیمہ اُس کے سامنے نظر آتا ہے۔''

بڑی عجیب کہانی سامنے آئی تھی۔ ساری کمزور عقیدے کی بات تھی۔ جب اوپر والے پر بندے کا ایمان پختہ نہیں ہوتا تو وہ ہر اُس چیز سے خوف کھانے لگتا ہے جس کی سمجھ نہ آئے۔ یہاں سیدھے سادے دیہاتیوں کو یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ کتے کے سامنے تازہ گوشت کون پھینکتا ہے بس اس اُلجھن کو انہوں نے ہوائی چیزوں کا رنگ دے دیا تھا۔ میں نے کتے کے مالکوں سے بات کی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اسلم نامی ایک لڑکا جیل میں تھا۔ یہ کتا اُسی کا تھا۔ گھر میں اسلم کی ماں کے علاوہ بھابی اور بھائی بھی رہتے تھے۔ اس کے علاوہ تین اور ڈیڑھ برس کے دو بچے تھے۔ دوسرے لفظوں میں گھر کا سربراہ اسلم کا بڑا بھائی اکبر تھا۔ اکبر تیس سال کے لگ بھگ ایک تنومند شخص تھا۔ مکان کے ارد گرد چھ کھیت اُس کے اپنے تھے۔ وہ کھیتی باڑی کرتا تھا۔ بھینسوں کا دودھ نکالتا تھا

مرغیوں کے انڈے کھاتا تھا اور چین کی بانسری بجاتا تھا۔ اپنے گھر کے بالکل قریب لاش پائے جانے پر وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اس لاش کا کوئی تعلق اسلم کے بلڈاگ کتے سے ہے۔ مرنے والا شخص کتے کے لیے قیمے والے پراٹھے لایا تھا۔ یہ پراٹھے زہریلے تھے۔ یعنی وہ کتے کو مارنے کے لیے آیا تھا...... اور مر خود گیا تھا۔ وہ کیوں مرا تھا یہ سوال جتنا پیچیدہ تھا اتنا ہی اہم بھی۔ میں نے جب اس بارے میں اکبرے سے پوچھا تو وہ کانپتی آواز میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ ہمیں اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ اللہ جانے یہ بندہ کب یہاں آیا، کیوں آیا اور کیسے مارا گیا۔ مجھے تو صبح اذانوں کے وقت میری بیوی نے بتایا کہ شکارا بڑی دیر سے بھونکتا جا رہا ہے...... شکارا، اسلم کے کتے کا نام ہے جی...... میں لالٹین لے کر باہر نکلا۔ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی نظر نہیں آیا۔ اتنے میں کھیت کے اندر دو آوارہ کتے نظر آئے اُن کی طرف گیا تو لاش پر نظر پڑی۔ میرے پاس لائسنس والی رائفل ہے۔ میں نے لالٹین نیچے رکھ کر رائفل ہاتھ میں لے لی۔ اتنے میں گاؤں کے اندر سے گاماں پہلوان بھی پہنچ گیا۔ اُس نے زور سے آواز دے کر پوچھا، اکبرے کیا ڈھونڈ رہے ہو صبح سویرے۔ میں نے آواز دے کر اُسے پاس بلا لیا اور لاش دکھائی۔ لاش دیکھ کر وہ بہت ڈر گیا۔ کہنے لگا یار! مجھے تو اس جگہ سے ڈر لگ رہا ہے۔ تم اندر جاؤ، میں گاؤں والوں کو بلا کر لاتا ہوں۔''

اکبرے کے بعد میں نے اس کی جواں سال بیوی زینب اور ماں سے بھی بات چیت کی۔ وہ دونوں کچھ زیادہ ہی ڈری ہوئی تھیں۔ بڑھیا نے اپنے بیٹے کو کوستے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس مرن جوگے کو لکھ واری کہا ہے کہ اس کتے کو گھر سے نکال دے۔ پتہ نہیں کیا بلا چمٹی ہوئی ہے اُس کے ساتھ۔ اب تو میں ایک پل اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ آج ہی اپنے پوتروں کو لے کر بھائی کے گھر چلی جاؤں گی۔ یہ دونوں یہاں رہنا چاہتے ہیں تو شوق سے رہیں۔''

اکبرے کی بیوی بھی گھبرائی ہوئی تھی لیکن اتنا نہیں کہ گھر چھوڑنے کا سوچے۔ اُس نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''تھانیدار جی! آپ ہمارے گاؤں میں نئے نئے آئے ہیں اس لیے آپ کو پتہ نہیں۔ گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ کتا، روہی نالے والے سائیں سانول کا ہے۔ اس لیے جو اسے تنگ کرے گا پچھتائے گا...... آج یہ بات بالکل سچی نکلی ہے۔ یہ بندہ جو مرا ہے کتے کو زہر دینے آیا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ وہ کتے کے آگے پراٹھے پھینک کر چلا جاتا تو کون پوچھنے والا تھا۔ مگر سانول سائیں تو دیکھ رہا تھا۔ مجھے تو پورا یقین ہے جی، شکارے کو سائیں سانول نے بچایا ہے۔''

میں نے جن دوسرے افراد سے بیان لیا اُن سب نے یہی اشارہ دیا کہ یہ کوئی عام قتل نہیں

ہے اس کے پیچھے کوئی اَن دیکھا ہاتھ ہے۔ ظاہر ہے میں بھی ''اَن دیکھے'' ہاتھ پر اعتبار کر لیتا تو پھر تھانے میں بیٹھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بلکہ سرے سے تھانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہوائی چیزوں کا بھلا پولیس کیا بگاڑ سکتی ہے۔ یہ تو عاملوں فقیروں اور تعویذ گنڈے والوں کا کیس ہوتا ہے۔ میں صاف طور پر دیکھ رہا تھا کہ لاش کی کنپٹی پر کسی وزنی شے سے ضرب لگائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ موقعہ واردات پر کھینچا تانی کی نشانیاں بھی تھیں۔

''کسی سے دشمنی ہے تمہاری؟'' میں نے پوچھا۔ ''کوئی ایسا بندہ بھی ہے جو تمہارے کتے کو زہر دے کر مار سکتا ہو۔''

اکبرے کے چہرے پر سوچ کے آثار نظر آئے۔ کہنے لگا۔ ''جناب! ایک بندہ تو ایسا ہے لیکن میں غلط بات نہیں کروں گا۔ آخر خدا کو جان دینی ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ زہر دینے میں اُس بندے کا ہاتھ ہے۔''

میں اور اکبرا عام لوگوں سے ہٹ کر کچھ دور کھیت کے منڈیر پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو تم اپنے یقین اور غیر یقینی کی بات نہ کرو۔ جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔ کون بندہ ہے جس پر تم زہر دینے کا شبہ کر سکتے ہو۔''

اکبرے نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''جناب! اس کا نام غاٹا چنگڑ ہے۔ میرا بھائی اسلم جیل میں ہے تو اُس کی وجہ یہ غاٹا چنگڑ ہی ہے۔ آج سے چار پانچ مہینے پہلے کھاریاں کے قریب شکار کرتے ہوئے دونوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس لڑائی میں لاٹھیاں کلہاڑیاں لگنے سے کئی بندوں کے سر پھٹے تھے لیکن ایک بندہ شدید زخمی ہو گیا تھا۔ یہ غاٹے چنگڑ کا بھائی دیناں تھا۔ اُس کے پیٹ میں شکاری رائفل کے چھرے لگے تھے اور کھاریاں کے ہسپتال میں اُس کا بڑا آپریشن ہوا تھا۔ شکاری رائفل چلانے والا اسلم تھا اس لیے اُس پر کیس بن گیا۔ اب عدالت سے اُسے دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ غاٹا چنگڑ تمہارے کتے کو زہر نہیں دے سکتا۔''

وہ بولا۔ ''میں نے یہ نہیں کہا کہ غاٹا زہر نہیں دے سکتا۔ یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ زہریلے پراٹھے بھیجنے والا غاٹا نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مرنے والا سانسی ہے۔ یہاں علاقے میں آج کل سانسیوں اور چنگڑوں میں زبردست جھگڑا چل رہا ہے۔ کوئی سانسی کسی چنگڑ کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرنے والے کو غاٹے نے بھیجا ہو۔''

یہ میرے لیے ایک انکشاف تھا کہ مرنے والا سانسی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اور اکثر قارئین کو پتہ بھی ہوگا کہ سانسی ''خانہ بدوش'' لوگ ہوتے ہیں اور ان

میں سے اکثر کا پیشہ ہی چوری اور ڈاکہ زنی ہوتا ہے۔ اُس دور میں پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں یہ لوگ کثرت سے پائے جاتے تھے۔ جرائم کرنے کے بعد یہ لوگ اکثر پوٹھوہار کے دشوار گزار علاقے میں روپوش ہو جاتے تھے اور پولیس بیچاری سر پیٹتی رہ جاتی تھی میں نے ایک بار پھر لاش کے قریب جا کر غور سے متوفی کے خدوخال دیکھے۔ اکبر کی بات ٹھیک ہی تھی۔ مرنے والے کا رنگ ڈھنگ سانسیوں والا ہی تھا۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اٹھوانے کے بعد میں اکبرے کو اپنے ساتھ تھانے لے آیا اور اُس سے کہا کہ وہ پوری تفصیل سے غاتے چنگڑ کے متعلق بتائے۔ اکبرے نے کہا۔ ''جناب! غاثا ایک کھاتا پیتا چنگڑ ہے۔ اُس نے دولت نگر کے پاس اپنا پکا مکان بنوایا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ وہ جانوروں کی کھالوں اور انتڑیوں وغیرہ کا کام بھی کرتا ہے۔ پچھلی سردیوں میں اسلم اور اُس کے چار دوست شکاری کتوں کے ساتھ خرگوش کے شکار پر گئے تو غاثے چنگڑ سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی اپنی پارٹی کے ساتھ شکار پر نکلا ہوا تھا۔ اسلم اور اُس کے ساتھیوں کے کتے ایک خرگوش کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ بھاگتے بھاگتے وہ اُس جگہ پہنچ گئے جہاں غاثے چنگڑ نے گیدڑ پکڑنے کے لیے پھندے لگا رکھے تھے۔ خرگوش ایک ایسے پھندے میں جا پھنسا جو گیدڑوں کے لیے لگایا گیا تھا۔ بس اسی بات پر اسلم اور غاثے میں جھگڑا ہوگیا۔ اسلم کا کہنا تھا کہ خرگوش ہمارا ہے کیونکہ ہمارے کتے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ غاثا کہتا تھا کہ ہمارے پھندے میں پھنسا ہے اس لیے ہمارا ہے۔ باتوں باتوں میں نوبت گالی گلوچ تک پہنچ گئی لیکن پھر ایک دو بندوں نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی۔ دونوں طرف کے لڑکوں نے کلہاڑیاں سیدھی کر لیں۔ اس دفعہ قصور اسلم کے ''شکارے'' کا تھا لیکن کچھ بھی ہے وہ ایک جانور تھا اور جانور عقل کی بات کرنے لگے تو پھر اُسے جانور کون کہے۔ چنگڑوں کے کتوں کے ساتھ ایک کتیا بھی تھی۔ شکاری عام طور سے کتیا کو کتوں کے ساتھ نہیں رکھتے کیونکہ وہ شکار سے زیادہ کتیا پر دھیان دینے لگتے ہیں اور اکثر آپس میں لڑنے بھی لگتے ہیں۔ غاثے چنگڑ نے اپنی کتیا دوسرے کتوں سے الگ ایک پھلاہی کے ساتھ باندھی ہوئی تھی۔ اتنے میں اسلم کا ''شکارا'' بو سونگھتا ہوا اُس کی طرف چلا گیا۔ اسلم اور اُس کے ساتھی شکار میں لگے ہوئے تھے۔ غاثا بھی اپنے یاروں کے ساتھ گیدڑوں کے پیچھے تھا۔ اتنے میں اسلم کا شکارا کتیا سے منہ جوڑ بیٹھا۔ جب دونوں پارٹیاں درختوں میں واپس آئیں تو شکارا رنگ رلیاں منانے میں لگا ہوا تھا۔ اسلم زنجیر لے کر اپنے کتے کی طرف بھاگا لیکن اُس کے پہنچتے پہنچتے غاثا چنگڑ بھی چیختا اور گالیاں بکتا ہوا سر پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی شکاری رائفل کا بٹ اس زور سے ''شکارے'' کے سر پر مارا کہ ناک منہ سے خون چھوٹ گیا اور وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر اسلم سے بھی برداشت نہیں ہوا۔

اُس نے اپنی رائفل کے بٹ سے غاثے چنگڑ کا سر کھول دیا۔ دونوں طرف کے بندے گتھم گتھا ہو گئے اور کلہاڑیاں چلنے لگیں۔ اسی دوران اسلم کے ہاتھوں پکڑی ہوئی رائفل بھی چل گئی اور اس کے چھرے غاثے کے بھائی دینے کو لگے۔ بعد میں غاثا اور اس کے بندے ڈر کر بھاگ گئے۔''

میں نے اکبرے کا یہ بیان پوری تفصیل سے نوٹ کر لیا۔ میرا اگلا سوال یہ تھا کہ غاثے کے علاوہ اور کون ایسا بندہ ہے جس پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اکبر بولا۔ ''جناب! جب اسلم یہ کتا گاؤں میں لایا تھا تو آدھا گاؤں اُس کا ویری ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کسی گھر میں کتا نہیں تھا اور کتا بھی ایسا کہ جسے دیکھ کر خوف آ جائے۔ خود ہمارے گھر میں لڑائی ہوگئی تھی۔ میں اور ماں بالکل نہیں چاہتے تھے کہ اسلم کتا رکھے۔ ماں کہتی تھی کہ جس گھر میں کتا ہوا ہے وہاں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا۔ اسلم نے کہا ٹھیک ہے میں گھر میں نہیں باندھتا باہر احاطے میں باندھ لیتا ہوں۔ طبیعت کا بہت ضدی ہے وہ جس بات پر اڑ جاتا ہے بس اَڑ جاتا ہے۔ گاؤں کے امام صاحب نے، پٹواری صاحب نے یہاں تک کہ چوہدری صاحب نے بھی کہا کہ وہ گاؤں میں کتے رکھنے کا رواج نہ ڈالے لیکن وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا...... اب یہی گاؤں والے ہیں جو اس کتے کو سائیں سانول کا پالتو بتاتے ہیں اور اس کی ٹہل سیوا کرتے ہیں۔''

میں نے اکبرے سے پوچھا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ یہ کتا غیبی خوراک پر پلتا ہے۔ راتوں رات کوئی بکرے کا تازہ گوشت اس کے سامنے ڈال جاتا ہے۔''

ایک دم اکبرے کے چہرے پر پھر خوف کے سارے لہرانے لگے۔ بولا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے ناں یہ بالکل صحیح بات ہے۔ میں نے کئی بار صبح کے وقت خود اپنے ہاتھوں سے ہڈیاں اٹھائی ہیں۔ یہ گوشت والا سلسلہ اسلم کے جیل جانے کے بعد شروع ہوا تھا۔ کٹائی کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ میرا ہاتھ بہت تنگ تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شکارے کے لیے روزانہ ڈیڑھ دو سیر گوشت کہاں سے لاؤں گا۔ دو تین روز میں نے چیتھڑوں وغیرہ سے کام چلایا۔ ایک دن صبح میری بیوی نے بتایا کہ ''شکارے'' کے سامنے تازہ گوشت پڑا ہے۔ میں نے باہر آ کر دیکھا تو حیران ہوا۔ یہ گوشت میں نہیں لایا تھا۔ ماں بھی نہیں لا سکتی تھی۔ میں نے سوچا شاید اسلم کا کوئی یار دوست یہ نیکی کر گیا ہے۔ اگلے روز پھر کتے کے سامنے گوشت دیکھا تو میں نے اسلم کے یار دوستوں سے پوچھا اُن میں سے کسی کو اس گوشت کا پتہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی گاؤں میں یہ بات مشہور ہونے لگی کہ اسلم کے شکارے کے سامنے رات کو کوئی بکرے کا گوشت پھینکتا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے گاؤں میں ہفتے میں صرف تین دن جانور ذبح ہوتا ہے لیکن شکارے کو روز تازہ گوشت ملتا تھا اور یہ گوشت گاؤں کی دُکان کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس بات کو چار پانچ مہینے ہو چکے ہیں۔ ان آٹھ

مہینوں میں شاید ہی دس پندرہ ناغے ہوئے ہوں ورنہ ہر روز گوشت شکارے کے سامنے پڑا ہوتا ہے اور اب تو کئی دوسرے لوگ بھی کلیجی اور مرغیاں وغیرہ یہاں پھینکنے لگے ہیں۔"

صورت حال سنگین ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی تھی۔ اس گاؤں میں شکارا نام کے اس کتے کو ہوائی چیز کا نام دے دیا گیا تھا اور ایک کھلم کھلا قتل کو لوگ قتل ماننے پر تیار نہیں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ متوفی شکارے کو زہر دینے آیا تھا اور شکارے کی پُراسرار طاقت نے اُسے انسان سے لاش بنا دیا۔ بالکل جیسے کچھ عرصہ پہلے جوگندر سنگھ ماچھی کو کالے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس کیس میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مرنے والے کا نام ٹھکانہ معلوم تھا اور نہ اُس کے وارثوں کا کچھ پتہ تھا اُسے اسلم کے کتے سے کیا دشمنی تھی کہ اُسے زہر دینے پہنچ گیا تھا اور پھر کس کے ہاتھوں اس کی موت واقع ہوئی تھی؟

رات کو اس سلسلے میں میری چوہدری سے بھی بات ہوئی۔ چوہدری نے اپنی حویلی میں میری دعوت کر رکھی تھی۔ میں ایسی دعوتوں میں کم ہی شریک ہوتا تھا لیکن چوہدری بوٹے کو میں ٹٹولنا بھی چاہتا تھا اس لیے دعوت پر چلا گیا۔ مرغن کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور پھر باتیں شروع ہوئیں۔ چوہدری نے اکبرے کے بیان کی تصدیق کی۔ اُس نے بتایا کہ اسماعیل کا پتر اسلم قریباً آٹھ مہینے پہلے اس کتے کو گاؤں میں لایا تھا۔ اس وقت سب نے اسلم کی مخالفت کی تھی کہ وہ گاؤں کے لڑکوں میں کتے پالنے کی چھیڑ ڈال رہا ہے اور یہ بات کوئی ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ اُس کے بعد کئی سر پھرے لڑکوں نے کتے پالے اور اسلم کی دیکھا دیکھی شکار شروع کیا۔ اسلم کی باتیں کرتے کرتے سائیں سانول کا ذکر شروع ہو گیا۔ چوہدری نے کہا۔ وہ عجب درویش قسم کا بندہ ہے کسی سے گل بات نہیں کرتا۔ نہ اُسے کسی سے شکایت ہے نہ کسی کو اس سے ہے۔ کتے کے کاٹنے کا سائیں کے پاس بڑا زبردست علاج ہے۔ وہ ایک سبز رنگ کا مرہم دیتا ہے۔ کتے کے دانت کتنے بھی گہرے اُترے ہوں چار پانچ دن کے اندر زخم ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ مرہم باؤلے کتے کے کاٹنے میں بھی کام دیتا ہے۔ اور اگر زخمی بروقت سائیں کے پاس پہنچ جائے تو پاگل ہونے سے بچ جاتا ہے۔ چوہدری نے بتایا کہ اس کی اپنی بیٹی کو ایک کتے نے کاٹ لیا تھا۔ بیچاری کی پنڈلی پر گہرا زخم آیا تھا مگر سائیں کے علاج سے وہ دو ہی دن میں بھلی چنگی ہو گئی تھی۔ پھر چوہدری اپنی بیوی کو آوازیں دے کر بلانے لگا۔ "شادو......او شادو۔ ادھر آ ذرا۔"

ذرا دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک نوعمر لڑکی چھم سے اندر آ گئی۔ وہ جیسے لڑکپن اور جوانی کے درمیان کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ بھی نابالغوں جیسا تھا لیکن جسم بالغ ہو چکا تھا۔ ایک تیز تیکھی تلوار کی طرح تھی وہ لڑکی۔ چوہدری نے شاید کبھی اُسے اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا یا دیکھا تھا تو جان بوجھ

کر آنکھ چرا رکھی تھی۔ اُس نے بیٹی کو بالکل اس انداز سے بلایا جیسے وہ ابھی نوعمر بچی ہے۔ کہنے لگا۔

"اے شادو! اِدھر آ۔ ذرا اپنے چاچا جی کو ٹانگ دکھا اپنی۔ کہاں کاٹا تھا کتے نے۔"

شادو نے دو قدم آگے آ کر "چاچا جی سلام" کہا اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے بالکل پرواہ نہیں تھی کہ دوپٹہ اُس کے کندھے سے ڈھلک کر پیروں میں جھول رہا ہے۔ اُس کی عمر اتنی نہیں تھی کہ مجھے چاچا جی کہتی اور نہ ہی اتنی تھی کہ اپنے دوپٹے سے اس طرح لاپرواہ ہو جاتی لیکن لگتا تھا وہ اپنے باپ کے کہے کو سچ سمجھ رہی ہے اور خود کو ایک کھلنڈری لڑکی ہی خیال کرتی ہے۔ چوہدری نے کہا۔ "دکھا نہ پتری اپنی ٹانگ۔"

پتری نے ایک ٹانگ موڑھے پر رکھی اور لال گلابی شلوار کو چٹکی سے پکڑ کر تھوڑا سا اونچا کر دیا۔ سفید دودھیا پنڈلی پر ٹخنے سے ذرا اوپر زخم کی مدھم نشان تھا۔ چوہدری بولا۔ "دیکھیں جی! کتنا گہرا زخم ہے لیکن سائیں کے مرہم نے یوں ٹھیک کیا کہ پتہ ہی نہیں چلا۔"

میں نے پوچھا "کسی آوارہ کتے نے کاٹا تھا۔"

شادو اپنی باریک سریلی آواز میں بولی۔ "نہیں جی! میں اپنے امی کے ساتھ شادی پر گئی ہوئی تھی ساتھ والے پنڈ میں۔ وہاں ہمسایوں کا کتا تھا۔ وہ رات کو کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ ایک رات انہوں نے اُسے جلدی کھول دیا۔ ہم کچھ لڑکیاں چھپن چھپائی کھیل رہی تھیں۔ میں چھپنے کے لیے ہمسایوں کی چھت پر گئی اور کتے نے مجھے کاٹ کھایا......"

میں غور سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ بہت لٹک مٹک کر بول رہی تھی۔ کبھی لگتا تھا کہ معصوم ہے، کبھی لگتا تھا معصوم بن رہی ہے۔ ہاں ایک بات واضح تھی کہ اُسے گھر میں بہت لاڈ پیار سے رکھا جاتا ہے۔ ایسا نخریلا پن اُسی اولاد میں آتا ہے جسے بچپن میں کسی بات پر ڈانٹا ڈپٹا نہ گیا ہو۔

لڑکی سلام کر کے باہر چلی گئی تو چوہدری نے حقے کی بل کھاتی نَے منہ میں ڈال کر ایک طویل کش لیا اور فکرمندی کے لہجے میں بولا۔ "ویسے اُس کتے میں کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ اب یہ شادو والا معاملہ ہی لے لیں۔ شادو کو بھی بڑی چڑ تھی۔ "شکارے" سے ایک روز وہ شادو اور اُس کی سہیلیوں کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ شادو نے بے نقط سنائیں تھیں اسلم کو۔ پھر اسلم کی ماں سے لڑنے ان کے گھر پہنچ گئی تھی۔ بڑی تُو تُو مَیں مَیں ہوئی تھی۔ اس کے دو ہفتے بعد ہی ساتھ والے گاؤں میں شادی تھی۔ ہم وہاں گئے تو شادو کو ہمسایوں کے کتے نے کاٹ لیا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے سائیں سانول اپنے ڈیرے میں موجود تھا۔ اُس نے بروقت دوا دارو کر دیا۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ شادو کی مرہم پٹی کرنے کے بعد سائیں سانول نے کہا تھا کہ کتے کو ایک ہفتہ باندھ کر رکھو۔ اگر اس دوران وہ مر گیا تو لڑکی کو دوبارہ ڈیرے پر لانا ہو گا۔ شکر ہے کہ کتا زندہ رہا اور ہم کسی بڑی مصیبت

سے بچ گئے۔''

میں نے چوہدری سے پوچھا کہ مرنے والے سانسی کے بارے میں اُس کا کیا خیال ہے۔ وہ بولا۔ ''نواز صاحب! علاقے میں چور اُچکے بہت ہو گئے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی کوئی ایسا ہی بندہ لگتا ہے۔ وہ اکبرے کے گھر میں گھسنا چاہتا ہو۔ اُس نے سوچا ہو کہ پہلے کتے کا کام تمام کرلوں پھر اگلی کارروائی کروں گا۔ آپ نے دیکھا ہی ہے اُس کے پاس چاقو بھی موجود تھا۔''

''پھر اُسے مارا کس نے؟'' میں نے پوچھا۔

چوہدری کے چہرے پر پھر فکرمندی نمودار ہوگئی۔ بولا۔ ''دیکھا جائے تو اکبرے پر شبہ ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اکبرا، بے قصور ہو۔ اگر اس کے ہاتھوں سانسی کا قتل ہو ہی گیا تھا تو وہ لاش وہیں پڑی نہ رہنے دیتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ سانسی ابھی اکبرے کے گھر میں گھسا نہیں تھا۔ وہ کتے کو زہر دینے کے لیے کھیت میں چھپا بیٹھا تھا۔ اکبرے کو کیسے پتہ چل گیا کہ وہ کھیت میں چھپا ہوا ہے......''

چوہدری زبان سے نہیں کہہ رہا تھا مگر اُس کی صورت دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ بھی ہوائی چیزوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے اس بارے میں مزید بات کرنی مناسب نہیں سمجھی اور چوہدری سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔

☆======☆======☆

تیسرے چوتھے روز پوسٹ مارٹم بھی آ گئی۔ متوفی کی موت کنپٹی پر آنے والی ضرب سے واقع ہوئی تھی۔ یہ ضرب کُند آلے سے لگائی گئی تھی۔ اب یہ کُند آلہ کیا تھا اس بارے میں پولیس سرجن یقین سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ ممکن تھا یہ ریوالور یا بندوق کا دستہ ہو۔ ممکن تھا لاٹھی یا اینٹ وغیرہ ہو۔ اس ضرب کے علاوہ بھی متوفی کے جسم پر کئی نشانات موجود تھے۔ ان نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ ایک یا دو افراد سے لڑتا رہا ہے۔ موت کا وقت رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان بتایا گیا تھا جو میرے اندازے سے تین چار گھنٹے کم تھا۔ متوفی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اخبار میں اُس کی تصویر دے دی گئی تھی اور لاش میو ہسپتال لاہور کے مردہ خانے میں پڑی تھی۔

یہ ایک ''عدم پیروی'' کیس تھا اور ایسے کیس لاپرواہی کا شکار ہو کر جلد ہی فائلوں میں بند ہو جاتے ہیں لیکن میں اس معاملے کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ایک شخص میرے تھانے کی حدود میں قتل ہوا تھا اور اس کا قاتل یا ''قاتلین'' یہیں کہیں میرے اردگرد موجود تھے۔ رہ رہ کر میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا تھا کہ ہر شب ''شکارے'' کو بکرے کا تازہ گوشت کیسے ملتا ہے۔ یہ بات تو میں کسی طور تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ اس معاملے میں جن یا بھوت ''حضرات'' کا ہاتھ ہے تو پھر کون پہنچاتا تھا یہ

گوشت اور کہاں سے لاتا تھا۔ سب سے پہلے تو دھیان اسلم کے اہل خانہ کی طرف جاتا تھا۔ اُس کے بعد اُس کے دوستوں اور خیر خواہوں کا نمبر آتا تھا۔ کبھی کبھی یونہی سائیں سانول کی صورت بھی نگاہوں میں گھومنے لگتی تھی۔ میں نے اس معاملے میں بہت غور وفکر کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ سب سے پہلے اسلم کی بھابی زینب سے بات کرنی چاہیے۔ میں ایک مرتبہ پہلے بھی زینب سے پوچھ گچھ کر چکا تھا۔ وہ اچھے نین نقش والی بھرپور عورت تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اندازہ ہوتا کہ صورت کے لحاظ سے اُسے شوہر جوڑ کا نہیں ملا۔ اکبرے کے نقش بھدے اور رنگ ذرا سانولا تھا۔ اپنے طور طریقوں سے زینب ہنس مکھ اور جلد گھل مل جانے والی نظر آتی تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ وہ اپنے دیور سے ہمدردی رکھتی ہے اور شکارے کے بارے میں بھی اس کے خیالات وہ نہیں جو دوسرے گھر والوں کے ہیں۔ ان حالات میں یہ سوچا جا سکتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں چوری چھپے شکارے کو گوشت پہنچانے والی زینب ہی ہو لیکن ایسا سوچتے ہوئے فوراً یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ روزانہ ڈیڑھ دو سیر گوشت کہاں سے لاتی ہوگی۔ ایک گھریلو عورت کے لیے خاوند کو بتائے بغیر اتنا خرچہ کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کتے کے سامنے پایا جانے والا گوشت مقامی قصائی کی دکان سے نہیں آتا تھا۔ بہرحال میں نے ایک دفعہ زینب سے ملنا ضروری سمجھا۔ شکارے کو گوشت پہنچانے والے کا سراغ لگانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ مجھے ایک خاص قسم کا شک ہو [illegible] تھا...... اور وہ شک یہ تھا کہ وقوعہ کی رات شکارے کو گوشت پہنچانے والے اور زہریلے پراٹھے پہنچانے والے سانسی میں مڈبھیڑ ہوئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ سانسی کی موت اسی مڈبھیڑ کا نتیجہ ہوا۔ جیسا کہ اکبرے نے مجھے بتایا تھا گوشت کا ناغہ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا اور وہ بھی بارش یا آندھی وغیرہ کی صورت میں لیکن قتل کی رات گوشت شکارے کو نہیں ملا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ گوشت شکارے کے سامنے پھینکنے سے پہلے ہی اس شخص نے سانسی کو دیکھ لیا۔ اُن دونوں میں دھینگامشتی ہوگئی۔ اس دھینگامشتی میں سانسی قتل ہوا اور قاتل گوشت سمیت واپس بھاگ گیا۔ یہ مفروضہ اے ایس آئی رمضان پراچہ کو بھی بے حد پسند آیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اسی لائن پر تفتیش ہونی چاہیے۔ ایک دن شام کو میں اکبرے اور زینب سے پوچھ گچھ کرنے اُن کے گھر پہنچا۔ اکبرا مجھے گھر سے باہر ہی مل گیا۔ وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔ مجھے اُس کے ہاتھ میں ڈاک کا ایک لفافہ نظر آیا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو وہ کہنے لگا۔

''بڑی لمبی عمر ہے آپ کی جناب...... میں آپ ہی کی طرف آ رہا تھا''

''کیوں کیا بات ہے؟'' میں نے اُسے گھورا۔

وہ عاجزی سے بولا ''اب آ ہی گئے ہیں تو اندر آ جایئے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں سب کچھ۔''

اکبرے کے ساتھ میں اُس کے گھر میں داخل ہوا۔ یہاں اکبرے کی ماں اور بیوی بھی سہمی ہوئی نظر آئیں۔ بچے بھی بڑوں کو پریشان دیکھ کر گم صم تھے۔ ''کیا ہوا ہے؟'' میں نے گھر کی بیٹھک میں پہنچتے ہی اکبرے سے پوچھا۔

اُس نے ڈاک کے لفافے میں سے ایک خط نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ ایک میلے کاغذ پر گھٹیا سے ہولڈر کے ساتھ آٹھ دس سطریں لکھی تھیں۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا ''حرامزادے! تم نے میرے بھائی کو مارا ہے۔ اُس کا خون تمہاری گردن پر ہے۔ میں اس گردن کو تمہارے کندھوں پر سلامت نہیں رہنے دوں گا۔ بڑا خوفناک بدلہ لوں گا تم سے۔ تمہاری اور تمہارے کتے کی لاش اب ایک ساتھ گھسیٹوں گا۔ نہ گھسیٹوں تو اپنے باپ کا نہیں میں۔ بس تمہارا کھیل ختم ہوا۔ اب اپنی موت کی راہ دیکھو بہت جلد ملاقات ہوگی۔''

فقط تمہارے خون کا پیاسا

یہ خط اکبرے کو آج ہی کی ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ اُس نے غلطی یہ کی تھی کہ یہ دھمکی آمیز خط بیوی بچوں کے سامنے ہی پڑھ دیا تھا۔ اب وہ سب دہشت کے گھیرے میں تھے۔ خط کی تحریر سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اُسی موت کا شاخسانہ ہے جو چند روز پہلے مکان سے باہر گندم کے کھیت میں ہوئی تھی۔ خط لکھنے والے نے خود کو مرنے والے کا بھائی بتایا تھا اور اس موت کا ذمے دار اکبرے کو ٹھہرا کر اُسے خوفناک انجام کی دھمکیاں دی تھیں۔ اکبرا سیدھا سادہ زمیندار تھا۔ ایسے لوگ لڑائی بھڑائی سے گھبرایا نہیں کرتے۔ دُشمن سامنے آجائے تو پھر جو ہو جائے سو کم ہے لیکن چھپے ہوئے دشمن کا خوف تو ہر کسی کو ڈانواں ڈول کر دیتا ہے۔ میں نے اُس کی ڈھارس بندھائی اور پوچھا کہ اب اس خط کے بارے میں اُس کا کیا خیال ہے۔ وہ میری بات کا غلط مطلب سمجھا کہنے لگا ''شاید آپ غاثے چنگڑ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ غاثے سے دُشمنی تو بالکل ہے جی اور اُس میں کتے والا جھگڑا بھی ہے لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا جناب...... ہو سکتا ہے میری ہی مت ماری گئی ہو۔ غاثا دُشمنی بھولنے والا بندہ تو نہیں۔ کیا پتہ یہ سارا چکر اُسی کا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری مت واقعی ماری گئی ہے۔ شک والی بات پر تمہیں شک نہیں ہوتا اور سیدھی سادی بات پر شک کرنے لگتے ہو۔ خط غاثے کی طرف سے کیسے ہو سکتا ہے۔ خط میں بھائی کے قتل کی بات ہو رہی ہے اور غاثے چنگڑ کا بھائی سانسی کیسے ہو گیا۔''

''مم...... میرا مطلب تھا جی کہ شاید منہ بولا......'' وہ گڑبڑا گیا۔

''کیا بات ہے۔ ایک طرف کہہ رہے ہو کہ سانسیوں چنگڑوں میں اینٹ کتے کا بیر ہے۔ دوسری طرف اُن میں منہ بولے رشتے بنا رہے ہو۔ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

میرے سوال نے اُسے اور ''گھبرا'' ڈال دیا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ وہ مجھ سے کوئی بات چھپا رہا ہے۔ میں نے اُسے تھوڑا سا ڈرایا دھمکایا کہ شاید وہ کچھ بک دے لیکن ناکامی ہوئی۔

اگلے روز وہی بات ہوئی جس کا مجھے خدشہ تھا۔ صبح سویرے اکبرا تھانے آیا اور بولا ''جناب اکیلا بندہ ہو تو کوئی ڈر خطرہ نہیں ہوتا لیکن میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں انہیں کسی خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی ان دنوں میں فارغ ہی ہوں۔ میں نے سوچا ہے جب تک سانسی کے قاتلوں کا پتہ نہیں چل جاتا۔ میرے بیوی بچے گوجرانوالہ میں رہیں۔ گوجرانوالہ میری گھر والی کا میکہ ہے۔ میں اُسے آج ہی وہاں چھوڑنے جا رہا ہوں۔ خود بھی پانچ چھ روز وہاں رہوں گا لیکن پھر آجاؤں گا۔ آپ نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ بتائے بغیر گاؤں سے باہر نہیں جانا اس لیے آپ سے اجازت لینے آیا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تم گوجرانوالہ چلے جاؤ گے تو وہ تمہارا ''شکارا'' کہاں جائے گا۔''

کہنے لگا۔ ''اُسے اسلم کے ایک بیلی کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔ پانچ چھ روز کی تو بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تمہارے آنے تک شکارے کا صفایا ہو چکا ہوگا۔ کوئی ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شکارے کی وجہ سے اسلم کا وہ یار بیلی بھی خطرے میں پڑ جائے...... تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ شکارے کو ہمارے پاس چھوڑ جاؤ۔''

''کیا مطلب؟ یہاں تھانے میں؟''

''نہیں میں اپنے کسی ماتحت کے گھر بھجوا دوں گا۔ وہاں اُس کی حفاظت بھی رہے گی اور ہو سکتا ہے اسی بہانے مجرم بھی پکڑا جائے۔''

''جیسے آپ کی مرضی جناب!'' اکبرے نے کہا۔

میں نے اُسے ہدایت کی کہ وہ جانے سے پہلے کتا یہاں تھانے میں چھوڑ جائے۔

دوپہر کے وقت موٹا تازہ بلڈاگ تھانے میں موجود تھا۔ اُس کے گلے میں پٹکا اور پٹکے میں زنجیر تھی۔ منہ پر جالی چڑھی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں اور اُن میں دیکھنے سے جھرجھری سی آجاتی تھی۔ میں نے بلڈاگ یعنی شکارے کو اپنے اے ایس آئی رمضان پراچہ کے سپرد کر دیا اور کہا کہ وہ اُسے اپنے گھر لے جائے پراچہ اُسے گھر لے گیا۔ اکبرا اپنے بیوی بچوں اور والدہ کے ساتھ گوجرانوالہ چلا گیا۔

میں نے اپنے طور پر تفتیش جاری رکھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ شکارے کو روزانہ ڈیڑھ دو سیر

گوشت پہنچانے والا ہمدرد کون ہے۔ اس ''ہمدرد'' اور قتل کی واردات میں گہرا تعلق تھا۔ نہ صرف واردات کے روز شکارے کو گوشت نہیں ملا تھا بلکہ اُس کے بعد یہ گوشت والا سلسلہ ختم ہی ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا ایک خون ہو جانے کے بعد شکارے کے اُس گمنام ہمدرد نے چپ سادھ لی ہے۔ میں نے اکبرے کی گھر والی زینب کے علاوہ اسلم کے دوست مختارے، صداقت علی اور ایک عزیز اکرام سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن اُن میں سے کوئی بھی کام کی بات نہیں بتا سکا۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ سب کے سب کمزور عقیدے کے لوگ ہیں اور شکارے کو کتے سے بڑھ کر ''کوئی چیز'' سمجھتے ہیں۔ اُن میں سے اکبرے کے دوست صداقت علی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اُس نے ایک رات شکارے کو عجیب آواز میں بھونکتے سنا تھا۔ یوں لگتا تھا اُس کے گلے سے درجنوں کتوں کی آوازیں ایک ساتھ نکل رہی ہیں۔ اُس نے اپنی بیوی کو بھی جگا کر یہ آواز سنائی تھی۔ بیوی اتنا ڈری تھی کہ اگلے روز اُسے تیز بخار چڑھ گیا تھا اور وہ کئی روز نیم بے ہوش پڑی رہی تھی۔

ان سب لوگوں سے مایوس ہونے کے بعد میں نے سائیں سانول سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ابھی تک سانسی قتل کیس کے اس اہم کردار سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ سانول کا ڈیرہ گاؤں سے قریباً دو میل دور روہی نالے کے کنارے تھا۔ سنا تھا کہ وہ سال میں صرف دو تین بار ہی گاؤں میں آتا ہے ورنہ ویران جگہوں پر گھومتا رہتا ہے۔ یا جھونپڑے میں بیٹھ کر جڑی بوٹیاں گھوٹتا ہے۔ میں نے جمعے کے روز سائیں سانول کے پاس جانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن جمعرات کی صبح ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ مجھے فوری طور پر سانول کے پاس جانا پڑا۔

......جیسا کہ میں نے بتایا ہے ''شکارا'' اے ایس آئی پراچہ کے پاس تھا۔ بلال شاہ بھی اُن دنوں پراچہ کے ساتھ ہی دو کمرے کے گھر میں رہتا تھا۔ ایک روز صبح منہ نہار شکارے نے بلال شاہ کو کاٹ کھایا۔ اب معلوم نہیں اس حادثے میں بلال شاہ کا قصور زیادہ تھا یا شکارے کا۔ بلال شاہ کا کہنا تھا کہ وہ شکارے کو برآمدے سے نکال کر صحن میں باندھنے گیا تھا کہ وہ اُس پر چڑھ دوڑا اور پنڈلی کی پچھلی طرف نرم گوشت میں دانت گاڑ دیے۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ بلال شاہ نے شکارے سے کوئی دست درازی کی ہو گی۔ اُس نے صرف ایک روز پہلے ہی مجھ سے کہا تھا کہ یہ میں نے کیا بلا پراچہ صاحب کے گھر میں بندھوا دی ہے۔ پیشاب کی بو سے دماغ پھٹتا رہتا ہے۔ شاید اسی پھٹے ہوئے دماغ کے ساتھ اُس نے کتے کو لات وغیرہ رسید کی تھی۔ نتیجے میں اُس نے غصہ کھا کر بلال شاہ کی ٹانگ کا بوسہ لے لیا تھا۔ بہر حال جب میں موقعے پر پہنچا بلال شاہ کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ ہائے وائے کرنے کے ساتھ لوٹ پوٹ بھی ہو رہا تھا کہہ رہا تھا میرے دماغ کو زہر چڑھ رہا ہے اگر مجھے بچانا ہے تو جلدی سے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ میں جانتا تھا خطرے

کی کوئی بات نہیں۔ شکارا خدانخواستہ پاگل کتا نہیں تھا۔ وہ شکاری کتا تھا شکاری کتے اور محافظ کتے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ شکاری بھونکتا کم اور کاٹتا زیادہ ہے (یعنی بلال شاہ کا الٹ ہوتا ہے) میں نے بلال شاہ کو دلاسا دیا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ بھی اکٹھے ہو چکے تھے۔ دو بزرگ حضرات نے مشورہ دیا کہ زخمی کو سائیں سانول کے پاس لے جائیں۔ ہفتوں میں ٹھیک ہونے والا زخم دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بڑا مناسب مشورہ تھا میں نے فوراً ایک تانگے کا انتظام کیا اور بلال شاہ کو اُس میں لاد کر روہی نالے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اے ایس آئی رمضان اور ایک پڑوسی بھی ہمارے ساتھ تھا۔ بلال شاہ کی کوئی رگ وغیرہ کٹ گئی تھی۔ لہٰذا خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ میں نے زخم پر کس کر پٹی باندھ دی تھی۔ پھر بھی خون رس رہا تھا۔

ہم ایک گھنٹے میں روہی نالے تک پہنچ سکے۔ کچھ فاصلہ بلال شاہ کو سہارا دے کر پیدل طے کرنا پڑا۔ اونچے سرکنڈوں اور دور تک پھیلی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان ایک درمیانے سائز کی جھونپڑی سائیں سانول کا ڈیرہ تھی۔ اُس نے مٹی کے پیالوں میں ''دانا پانی'' وغیرہ ڈال کر پرندوں کے لیے درختوں سے لٹکایا ہوا تھا۔ جھونپڑی کے پاس ہی دو بوگیر کتے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں دور ہی سے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ جھونپڑی کے کچھ فاصلے پر ایک بکائن کی چھاؤں میں چٹائی بچھی تھی اور اس پر سائیں کے چند عقیدت مند بیٹھے تھے۔ ہم بلال شاہ کو لے کر سیدھا جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اندر گورا چٹا ادھیڑ عمر سائیں سانول مراقبے کی حالت میں خاموش بیٹھا تھا۔ ہمارے ساتھ آتے ہوئے دیہاتی نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

''سائیں جی! بغیر اجازت آپ کے دروازے پر آ گئے ہیں۔ معافی چاہتے ہیں جی! یہ علاقہ انچارج ہیں......نواز خاں صاحب! ان کے عزیز کو کتے نے کاٹا ہے۔ خون بند نہیں ہو رہا ہے، اس لیے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔''

سائیں سانول نے بڑی آہستگی کے ساتھ اپنی آنکھیں کھولیں۔ بہت بڑی بڑی اور بے حد خاموش آنکھیں تھیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ ہم پر چڑھ دوڑے گا لیکن پھر فوراً ہی چہرہ نرم پڑ گیا۔ اُس نے ہمیں سر کے اشارے سے اندر بلا لیا۔ بلال شاہ کے پڑوسی نے جلدی جلدی اُس کی پٹی کھولی۔ سائیں سانول گہری نظروں سے زخم دیکھنے لگا۔ اس معاملے میں وہ بہت تجربہ کار نظر آتا تھا۔ اُس نے اشارے سے بلال شاہ کو ٹانگ سیدھی کرنے کی ہدایت کی پھر ایک بھیگے ہوئے کپڑے سے زخم صاف کرنے لگا۔ کپڑا کسی دوا میں بھیگا ہوا تھا۔ بلال شاہ ہائے اُف کرنے لگا۔ پنڈلی پر کتے کے دانتوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ سائیں سانول نے دھیان سے ان نشانوں کو دیکھا۔ پھر اپنی بھاری پلکیں اٹھا کر بلال شاہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم گورن پور گئے تھے؟'' اُس کی بھاری بھرکم آواز جھونپڑی میں گونجی۔ گورن پور ساتھ والے گاؤں کا نام تھا۔

''نہیں جی!'' بلال شاہ نے کہا۔ ''کندی وال میں ہی یہ کام ہوا ہے۔''

سائیں سانول کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت نظر آئی۔ اُس نے سر اٹھا کر بلال شاہ کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔ ''تمہیں گورن پور میں ارائیوں کے کتے نے نہیں کاٹا؟''

میں اور بلال شاہ اس سوال پر حیران ہو رہے تھے۔ کہاں گورن پور اور کہاں ارائیوں کا کتا۔ معلوم نہیں یہ ذکر درمیان میں کیوں آ گیا تھا۔ ہم تینوں سوالیہ نظروں سے سائیں سانول کی طرف دیکھنے لگے۔ سائیں سانول ایک بار پھر دھیان سے بلال شاہ کا زخم دیکھنے لگا۔ بڑا ماہرانہ انداز تھا اس کا۔ کہنے لگا۔ ''تیس سال سے اوپر تجربہ ہو گیا ہے میرا۔ پچھلے بیس سالوں میں میری آنکھ نے کبھی دھوکہ نہیں کھایا۔ میں اس کتے کا لگایا ہوا ایک زخم پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ زیادہ نہیں چار پانچ مہینے پہلے کی بات ہے۔ چوہدری بوٹے کی لڑکی کو اس کتے نے کاٹا تھا۔ یہی زخم تھا اور اسی جگہ پر آیا تھا۔''

ایک دم میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ مجھے چوہدری کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ گورن پور شادی پر گیا ہوا تھا اور وہاں صادق ارائیں کے کتے نے شادو کو کاٹ کھایا تھا۔ اب سائیں سانول بھی گورن پور اور ارائیوں کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک دم کڑی سے کڑی ملنے لگی اور میں ایک حیران کن نتیجے پر پہنچ گیا...... کہیں شادو نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا کہ اُسے کاٹنے والا ارائیوں کا کتا ہے؟ یہ بے حد اہم سوال تھا۔ اگر سانول سائیں کی بات درست تھی تو اس کا مطلب تھا کہ چار ماہ پہلے شادو کو ارائیوں کے کتے نے نہیں اسلم کے شکارے نے کاٹا تھا۔

ایک دم ہی بہت سے سوال ذہن میں کلبلانے لگے اگر ایسا ہوا تھا تو شادو نے یہ بات چھپائی کیوں تھی؟ وہ تو اسلم اور اس کے شکارے کے سخت مخالفوں میں سے تھی اور اس سلسلے میں ایک بار اسلم کی ماں سے لڑ بھی چکی تھی۔ اُسے کیا ضرورت تھی شکارے کی زیادتی پر پردہ ڈالنے کی اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ جب یہ واقعہ ہوا وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ شادی پر گورن پور گئی ہوئی تھی جبکہ شکارا ایک میل سے زیادہ فاصلے پر کندی وال میں تھا۔ دوسری طرف سائیں سانول کے تیس سالہ تجربے کو جھٹلانا بھی آسان نہیں تھا۔ سائیں نے مرہم لگاتے ہوئے دانتوں کے نشانوں پر انگلی پھیری اور بولا ''یہ دیکھو...... یہ دائیں طرف والا تیسرا دانت اندر کی طرف مڑا ہوا ہے اور اس طرح بائیں طرف والا تیسرا بھی۔ تیسرے اور پہلے دانت کے درمیان یہاں ایک خلا ہے۔ مطلب یہ کہ جانور کا یہ دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ میں یہ نقشہ سال دو سال بعد بھی دیکھتا تو فوراً پہچان لیتا۔''

سائیں سانول کی باتوں نے ہمیں زبردست الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بلال شاہ کی مرہم پٹی

ہو چکی تو میں نے سائیں سانول سے کہا۔ ''سائیں جی! میں ابھی تھانے واپس جا کر ایک بندہ گورن پور بھیجتا ہوں۔ اگر صادق ارائیں والا کتا مل گیا تو میرا اے ایس آئی اُسے لے کر آپ کے پاس آئے گا۔ آپ ذرا اچھی طرح اُس کا جائزہ لیں اور بتائیں کہ شادو کو کاٹنے والا کتا کون سا تھا۔ میری باتوں سے سائیں سانول کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ گھٹالا ہے۔ وہ کتے کی ''شناخت پریڈ'' سے انکار کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ پیر فقیر تو تھا لیکن بھلا مانس تھا اور ایسے لوگ بعض اوقات قانون کی بڑی بھرپور مدد کرتے ہیں۔ میں نے اُسے راز داری کا پابند کیا اور اپنے تینوں ساتھیوں کے ہمراہ وہی نالے سے کندی وال واپس آ گیا۔

☆======☆======☆

گورن پور میں صادق ارائیں کا کتا مل گیا تھا۔ اُسے اے ایس آئی رمضان روہی نالے پر سائیں سانول کے سال لے گیا۔ اس چھان پھٹک کا نتیجہ ہمارے اندازے کے عین مطابق نکلا۔ چار مہینے پہلے چوہدری کی بیٹی شادو نے سفید جھوٹ بولا تھا کہ اُسے ارائیوں کے کتے نے کاٹا ہے۔ اُسے اسلم کے شکارے نے کاٹا تھا اور اُس نے یہ بات ہر کسی سے چھپا لی تھی۔ ایسا کیوں ہوا اس سوال کا جواب صرف اور صرف شادو ہی دے سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں اس موقعے پر میری چھٹی حس پکار پکار کر ایک اعلان کرنے لگی اور وہ اعلان یہ تھا کہ ہو نہ ہو شکارے کو چوری چھپے گوشت پہنچانے والی بھی یہی شادو ہے۔ بڑی عجیب سی بات لگتی تھی کہ وہ لڑکی جو اسلم کی سب سے بڑی مخالفت تھی ایک دم اتنی بدل جائے کہ اپنے زخم چھپانے لگے اور ٹھنڈی راتوں میں تکلیف اٹھا کر اُس کے کتے کو خوراک پہنچائے۔ اگر ایسا ہوا تھا تو پھر اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی وجہ جو ابھی کسی کی نظروں میں نہیں آئی تھی یہاں تک کہ شادو کے والدین بھی اس سے بے خبر تھے۔

میں نے اپنے طور پر فرض کر لیا کہ شادو ہی شکارے کو گوشت پہنچاتی رہی ہے۔ اب سوچنے والی بات یہ تھی کہ وہ ایسا کیونکر کرتی رہی ہے۔ چوہدری کی حویلی گاؤں کے مشرقی سرے پر تھی۔ یہیں سے گندم کے وہ کھیت شروع ہو جاتے تھے جو دو ڈھائی سو گز آگے جا کر اکبرے کے کھیتوں سے مل جاتے تھے۔ اگر رات کے اندھیرے میں کوئی حویلی سے نکلے تو فصل کے اندر ہی اندر چلتا آسانی سے اکبرے کے گھر تک پہنچ سکتا تھا۔ ایک دو ماہ پہلے یہاں کماد کی فصل تھی اور کماد میں چھپ چھپا کر آ جانا تو بہت ہی آسان تھا۔ اب دوسرا سوال یہ تھا کہ شادو تازہ گوشت کہاں سے حاصل کر لی ہو گی۔ یہ کام وہ اکیلی نہیں کر سکتی تھی۔ یقیناً کوئی اُس کا ہمراز ہو گا۔ وہ اُس کے ذریعے کسی قریبی گاؤں سے گوشت منگواتی تھی اور اندھیرا ہونے پر شکارے تک پہنچا دیتی تھی۔ اگر اس کا کوئی ہمراز موجود ہوتا تو پھر یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ وہی ہمراز گوشت شکارے کے سامنے پھینک جاتا ہو۔ یہ

ہمراز کون ہوسکتا تھا۔ ظاہر ہے کوئی سہیلی یا نوکرانی، سہیلی سے بھی زیادہ نوکرانی کا امکان تھا۔

میں نے اُسی روز گاؤں کی ایک چلتی پھرتی عورت غفوراں نائن سے رابطہ کیا۔ یہ اس گاؤں میں بڑے کام کی عورت تھی۔ سابقہ انسپکٹر یہاں سے جاتے وقت مجھے خاص طور پر غفوراں سے ملا کر گیا تھا۔ میں نے ایک رات خاموشی کے ساتھ غفوراں کو اے ایس آئی رمضان کے گھر بلایا اور اُسے پوری طرح اعتماد میں لے کر شادو کی ٹوہ پر لگا دیا۔ میں نے غفوراں سے کہا کہ وہ شادو کی سہیلیوں اور گھر کی نوکرانیوں پر خاصی نظر رکھے اور اندازہ لگائے کہ اُن میں سے کون ایسی ہے جو چوری چھپے گوشت لانے اور شکارے تک پہنچانے کا کام کرسکتی ہے۔ بظاہر یہ ساری تفتیش کچھ عجیب سی لگتی تھی لیکن مجھے یقین تھا اس بھاگ دوڑ سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوگا۔

غفوراں نے مجھے اگلے ہی روز رپورٹ دے دی۔ اُس نے ماکھو نامی نوکرانی کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ نوکرانی روزانہ گورن پور سے حویلی میں کام کرنے کے لیے آتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ گوشت لاتی ہو...... یہ معلوم کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ گورن پور میں ماکھو کہاں رہتی ہے اور کہاں سے گوشت خریدتی ہے۔ میں نے اُسی روز اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو گورن پور بھیجا اور ہدایت کی کہ وہ ماکھو کے بارے میں سارا پتہ کر کے آئے (ویسے یہ کام بلال شاہ کا تھا لیکن وہ زخمی تھا اس لیے ہیڈ کانسٹیبل کو بھیجنا پڑا) ہیڈ کانسٹیبل تھا تو ہوشیار بندہ اور اکثر گورن پور آتا جاتا بھی رہتا تھا لیکن اُس نے ایک گھنٹے کا کام دو دنوں میں کیا۔ بہرحال اُس کی رپورٹ حوصلہ افزا تھی اور اتنی حوصلہ افزا تھی کہ اگر وہ یہ کام چار دن میں بھی کرتا تو میں اُس پر خوش ہی ہوتا۔ اُس نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ماکھو کو گوشت خریدنے کے لیے کسی دکان پر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ خود اس کا باپ قصائی ہے اور گھر ہی میں بکرا یا چھترا ذبح کر کے بیچ دیتا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے جو طویل رپورٹ دی اُس کا لب لباب یہ تھا کہ کانسٹیبل ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ساتھ ہتھکڑی لے گیا تھا۔ یہ ہتھکڑی اُس نے چادر کی بکل میں چھپائی ہوئی تھی۔ اُس نے ماکھو کے عمر رسیدہ باپ بخشے سے پوچھا کہ ماکھو روزانہ ڈیڑھ دو سیر گوشت حویلی میں لے جاتی تھی۔ اُس گوشت کا وہ کیا کرتی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا لیکن یہ تیر بالکل نشانے پر لگا۔ قصائی بخشے کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پہلے تو اُس نے انکار کیا کہ ماکھو حویلی میں گوشت لے کر جاتی رہی ہے لیکن جب ہیڈ کانسٹیبل نے اُسے ہتھکڑی دکھائی اور پولیس والے ہتھکنڈے استعمال کیے تو ستر سالہ بخشے قصائی گھبرا گیا اور اُس نے اعتراف کیا کہ ماکھو گوشت چوہدری بوٹے کی حویلی میں لے جاتی رہی ہے۔ کانسٹیبل نے بخشے سے پوچھا۔ ''تمہیں معلوم ہے حویلی میں اس گوشت کا کیا ہوتا تھا؟ بخشے انکار میں سر ہلانے لگا اور بولا کہ اُسے کچھ معلوم نہیں۔ اُسے پیسوں سے غرض تھی۔

پیسے اُسے مل جاتے تھے۔ حویلی میں روزانہ گوشت کیوں پکتا ہے اس بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ کانسٹیبل نے کافی کوشش کی لیکن اس کے علاوہ بخشے سے کچھ اور معلوم نہ کر سکا۔ بخشے کا خیال تھا کہ اُس کی بیٹی سے کوئی غیر قانونی حرکت ہوگئی ہے اس لیے وہ ہیڈ کانسٹیبل سے ماکھو کے لیے رحم کی درخواست کرتا رہا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بخشے کو پابند کیا کہ وہ اس تفتیش کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا اور گورن پور سے واپس آ گیا۔''

ہیڈ کانسٹیبل کی رپورٹ کے بعد میرا گورن پور جانا ضروری ہوگیا تھا۔ اُسی روز شام کے بعد میں نے اپنا سرکاری گھوڑا لیا اور گورن پور روانہ ہوگیا۔ یہ تازی یعنی عربی نسل کا بڑا شاندار گھوڑا تھا اور اس کا ذکر میں پہلے بھی کسی کہانی میں کر چکا ہوں۔ آٹھ بجے کے بعد میں گورن پور پہنچا۔ ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں سادہ لباس میں تھے۔ اُن دنوں آٹھ بجے کے بعد دیہات میں رات ہی سمجھی جاتی تھی۔ ہم دونوں کسی کی نگاہ میں آئے بغیر بخشے قصائی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ کھولنے والی خود ماکھو تھی۔ ہمیں دیکھ کر اور پہچان کر اُس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ کسی کے دروازے پر پولیس کا آنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی اور جب گھر والوں کو یہ ڈر بھی ہو کہ پولیس آئے گی تو پھر دروازہ کھولتے ہوئے وہ جتنا بھی ڈریں کم ہوتا ہے۔ ماکھو کی بھی یہی حالت ہوئی تھی۔ اُس نے کوئی قتل نہیں کیا تھا لیکن ایک چکر میں تو پھنس گئی تھی۔ گھر میں ماکھو کے علاوہ اُس کی چھوٹی بہن اور بوڑھے والدین کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ پورے گھر میں ہڈیوں کی بو باس پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جگہ کھالیں ڈھیر کی گئی تھیں۔ صحن میں دو ادھیڑ عمر بکرے بندھے ہوئے تھے۔ ایک کوٹھڑی نما کمرے میں دیے کی مدھم روشنی تھی اور ایک بڑھیا ایک بیمار بوڑھے کے سرہانے بیٹھی خوف زدہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ بیمار بوڑھا ماکھو کا باپ بخشے ہے۔ اُسے کل رات سے شدید بخار تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ یہ بخار ہیڈ کانسٹیبل کی پوچھ گچھ کا نتیجہ تھا۔ بوڑھا بخشے غنودگی کی حالت میں ساری رات بڑبڑاتا رہا تھا۔ کہ اس کی بیٹی بے قصور ہے۔ اُسے تھانے میں مت لے جاؤ۔ اُس نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے بوڑھے کی حالت پر ترس آیا۔ قریب بیٹھ کر میں نے بڑی محبت سے اُس کی ڈھارس بندھائی اور کہا کہ اس کی بیٹی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ میرا نرم رویہ دیکھ کر بوڑھے بخشو کے آنسو بہہ نکلے اور اُس نے مجھے وہ باتیں بھی بتا دیں جو کل کانسٹیبل سے چھپالی تھیں کہنے لگا۔

''تھانیدار جی! میری بیٹی کا صرف اتنا قصور ہے کہ وہ وہی کچھ کرتی رہی جو چوہدری بوٹے کی بیٹی اس سے کہتی رہی۔ اُس لڑکی کے دماغ میں پتہ نہیں کیا خناس ہے۔ وہ یہ گوشت اسلم جٹ کے کتے ''شکارے'' کے لیے منگواتی تھی پھر کبھی خود اُسے ڈال کر آتی تھی۔ کبھی ماکھو کو بھیجتی تھی کہ اُسے

ڈال کر آئے۔ ہم چاروں اور چوہدری کی بیٹی کے علاوہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلم جٹ کے کتے پر سائیں سانول کا ہاتھ ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ کتا نہیں کوئی ہوائی شے ہے۔ یہ ساری باتیں سفید جھوٹ ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ چوہدری کی لاڈاں پٹی بیٹی اس پر مہربان ہے۔ اُس نے ماکھو کو بڑی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اس بارے میں کسی کو نہیں بتائے گی۔ ماکھو ہمیں بھی نہیں بتاتی تھی۔ میں نے بڑی مشکل کے ساتھ اس سے یہ باتیں معلوم کی تھیں......''

اب ساری بات کھل گئی تھی۔ میں ماکھو کو تھوڑی دیر کے لیے باہر برآمدے میں لے گیا اور اُس سے پوچھ گچھ کی۔ اُس نے وہی کچھ بتایا جو اُس کا بوڑھا باپ بخشے بتا چکا تھا۔ اُس نے میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''شادو بی بی میری سہیلی نہیں مالکن ہے جی...... مجھے اتنی ہی بات کا پتہ ہوتا ہے جتنی وہ مجھے بتاتی ہے۔ پہلے پہلے وہ اسلم اور اُس کے کتے کی بڑی ویری تھی۔ اُس نے اسلم کو برا بھلا کہا تھا اور پھر اُس کے گھر جا کر اُس کی ماں سے بھی لڑی تھی۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ بدل گئی۔ اُس نے مجھ سے اسلم کے کتے کے لیے بکرے کا گوشت منگوانا شروع کر دیا اور خود جا کر اُسے ڈالنے لگی۔ میرے پاس ایک پتیلی تھی۔ جب پچھلے ٹائم حویلی سے فارغ ہو کر میں واپس گھر جاتی تھی تو اس پتیلی میں بچا کھچا سالن اور روٹیاں رکھ لیتی تھی۔ صبح حویلی آتے ہوئے میں اس پتیلی میں گوشت لے آتی تھی۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ گوشت آیا ہے۔ شادو یہ گوشت ایک قلفی (ٹفن کیریئر) میں ڈال کر بھوسے والی کوٹھڑی میں چھپا لیتی تھی۔ رات کو جب سارے سو جاتے تھے، شادو چپکے سے اٹھتی تھی اور کماد کے کھیتوں میں سے گزر کر یہ گوشت شکارے کے سامنے پھینک آتی تھی۔ اُس کی چٹری میں خوف تو بالکل ہے ہی نہیں بڑی نڈر لڑکی ہے۔ میں نے کئی بار اُس سے کہا ''چھوٹی بی بی رات کو جاتی ہو کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کیا ہوگا'' پر اُس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ جو بات ایک بار اُس کے دماغ میں گھس جائے بس گھس جاتی ہے۔ کبھی کسی روز جب میں رات حویلی میں گزارتی تھی تو وہ مجھے گوشت ڈالنے کے لیے بھیج دیتی تھی۔ ایک دو بار تو مجھے کھیتوں سے گزرتے ہوئے بڑا ڈر لگا لیکن پھر عادت سی ہو گئی۔''

ماکھو کا بیان عجیب و غریب اور دلچسپ تھا۔ ایسے واقعات عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتے لیکن دور دراز دیہاتی علاقوں میں لوگوں کے کمزور عقیدے اس سے بھی بڑے بڑے کرشمے دکھاتے ہیں۔ میں نے ماکھو سے کہا۔ ''چار مہینے پہلے شادو کو ایک کتے نے کاٹ کھایا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ گورن پور میں ارائیوں کے کتے نے کاٹا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہوا تھا۔''

ماکھو نے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کھرچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس بارے میں ٹھیک طرح پتہ نہیں ہے جی۔'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی تھی۔ میں نے بولنے پر مجبور کیا تو اٹک اٹک کر بولی۔

''ہو سکتا ہے جی شکارے نے ہی اُسے کاٹا ہو اور اُس نے یہ بات چھپانے کے لیے ارائیوں کے کتے کا نام لے لیا ہو۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہیں اسلم اور شادو میں یہ میل جول تو نہیں ہو گیا تھا۔''

وہ اس سوال پر کانپ سی گئی۔ ہکلا کر بولی۔ ''آپ تھانیدار ہیں، میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی اب بولوں گی۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ ویسے بھی اسلم پچھلے تین چار مہینوں سے جیل میں ہے۔ اللہ نہ کرے کوئی ایسی بات ہو جی...... ورنہ چوہدری صاحب کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ماکھو کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

میں نے قریباً دو گھنٹے بخشو قصائی کے گھر میں گزارے اور ان لوگوں سے جو کچھ بھی معلوم کر سکتا تھا کر لیا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب یہ گتھی جلد ہی سلجھنے والی ہے۔ اگر کسی طرح یہ پتہ چل جاتا کہ شادو اچانک اسلم اور اُس کے کتے پر مہربان کیوں ہوئی تھی تو ساری کی ساری کڑیاں آپس میں مل جاتیں۔

☆======☆======☆

وہ ایک چاندنی شام تھی۔ جی ہاں...... رات کے علاوہ شام بھی چاندنی ہوتی ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ پوری رات کا چاند ہو تو سورج ڈوبتے ہی مشرق سے چاند کی تھالی نمودار ہو جاتی ہے۔ وہ بیساکھی کا موسم تھا۔ گندم کی فصل پکنے والی تھی۔ درختوں پر نئے پھول پتے نکل رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے چوہدری بوٹے کی حویلی کا رخ کیا۔ آج میں اُس سے نہایت اہم بات چیت کرنے جا رہا تھا۔ چوہدری گھر ہی میں موجود تھا۔ اُس نے شربت وغیرہ سے تواضع کی۔ پھر ہم حویلی کی بیٹھک میں آ بیٹھے۔ چوہدری کے دونوں بیٹے شہر گئے ہوئے تھے۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ میں چوہدری سے جو بات کرنا چاہتا تھا اس میں شادو کے جوان بھائیوں کا ہونا مناسب نہیں تھا۔ جوان خون جلد جوش مار جاتا ہے اور بند کمروں میں کی جانے والی بات بھی گلی کوچوں میں گونجنے لگتی ہے۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ چوہدری سے گفتگو کا آغاز کیا اور اشاروں کنائیوں میں بڑی نرمی کے ساتھ اُسے سمجھا دیا کہ اس کی لاڈلی پتری اب اتنی چھوٹی نہیں رہی جتنی وہ سمجھ رہا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ اب اُس پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے بلکہ بہتر ہے کہ وہ اُس کے لیے رشتہ وغیرہ دیکھے اور اُس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کرے۔ چوہدری نے گھبرا کر پوچھا کہ میں اُس سے یہ باتیں کیوں کر رہا ہوں۔

میں نے چوہدری سے کہا۔ ''ابھی تو خطرے والی بات نظر نہیں آتی مگر ہو سکتا ہے خطرہ پیدا ہو جائے۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ شادو رات کو چوری چھپے حویلی سے نکلتی ہے اور اکبرے

کے گھر تک جاتی ہے۔''

میرے انکشاف نے چوہدری کو لال پیلا کر دیا۔ یوں لگا جیسے وہ مجھ پر جھپٹ پڑے گا لیکن پھر اُس نے خود کو سنبھالا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''نواز خاں! ہوش کی بات کرو، ہوش کی بات...... کیا کہہ رہے ہو تم...... کیا کرنے جاتی ہے میری دھی اکبرے کے گھر۔''

''اُن کے کتے کو گوشت ڈالنے۔'' میں نے پورے یقین سے جواب دیا۔

''گوشت ڈالنے؟'' وہ سرتاپا حیرت نظر آنے لگا۔

''ہاں گوشت ڈالنے۔'' میں نے کہا۔ ''اور یہ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں۔ پچھلے پورے چار ماہ سے یہ ہو رہا ہے۔ بتاؤ تمہیں یا تمہارے بیٹوں کو کانوں کان خبر ہوئی ہے؟ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ شادو اب بچی نہیں بڑی ہو چکی ہے۔''

چوہدری سٹپٹا کر رہ گیا۔ اُس کی عجب حالت ہو رہی تھی۔ لگتا تھا میری ذہنی صحت پر شک کر رہا ہے۔ بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''تھانیدار! یہ تم کیا باتیں کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تمہیں حیران کرنے والی کچھ اور باتیں بھی ہیں...... چار پانچ ماہ پہلے شادو کو جس کتے نے کاٹا وہ ارائیوں کا کتا نہیں تھا۔ وہ یہی شکارا تھا جو اکبرے کے گھر میں بندھا رہتا تھا اور اب اے ایس آئی پراچہ کے گھر میں ہے۔''

چوہدری کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا دوسرا جا رہا تھا۔ میں نے اُس کی اُلجھن دور کرنے کے لیے شروع سے آخر تک جو کچھ مجھے معلوم تھا اُسے بتا دیا۔ چوہدری آخر چوہدری تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے اپنا خیر خواہ سمجھتا اور میری باتوں پر اعتبار کرتا وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ''تھانیدار! تم لوگ میری معصوم دھی پر الزام لگا رہے ہو۔ پتہ نہیں کس کی لگائی بجھائی میں آئے ہو تم لوگ۔ مجھے تو یہ ساری کسی شریک کی کارستانی لگتی ہے......'' باتیں کرتے کرتے وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''ٹھہرو میں پوچھتا ہوں شادو سے'' وہ تیز قدموں سے اندر گیا اور ''پتری پتری'' کی آوازیں دینے لگا۔ ''ہاں ابا!'' کہیں اندر سے شادو کی بہت باریک اور سریلی آواز ابھری۔ اس کے بعد کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

یہ دروازہ قریباً پندرہ منٹ بعد پھر کھلا۔ چوہدری کا چہرہ بدستور لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس نے طیش بھری نظروں سے مجھے گھورا اور موڑھے پر ڈھیر ہو کر حقے کے طویل کش لیتے ہوئے بولا۔ ''اس حرام زادی کم ذات نے جھوٹ بولا ہے۔ الزام لگایا ہے میری دھی رانی پر۔ میں ٹکڑے کرا دوں گا اُس کے اور اُس کے باپ کے......'' میں سمجھ گیا کہ چوہدری ماکھو اور اُس کے باپ کا ذکر

خیر کر رہا ہے۔ یقیناً شادو نے کوئی بھی الزام تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا اور چوہدری نے لاڈلی بیٹی کی صفائی کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''چوہدری! تم سیانے بیانے ہو کر بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ ماکھو اور اُس کے باپ کا اس میں کیا قصور ہے۔ وہ دونوں تو زبان ہی نہیں کھول رہے تھے۔ یہ مجھے پتہ ہے میں نے کتنی مشکل سے انہیں بولنے پر مجبور کیا ہے۔''

''تو کیوں تم پڑے ہوئے ہو میری بیٹی کے پیچھے۔ کیوں راکھ ڈالنا چاہتے ہو ہمارے سروں پر؟ میں تمہیں ایک بات صاف صاف بتا دوں۔ میری بیٹی بالکل بے قصور ہے۔ یہ سارا چکر ہمارے کسی ویری کا چلایا ہوا ہے اور تم اس چکر میں آ رہے ہو اور کوئی بات ہے ہی نہیں۔ اس معاملے کو بالکل ختم کر دو۔ ورنہ ہمارا اور تمہارا بہت نقصان ہو گا اس میں۔''

میں نے کہا۔ ''چوہدری اگر یہ صرف تیری بیٹی اور اسلم کا معاملہ ہوتا تو میں ختم کر دیتا لیکن اس سے سانسی کا قتل بھی نتھی ہے۔ میں کیسے ختم کر سکتا ہوں یہ معاملہ۔''

چوہدری بہت بھڑکا ہوا تھا۔ ایسے میں اُس کے منہ سے کوئی عقل کی بات نہیں نکلنی تھی۔ میں اُسے خدا حافظ کہہ کر حویلی سے لوٹ آیا...... جس وقت میں حویلی کے بڑے دروازے سے باہر نکلا قریباً نو بج چکے تھے۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ دور کہیں گاؤں کے وسط میں آوارہ کتے زور و شور سے بھونک رہے تھے۔ جب میں تھانے جانے کے لیے حویلی کی دائیں جانب آیا ایک دم مجھے چونکنا پڑا۔ ایک سایہ سا حویلی کی دیوار پر نظر آیا اور کود کر اندر چلا گیا۔ چاندنی رات تھی ورنہ یہ واقعہ میری نظر سے اوجھل رہتا اور میں بڑے آرام سے ٹہلتا ٹہلتا تھانے جا پہنچتا۔ اس کے بعد حویلی کے اندر جو کچھ ہوتا اُس کا خیال بھی لرزہ خیز تھا۔ سائے کے اندر کودتے دیکھ کر میں جلدی سے دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ پہلا خیال تو ذہن میں یہی آیا کہ شاید یہ حویلی کا کوئی ملازم تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ یہ کوئی چور ڈاکو ہی ہو۔ دیوار پھلانگ کر اندر جانا کوئی معمولی واقعہ بھی ہو سکتا تھا۔ میں کچھ دیر دیوار کے ساتھ کھڑا اندر کی سن گن لیتا رہا۔ کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ میں واپس حویلی کے دروازے کی طرف آیا۔ مجھے دروازے تک چھوڑ کر اور دروازہ بند کر کے چوہدری بوٹا واپس جا چکا تھا۔ اب حویلی کے برآمدے میں بھی مکمل تاریکی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پھاٹک کے اوپر سے ہاتھ ڈال کر کنڈی گرائی اور اندر داخل ہو گیا۔ میری معلومات کے مطابق آج چوہدری کی حویلی میں اُس کی بیٹی بیوی اور ایک بہو کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے دونوں بیٹے شہر گئے ہوئے تھے۔ نوکرانی ماکھو کام کر کے گورن پور واپس چلی جاتی تھی۔ ایک اور نوکرانی بھی تھی لیکن وہ ان دنوں بیمار تھی۔ حویلی کے تین مرد ملازم حویلی سے باہر اصطبل میں سوتے تھے۔ حویلی کے تاریک برآمدے

میں پہنچتے ہی مجھے خطرے کا احساس ہو گیا۔ میں نے پیٹ پر سے قمیض تھپتھپائی نیچے سرکاری ریوالور موجود تھا۔ میں برآمدے کے ایک تاریک کونے میں کھڑا تھا۔ یہاں ایک طرف بھوسے کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور دوسری طرف اناج رکھنے کے بڑے بڑے گھروندے تھے۔ جنہیں دیہات میں بھڑولے کہا جاتا ہے۔ اُس بیٹھک کا دروازہ مجھ سے قریباً پندرہ قدم کے فاصلے پر تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں اور چوہدری بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بیٹھک میں ابھی تک روشنی تھی اور میری ساری توجہ بیٹھک کے دروازے پر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اچانک سیڑھیوں پر شور سنائی دیا اور میرے بالکل قریب سے چیخ سنائی دی تو میں بری طرح گڑبڑا گیا...... کوئی چیختا ہوا سیڑھیوں پر بھاگا آ رہا تھا۔ یہ شادو تھی وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح میری دائیں طرف سے برآمد ہوئی اور احاطے کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں مجھے یہ احساس ہو گیا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ جونہی پیچھے آنے والا سیڑھیوں سے اُترا اور شادو کے پیچھے لپکا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور اُسے لیتا ہوا بھوسے کے ڈھیر پر گرا۔ چھلانگ لگاتے ہوئے مجھے اس بات کا پورا احساس تھا کہ مدمقابل کے ہاتھ کوئی ہتھیار، پستول، چاقو وغیرہ ہو سکتا ہے۔ میرا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔

بھوسے پر گرتے ہوئے میں نے اپنے حریف کے دائیں ہاتھ پر نظر کی۔ چاندنی کی اُجلی روشنی میں مجھے ایک خطرناک پھل کا چاقو نظر آیا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے حریف کی چاقو والی کلائی دبوچ لی۔ بھوسے پر گرتے ہی وہ تڑپ کر سیدھا ہوا۔ مجھے فقط اس کی بڑی بڑی مونچھیں ہی دکھائی دیں۔ تاک کر ایک ٹکر میں نے اُس کی پیشانی پر رسید کی۔ یہ بڑی زوردار ضرب تھی۔ مدمقابل کا سر زمین پر ہوتا تو اُسے تارے نظر آ جاتے۔ لیکن وہ چونکہ بھوسے کے ڈھیر پر تھا اس لیے یہ ضرب آسانی سے سہہ گیا۔ اُس نے بڑے ماہرانہ انداز سے میری پسلیوں پر گھٹنا رسید کیا اور بائیں ٹانگ کے زور سے مجھے پیچھے اچھال دیا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا جوان تھا۔ اُس کی شکل تو ٹھیک طرح نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس کے منہ سے جو گالیاں نکلیں اُن سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سانسی قبیلے سے ہے۔

میں نے دو تین مکے اس کے چہرے پر مارے۔ اس نے سنبھل کر اپنا داہنا ہاتھ پیچھے کیا۔ یہ بڑا خطرناک انداز تھا۔ میں جان گیا کہ وہ چاقو کا وار کرنے لگا ہے۔ میں دو قدم پیچھے ہٹا۔ اُس نے ایک دم ارادہ بدل دیا اور یکلخت میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ میں نے بھی اس کے تعاقب میں دوڑ لگائی لیکن ابھی بمشکل میں نے چار یا پانچ قدم اٹھائے ہوں گے کہ چوہدری بوٹا بھاگتا ہوا ایک کمرے سے نکلا اور بدحواسی میں مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں سنبھلتے سنبھلتے بھی ایک چارپائی سے جا ٹکرایا۔

چوہدری کی تو ایک ساتھ دو قلابازیاں لگ گئی تھیں۔ چوہدری کے ایک ہاتھ میں بارہ بور کی رائفل تھی۔ میں نے بھاگ کر اُس کا رائفل والا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایسا کر کے میں نے خود کو شدید خطرے سے

بچا لیا تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ تاریکی اور بدحواسی میں چوہدری مجھ پر ہی ''ٹھاہ'' کر دیتا۔

چوہدری کے ٹکرا جانے سے سانسی کو جو چند لمحوں کی مہلت ملی اس میں وہ فرار ہو گیا......

چوہدری اور اُس کے ملازموں کے ساتھ مل کر ہم نے گاؤں کی گلیوں میں بھاگ دوڑ کی لیکن سانسی جیسے خاموشی سے آیا تھا ویسے ہی خاموشی سے غائب ہو گیا تھا۔ اس واقعے کی خبر آناً فاناً پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ حویلی کے سامنے جمع ہو گئے اور ایک دوسرے سے معلومات حاصل کرنے لگے۔ میں چوہدری کے ساتھ واپس حویلی میں آ گیا۔ یہاں بھی اڑوس پڑوس کی عورتیں موجود تھیں اور ڈری ڈری سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ شادو کا رو رو کر برا حال تھا۔ اُس کا کرتہ پیچھے سے پھٹ گیا تھا اور ایک بازو پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بتا رہی تھی مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کون تھا اور کہاں سے آیا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

''میں چاٹی میں سے دودھ نکالنے لگی تھی ایک دم پچھواڑے والی کھڑکی کھلی اور وہ دھم سے اندر کود آیا۔ اس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا چاقو تھا۔ اندر آتے ہی اس نے مجھے چاقو مارنا چاہا، میں پیچھے ہٹ گئی۔ چاقو میرے بازو پر لگتا ہوا دیوار پر گیا۔ میں چیختی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ اُس نے پیچھے سے پکڑ لیا۔ میری قمیض پھٹ کر اُس کے ہاتھ میں رہ گئی اور میں سیڑھیوں سے بھاگتی ہوئی نیچے آ گئی......''

شادو سخت خوفزدہ تھی۔ میں نے اُسے دلاسہ دیا اور ساتھ لے کر بیٹھک میں آ گیا۔ چوہدری بھی میرے ساتھ تھا۔ اب اُس میں آدھ گھنٹے پہلے والا دم خم اور جوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی بجائے وہ کچھ شرمندہ شرمندہ اور خاموش تھا۔ میرے ساتھ ٹکرانے سے اُسے بھی چوٹ آئی تھی اور ماتھے پر ایک بڑا سا نیلا ابھار نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا ''چوہدری! تمہیں تکلیف تو ہو گی لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنی ''بھتیجی'' سے ذرا اکیلے میں دو باتیں کروں۔ تم تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جاؤ۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو چوہدری ہرگز میری بات پر کان نہ دھرتا لیکن تھوڑی دیر پہلے وہ جو تماشہ یہاں دیکھ چکا تھا اُس کے بعد وہ کافی بدلا بدلا نظر آتا تھا۔ چوہدری باہر چلا گیا تو میں نے گہری نظروں سے روتی بسورتی شادو کو دیکھا اور سنجیدگی سے کہا۔ ''اب بھی وقت ہے۔ سچی بات بتا دو۔ اس بار تو قسمت سے بچ گئی ہو، ضروری نہیں کہ اگلی دفعہ بھی ایسا ہو۔'' وہ خاموش رہی۔ اُس کی خاموشی نیم رضامندی کی طرح تھی۔ یعنی وہ یہ بات تسلیم کر رہی تھی کہ اُس نے باپ سے جھوٹ بولا ہے۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... بولو، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ ایک دم رونے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ ڈھب پر آ رہی ہے۔ وہ قتل ہوتے ہوتے بچی تھی اور ایسا میرے

وسیلے سے ہوا تھا۔ وہ میری احسان مند بھی تھی اس کے علاوہ آنے والے وقت کا خوف بھی اُس کے ذہن پر سوار تھا۔ حملہ آور بچ کر چلا گیا۔ معلوم نہیں تھا کہ کب اور کہاں وہ دوبارہ اُس پر ہلہ بول دیتا...... شادو بڑی مشکل سے بولی اور جب بولی تو بہت کھل کر بولی۔ اس نے جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تھانیدار جی! آپ میرے ابا جی کو بھی بلا لیں۔ میں سب کچھ اُن کے سامنے کہوں گی۔'' مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مقصد تو یہ تھا کہ وہ اندر کی بات بتا دے۔ اکیلے میں بتائے یا سب کے سامنے۔

میرے اور چوہدری کے سامنے شادو نے جو کچھ کہا اُس کی تفصیل خاصی لمبی چوڑی ہے۔ بیچ بیچ میں میں نے اور چوہدری نے اُس سے سوالات بھی کیے۔ ایک دو واقعات ایسے بھی تھے جو شادو نے اشاروں کنایوں میں بتائے۔ اور مجھے اُن کی تفصیل بعد میں اسلم سے معلوم ہوئی۔ بہر حال اس چاندی رات میں حویلی کی سجی سجائی بیٹھک میں شادو نے جو کچھ بتایا اس کا مختصر احوال مندرجہ ذیل ہے۔

''شادو حملہ آور کو جانتی نہیں تھی لیکن اُسے معلوم تھا وہ کون ہے۔ وہ اُس سانسی کا چچا زاد بھائی تھا جو چند روز پہلے اکبرے کے گھر کے عین سامنے کھیتوں میں ہلاک ہوا تھا۔ کھیتوں میں ہلاک ہونے والے سانسی کا نام ناجا تھا اور ناجے سے بھی شادو کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ یہ قصہ اس وقت شروع ہوا جب قریباً پانچ ماہ پہلے اسلم کے کتے نے شادو اور اُس کی سہیلیوں سے چھیڑ چھاڑ کی۔ شادو کی ایک سہیلی ڈر کر بھاگی اور اُس کی گاگر ٹوٹ گئی۔ شادو اسلم پر اور بعد میں اس کی ماں پر بہت برہم ہوئی اور حسب عادت بے نقط سنائیں۔ اس واقعے سے صرف ایک ہفتہ بعد کی بات ہے۔ چاندنی رات میں ڈیک نالے کے کنارے لڑکیوں نے کھیلنے کودنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ پنجابی میں اسے ''گدا ڈالنا'' کہتے ہیں۔ شادو کے والدین اُسے باہر نکلنے سے روکتے تھے لہٰذا جب عشاء کے بعد سب سو گئے تو وہ چپکے سے نکلی اور سہیلیوں میں پہنچ گئی۔ گھنٹہ دو گھنٹے ناچ گا کر لڑکیاں اپنے گھروں کو واپس روانہ ہو گئیں۔ شادو بھی اپنی ایک سہیلی کے ساتھ لوٹی۔ سہیلی کا گھر گاؤں سے باہر ہی تھا۔ وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی تو شادو اپنے گھر کی طرف چل دی۔ شادو کی سہیلی نے کہا بھی کہ وہ اکیلی نہ جائے وہ اور اُس کی ماں اُسے چھوڑ آتی ہیں لیکن وہ اس احتیاط کو خاطر میں نہ لائی اور تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف چل دی۔ گھر وہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور گاؤں کی آبادی قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر تھی۔ شادو اس سے پہلے بھی کئی بار کراڑے مارتی ہوئی یہ فاصلہ طے کر چکی تھی لیکن آج معاملہ کچھ اور تھا جونہی وہ اپنی حویلی کی طرف مڑنے کے لیے اکبرے اور اسلم کے کھیتوں میں پہنچی ا[illegible]نک کماد سے دو آدمی نکلے اور اس سے زبردستی کرنے لگے۔ دونوں لمبے

تڑنگے تھے اور انہوں نے اپنے چہرے پگڑیوں میں چھپا رکھے تھے۔ ایک شخص نے شادو کا منہ بند کر لیا اور دوسرا اُسے گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ واقعہ اکبر کے مکان کے پچھواڑے ہوا۔ اس کا قوی ہیکل ''شکارا'' وہاں سے بیس پچیس قدم کے فاصلے پر بندھا ہوا تھا۔ اُس نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا اور اپنی زنجیر کو جھٹکے دینے لگا۔ شادو تنومند اور زور آور لڑکی تھی۔ چھریرے بدن کی اونچی لمبی مٹیار، دودھ مکھن کی پلی ہوئی۔ اس نے دونوں پگڑی پوشوں کی زبردست مزاحمت کی اور کئی بار اُن کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ جب جب اُسے موقعہ ملتا تھا وہ چیخ بھی بلند کر دیتی تھی۔ دوسری طرف شکارا بھی اندھا دھند زور لگا رہا تھا اور بھونک رہا تھا۔ جس کھونٹے سے وہ بندھا ہوا تھا وہ کچی زمین میں تھا۔ لہٰذا شکارے نے جب بہت زور مارا تو کھونٹا اپنی جگہ سے اُکھڑ گیا۔ شکارے نے چیتے کی طرح جست کی اور پانچ فٹ اونچی دیوار پھلانگتا ہوا تیزی سے حملہ آوروں کی طرف لپکا۔ اُس وقت تک حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے شادو کو بے بس کر کے گھوڑے پر لاد لیا تھا اور ایڑ لگا چکے تھے۔ یہ گھوڑے تھے۔ جونہی وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے کچے راستے پر پہنچے شکارا اُن کے پیچھے ہو لیا۔ پچھلے گھوڑے پر سوار حملہ آور نے لاٹھی کے ضربوں سے بار بار کتے کو پیچھے ہٹانا چاہا لیکن وہ گھوڑے کے ساتھ ہی چپکا رہا۔ آخر اُس نے گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں پر حملہ کیا اور اُسے سوار سمیت زمین بوس کر دیا۔ اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر دوسرے گھڑ سوار نے بھ[illegible] اپنی گھوڑی روک لی۔ شادو بھی اسی گھوڑی پر تھی۔ جونہی گھوڑی رُکی شادو زور مار کر نیچے اُتر گئی۔ گھوڑی سوار نے بھی ساتھ ہی چھلانگ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ شادو بھاگتی گھوڑی سوار پھر اُسے دبوچ چکا تھا۔ لیکن اب شادو اکیلی نہیں تھی اُس کا نڈر خیر خواہ بھی ساتھ تھا۔ اُونچا لمبا برق رفتار شکارا...... بلائے ناگہانی کی طرح حملہ آور پر جھپٹا اور اپنا جبڑا اُس کی رانوں میں گھسا دیا۔ حملہ آور نے لرزہ خیز چیخ ماری اور اُلٹ کر گرا۔ گھوڑی سوار کا ساتھی لوہے کی میخوں والی لاٹھی سونت کر شکارے پر پل پڑا۔ اسی دوران شادو نے بھاگتے قدموں کی آواز سنی۔ یہ اسلم تھا۔ وہ اپنے کتے کی آواز سے جاگا تھا اور اب بھاگتا ہوا موقعے پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ آتے ساتھ ہی وہ حملہ آوروں سے بھڑ گیا۔ دونوں میں کچھ دیر زبردست لٹھ بازی ہوئی پھر اچانک پگڑی پوش لٹھ باز نے میدان چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے بھاگا اور کماد کے اونچے اونچے کھیتوں میں گم ہو گیا۔ شکارا موقعے پر موجود نہیں تھا۔ ورنہ وہ ضرور اُسے پکڑ لیتا۔ دراصل جب اسلم اور پگڑی پوش میں لاٹھی چل رہی تھی پگڑی پوش کا زخمی ساتھی گھوڑے پر چڑھ کر بھاگ نکلا تھا۔ شکارا اُسی کو ''گھر تک'' پہنچانے گیا تھا۔ وہ جب دونوں گھوڑوں اور زخمی حملہ آوروں کو گاؤں کی حدود سے باہر نکال کر واپس آیا تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔

اسلم نے شادو کو دلاسہ دیا اور اس کی گمشدہ جوتی اور اوڑھنی ڈھونڈنے میں اُس کی مدد کی۔ پھر وہ بڑی عزت کے ساتھ اُسے حویلی والی گلی چھوڑ آیا۔ شادو نے روتے ہوئے اُس سے درخواست کی تھی کہ اس واقعے کی خبر کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔ اسلم نے نہ صرف وعدہ کیا بلکہ وعدے کا پاس بھی کیا اور گاؤں میں کسی کو اس واقعے کی بھنک تک نہیں پڑی۔ شادو اسلم کی احسان مند تو ہو ہی گئی تھی اب اُس کے جوان دل کی دھڑکنوں میں اونچے لمبے جی دار اسلم کی محبت بھی جاگ گئی۔ دوسری طرف اسلم بھی شادو کے نوخیز جسم کو چھو کر ایک لذت آمیز کسک سے آشنا ہو چکا تھا۔ اس موقعے پر شادو کی ایک سہیلی سکھاں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ اسلم کی رشتے دار بھی تھی۔ اُس نے نامہ بری کا کام کیا اور یوں اسلم اور شادو ایک دوسرے کی دید کے لیے تڑپنے لگے۔

دو ہفتے بعد شادو کو گھر والوں کے ساتھ ایک شادی میں گورن پور جانا پڑا۔ ایسے موقعوں پر میل ملاقات میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ دل کے روگی نگاہوں کی پیاس بجھانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ شادو نے اپنی سہیلی سکھاں کے ہاتھ اسلم کو پیغام بھجوایا کہ وہ شادی کی رات اسلم کو روہی نالے پر ملنے آئے گی۔ یہ جگہ کندی وال اور گورن پور گاؤں کے درمیان واقع تھی۔ یعنی دونوں طرف سے فاصلہ قریباً چار چار فرلانگ تھا۔ شادو نے اسلم کو رات آٹھ بجے کا وقت دیا تھا لیکن وہ سہیلیوں اور بڑی بوڑھیوں میں ایسی پھنسی کہ آٹھ بجے کی بجائے رات پچھلے پہر روہی نالے پر پہنچ سکی۔ سکھاں اس کے ساتھ تھی۔ وہ نالے سے کچھ ادھر ہی پھلاہی کے درختوں میں رُک گئی۔ شادو اپنے محبوب سے ملنے مقررہ جگہ پر پہنچی۔ اسلم نالے کے کنارے جنتر کی جھاڑیوں میں شادو کی راہ دیکھتے دیکھتے سو چکا تھا۔ ایک بازو سر کے نیچے رکھے وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ شادو اسلم کے نزدیک پہنچی لیکن اُسے ایک چیز کا پتہ نہیں تھا۔ اسلم کا کتا شکارا اپنے خوابیدہ مالک کی حفاظت کر رہا تھا۔ اسلم سے صرف آٹھ دس قدم کے فاصلے پر وہ بالکل چوکس اور بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ جونہی چادر میں لپٹی ہوئی شادو اسلم کے سرہانے پہنچی وہ غراتا ہوا اٹھا اور تیر کی طرح شادو پر آیا۔ اس دوران اسلم بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا شکارا شادو کی نازک پنڈلی پر دانت آزما چکا تھا۔ اسلم نے کتے کو ٹھوکر مار کر پرے دھکیل دیا اور پھر طیش میں آ کر لوہے کی زنجیر سے اُسے پیٹنے لگا۔ شادو تڑپ کر اُس کے سامنے آ گئی اور کراہتی ہوئی بولی کہ وہ کتے کو کچھ نہ کہے...... یوں اسلم اور شادو کی پہلی اور آخری ملاقات ایک حادثے کی نذر ہو گئی۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ پیار کی تکلیف میں بھی لذت ہوتی ہے۔ محبوب کو سامنے پا کر شادو اپنے زخم کا درد بھول گئی۔ اسلم نے اپنے ہاتھ سے اُسے مرہم پٹی کی...... کچھ دیر اسلم کے پاس بیٹھ کر شادو واپس گورن پور چلی گئی۔

اگلے روز سارا دن اُس نے پنڈلی کا زخم چھپائے رکھا اور سکھاں کو بھی منع کر دیا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرے لیکن شام تک زخم میں تکلیف بڑھ گئی۔ سکھاں نے کہا کہیں کوئی مصیبت نہ پڑ جائے۔ کسی حکیم ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ دونوں سہیلیوں نے منصوبہ بنایا اور رات کو کھیل کود کے دوران اسلم کے کتے کا ''کارنامہ'' ارائیوں کے کتے کے سر تھوپ دیا۔ یقیناً یہ بات ہمیشہ راز ہی رہتی اگر چند روز پہلے بلال شاہ کو شکارا نہ کاٹتا اور ہم اُسے سائیں سانول کے پاس نہ لے جاتے۔ سائیں سانول کا مشاہدہ واقعی حیرت انگیز تھا۔ لوگ اُسے یونہی پیر نہیں مانتے تھے۔ صرف زخم دیکھ کر وہ جان گیا کہ اسی زخم کے ساتھ چوہدری بوٹے کی بیٹی بھی اُس کے پاس آئی تھی...... شادو سے پہلی اور آخری ملاقات کے چند ہی روز بعد اسلم گرفتار ہو گیا تھا۔ جیسا کہ شروع میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ شکار کے دوران ایک دوسرے شکاری غاثے چنگڑ سے اسلم کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ لڑائی کی گرما گرمی میں ایک کارتوس غاثے کے بھائی کو لگ گیا اور وہ شدید زخمی ہو کر ہسپتال میں پہنچ گیا۔ نتیجے میں اسلم کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔ اسلم کی گرفتاری کے بعد شکارے کے برے دن آ گئے۔ جب چوہدری کی حویلی میں شادو کو پتہ چلا کہ اُس کی عزت اور زندگی بچانے والا ''شکارا'' فاقوں کا شکار ہے تو وہ تڑپ اُٹھی۔ ایک روز کھیتوں سے گزرتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ ''شکارا'' دھوپ میں بندھا ہے اور بیکا چیتھڑوں پر منہ مار رہا ہے۔ وہ یہ برداشت نہ کر سکی۔ عورت کی ازلی محبت اُس میں بیدار ہو چکی تھی۔ وہ محبت جو محبت کرنے والے کو کانٹوں پر ننگے پاؤں چلاتی ہے، انگاروں پر سلاتی ہے، خون کے آنسو رلاتی ہے لیکن پھر بھی جان سے پیاری لگتی ہے یہ کوئی معمولی کتا نہیں تھا...... اسلم کا کتا تھا...... اُس کے محبوب کا لاڈلا تھا...... پھر وہ بھوکا کیوں رہتا۔ اُس کے پیٹ کی آگ کیوں نہ بجھتی۔ شادو کو اپنا گوشت بھی اُس کے حلق سے اتارنا پڑتا تو اتار دیتی۔ اُسی روز اس نے اپنی نوکرانی ماکھو کو اعتماد میں لیا اور اسلم کے شکارے کے لیے راشن کا انتظام کر لیا۔ رات کو وہ خود حویلی سے نکلی اور کھیتوں کھیت چلتی ہوئی اُس احاطے میں پہنچ گئی جہاں شکارے کو باندھا جاتا تھا...... پھر شادو کے لیے یہ ہر رات کا معمول بن گیا۔ وہ اپنی ''ناقابل فراموش'' محبت کی انگلی تھام کر حویلی سے نکلتی اور گوشت لے کر شکارے کے پاس پہنچ جاتی۔ کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ شب کی تاریکی میں شکارے کے سامنے گوشت پھینکنے والی چوہدری کی بیٹی ہے۔ وہ بیٹی جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور جس کا نخرہ گاؤں بھر میں مشہور تھا۔ گاؤں والوں کی بات تو دُور کی رہی شادو کے گھر والوں کو بھی گمان نہیں ہوا کہ اُن کی الہڑ بیٹی کسی انوکھی راہ پر چل نکلی ہے...... دن یونہی گزرتے رہے اور پھر وہ اہم واقعہ رونما ہوا۔ جس نے ایک نامعلوم شخص کی جان لے لی اور نتیجے میں مجھے انکوائری کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ میرا اشارہ سانسی ناجے کی موت کی طرف ہے۔ ناجا ہی وہ سانسی تھا جس نے

اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر چار پانچ ماہ پہلے شادو کو کھیتوں سے اُٹھانے کی کوشش کی تھی اور شکارے کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔ اس واقعے میں نہ صرف ناجا خود زخمی ہوا تھا بلکہ اُس کے ساتھی کا گھوڑا بھی ناکارہ ہو گیا تھا۔ بعض سانسی اپنی کینہ پروری اور انتقام کے لیے بہت مشہور ہوتے ہیں۔ ناجا بھی شاید انہی ''ناموروں'' میں سے ایک تھا۔ وہ اسلم اور اُس کے شکارے کا جانی دشمن بن چکا تھا۔ خاص طور پر شکارے کو مارنے کی تو اُس نے سوگند کھا رکھی تھی۔ اُس کے کانوں تک یہ باتیں پہنچتی رہی تھیں کہ شکارا ایک خاص الخاص کتا ہے اور اس پر کسی پیر فقیر کا سایہ ہے لیکن وہ ان باتوں کو خاطر میں لانے والا نہیں تھا۔ ایک روز وہ زہریلے پراٹھے لے کر اپنے ڈیرے سے نکلا اور چھپتا چھپاتا اسلم کے گھر تک پہنچ گیا وہ اگر فوری طور پر پراٹھے پھینک کر چلا جاتا تو شاید اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا مگر بس نے ایسا نہیں کیا۔ غالباً اُس کے دل میں یہ بات آ گئی کہ کتے کے سامنے پائے جانے والے گوشت کی حقیقت معلوم کرنی چاہیے۔ اُسے یقین تھا کہ یہ کسی ہوائی چیز کا کام نہیں بلکہ گاؤں ہی کا کوئی شخص رات کے اندھیرے میں یہ گوشت کتے کے سامنے پھینک جاتا ہے۔ اُسے تجسّس نے مجبور کیا اور وہ وہیں کھیت میں چھپ کر کسی آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک بدکردار کو اس کی بداعمالیوں کی سزا دینے کے لیے قدرت ایک اسٹیج تیار کر رہی تھی اور اب اس خونی ڈرامے کا دوسرا کردار اسٹیج پر نمودار ہونے والا تھا۔ یہ شادو تھی۔ وہ حسبِ معمول رات گئے حویلی سے نکلی اور کھیتوں کے اندر اندر چلتی شکارے کے احاطے تک پہنچ گئی۔ گندم کے کھیت میں چھپے ہوئے ناجے نے ایک عورت کا سایہ دیکھا وہ ہاتھ میں ایک ٹفن کیریئر لیے محتاط قدموں سے شکارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس کی بو سونگھتے ہی ''شکارے'' نے بڑی محبت سے غرانا شروع کر دیا تھا۔ وہ عورت ناجے کے قریب سے گزری تو اُس نے اُسے پہچان لیا...... وہ شادو تھی۔ وہ شادو جس کی جوانی کا پھل کھانے کی کوشش میں ناجے کے دانت کھٹے ہو گئے تھے...... وہ اس شب کی تاریکی میں بالکل اکیلی ان سنسان کھیتوں میں موجود تھی۔ ناجے نے اُس کے حسین سراپے کو گھورا اور اس کے اندر کا شیطان ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ اُس کے دو دشمن یعنی شکارا اور شادو ایک ہی مقام پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اُس نے پہلے شادو سے نبٹنے کا فیصلہ کیا۔ ایک دم وہ کسی عفریت کی طرح گندم کے کھیت میں سے نکلا اور شادو پر جا پڑا۔ ایک پہلوانی داؤ استعمال کرتے ہوئے اس نے شادو کو چارے کے اونچے کھیت میں گرا لیا اور بھوکے بھیڑیے کی طرح بھنبھوڑنے لگا۔ ایک بار پھر وہی چند ماہ پہلے کا منظر دُہرایا جا رہا تھا لیکن آج فرق یہ تھا کہ شادو کے ساتھ ہونے والی دست درازی شکارے کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ ویسے بھی وہ ایک مضبوط زنجیر سے بندھا ہوا تھا اور اس کا احاطے میں سے باہر نکلنا ناممکن تھا۔ عین ممکن تھا کہ شادو باز و کے پنجے میں پھنسی ہوئی چڑیا کی

طرح پھڑ پھڑا کر رہ جاتی لیکن قدرت نے ایک بار پھر اُس کی مدد کی۔ اُس نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے ناجے کے جسم کے ایک نازک حصے پر ضرب لگائی اور جب وہ تکلیف سے دُہرا ہو کر گھٹنوں کے بل گرا تو اُس نے ایک ڈبل اینٹ دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر پوری قوت سے ناجے کے سر پر دے ماری۔ یہ اینٹ ناجے کی عین کنپٹی پر لگی اور وہ تڑپ کر اوندھے منہ گرا۔ شادو نے دیکھا اس کی کنپٹی لہولہان ہے اور وہ جان کنی کی حالت میں نظر آتا ہے۔ اُس نے اپنا ٹفن کیریئر اٹھایا اور بھاگتی ہوئی حویلی میں واپس آ گئی۔ اینٹ کی ضرب سانسی ناجے کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی اور وہ وہیں گندم کے کھیت میں اپنے زہریلے پراٹھوں کی پوٹلی کے نزدیک ہلاک ہو گیا۔ بعد ازاں علی الصبح اسلم کے بڑے بھائی اکبرے نے اُسے گندم کے کھیت میں مرے ہوئے پایا۔ لاش کے پاس ہی اُس کا جوتا پڑا تھا بعد ازاں گریبان سے ٹوٹنے والے دو بٹن بھی ملے۔

اسلم کے بڑے بھائی اکبرے کو دھمکی آمیز خط ارسال کرنے والا ناجے کا چچازاد بھائی راج تھا جب شادو پر پہلی مرتبہ دست درازی ہوئی تو ناجے کا ساتھ راج ہی دے رہا تھا۔ راج ہی کا گھوڑا شکارے کے دانتوں سے ناکارہ ہوا تھا۔ جب بعد میں ناجا خود بھی ہلاک ہو گیا تو راج کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ اور ناجا دونوں ایک ساتھ جیل سے بھاگے ہوئے تھے۔ لڑائی مار کٹائی اُن کا پیشہ اور جرم اوڑھنا بچھونا تھا...... راج نے یہی سمجھا کہ ناجے کو ہلاک کرنے والا اکبرا ہے لہٰذا اُس نے اکبرے اور اہلِ خانہ کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقعے پر اکبرے نے عقلمندی کا ثبوت دیا اور دھمکی آمیز خط ملتے ہی اپنے بال بچوں سمیت خاموشی سے گوجرانوالہ چلا گیا۔ راج نے اکبرے کو موقعے سے غائب دیکھا تو اُس کے انتقام کا دریا شادو کی طرف بہہ نکلا۔ اُس نے سوچا فساد کی اصل جڑ تو یہی لڑکی ہے۔ آخر اُس چاندنی رات میں وہ خنجر سے مسلح ہو کر چوہدری بوٹے کی حویلی میں گھس گیا اور شادو کی زندگی چھیننے کی بھرپور کوشش کی۔ اتفاقاً میں وہاں موجود تھا۔ راج کی کوشش ناکام ہوئی لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہو گیا۔ شادو یہ سمجھی کہ اس کا بھید کھل گیا ہے اور سانسی یہ جان چکے ہیں کہ ناجے کی موت کے گھاٹ اتارنے والی وہی ہے۔ اب وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے یوں شادو نے اپنی چپ کا روزہ توڑ دیا اور وہ سب کچھ ہمیں بتا دیا جو وہ اب تک بڑی ہوشیاری سے چھپاتی رہی تھی۔ (میرے خیال میں یہاں اس وضاحت کی ضرورت تو نہیں کہ غاٹا چنگاڑ اس سارے معاملے میں بے قصور تھا)

مجھے شادو کو گرفتار کرنا پڑا کیونکہ وہ خود اس قتل کا اعتراف کر چکی تھی۔ ویسے یہ کیس بہت کمزور تھا۔ یہ قتل عمد نہیں تھا۔ ایک تو موت اتفاقاً واقعہ ہو گئی تھی۔ دوسرے شادو نے ناجے کو جو ضرب لگائی تھی وہ حفاظت خود اختیاری میں لگائی گئی تھی...... میں نے چالان مکمل کر کے عدالت میں پیش کر

دیا۔ چند پیشیوں میں ہی عدالت نے دلشاد عرف شادو کو اس الزام سے باعزت بری کر دیا۔ کہتے ہیں قدرت جو کچھ کرتی ہے بہتر ہی کرتی ہے۔ شاید شادو قتل کے کیس میں گرفتار نہ ہوئی تو اُسے اپنے پیار کی منزل بھی نہ ملتی۔ وہ ایک چوہدری کی بیٹی تھی۔ اور اونچی ذات سے تعلق رکھتی تھی۔ اسلم اُس کے مقابلے میں ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ پھر وہ جیل بھی بھگت رہا تھا۔ شادو کے والدین کبھی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دیتے۔ مگر شادو کے جیل چلے جانے سے حساب برابر ہو گیا۔ لڑکی چاہے کتنی ہی پاک صاف اور اعلیٰ اخلاق کی مالک ہو۔ کسی بھی وجہ سے ایک بار جیل چلی جائے تو کوئی بھی مناسب رشتہ دروازے پر دستک نہیں دیتا۔ شادو کے ساتھ بھی اب یہی کچھ ہونا تھا۔ لہٰذا شادو کے والدین نے اس موقع پر عقلمندی کا ثبوت دیا۔ اسلم اور شادو کے گھرانے میں اندر ہی اندر بات چیت ہوئی اور اُن دونوں کا رشتہ طے ہو گیا۔ چوہدری نے اپنی طرف سے بدنامی کی گٹھڑی کو اٹھا کر اسلم کے صحن میں پھینک دیا تھا لیکن اسلم کے لیے یہ گٹھڑی دُنیا کا سب سے ''قیمتی بوجھ'' تھی۔ وہ اس بوجھ کو سر پر اُٹھا کر ساری زندگی خوشی سے ناچ سکتا تھا۔

اس کہانی کا آخری کردار نا جے کا چچا زاد راج تھا۔ شادو کی رہائی کے لیے چند ہفتے بعد وہ اپنی موت آپ مر گیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ مفرور تھا اور جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ پوٹھوہار کے علاقے میں گھومتا رہتا تھا۔ اُن دنوں پوٹھوہار کے اندرونی علاقے میں کبھی کبھار بھیڑیے بھی نظر آ جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کہیں جاتے ہوئے منگلا کے قریب گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ رات کے وقت بھیڑیے اور گیدڑ اُسے چیر پھاڑ کر کھا گئے۔ صبح ''لاش'' کے نام پر لوگوں کو اس کا سر اور بچی کھچی ہڈیاں ملی تھیں۔

☆====== ختم شد ======☆